مقالاتِ کاظمی

از

امام اہلسنت غزالی زماں
رازی دوراں حضرت علامہ

سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز

ناشر
کاظمی پبلی کیشنز جامعہ اسلامیہ انوار العلوم ملتان

ص ۱۹۵ حضرت علامہ علی میاں کی بیعت شریعت کے منافی نہیں ہے

ص ۴۴۳ بیعت رضوان والا درخت حضرت عمر نے نہیں کٹوایا تھا

ص ۴۴۴ قبر سیدہ پر گریہ کرنا چومنا و سونگھنا ثابت ہے

ص ۴۴۵ سلطان ابن سعود نے قبروں کو گروا دیا —

ص ۴۴۶ شاہی قبرستان ریاض میں قبروں کی حالت

ص ۱۹۷ سلف میں سے تناسل و توالد کا پایا جانا

ص ۱۹۴ بزرگوں کی قبروں پر قبہ لگانا ناجائز لکھا ص ۴۴۵

ص ۴۴۶ قبر کو چومنا خاک سونگھنا

مقالاتِ کاظمی

(حصہ چہارم)

از قلم امام اہل سنت، محدثِ اعظم، غزالیٔ وقت، رازیٔ دوراں

حضرت علامہ **سید احمد سعید کاظمی** رحمۃ اللہ علیہ

بانی و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، ملتان

(1913ء-1986ء)

☆..................ناشر..................☆

کاظمی پبلی کیشنز، جامعہ انوار العلوم، ملتان

نام کتاب مقالاتِ کاظمی

مصنف غزالیٔ زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب حافظ محمد عبدالرزاق

بار اوّل

تعداد 1000

ہدیہ -/320 روپے

صفحات 476

سنِ اشاعت اگست 2012ء

کمپوزنگ ادیبِ شہیر خلیل احمد رانا، جہانیاں 0333-7656759

بائنڈنگ بھٹی بک بائنڈنگ ہاؤس، پرانی غلہ منڈی ملتان، پروپرائیٹر: شاکر

☆ کتاب ملنے کا پتہ ☆

مکتبہ مہریہ کاظمیہ متصل جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، ملتان

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور

فرید بک سٹال، ۳۸ اردو بازار، لاہور

مکتبۃ المدینہ، اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان

کتب خانہ حاجی مشتاق احمد، اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان

کتاب خانہ حاجی نیاز احمد، بوہڑ گیٹ، ملتان

المدینہ کتب خانہ بالمقابل اے سی آفس علی پور مظفر گڑھ

مکتبہ حسنیہ، نزد سبزی منڈی، بہاولپور

احمد بک کارپوریشن، اِقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی

اِسلامک بک کارپوریشن، فضل داد پلازہ، اِقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

غزالیٔ زماں رازیٔ دوراں کے الفاظ زبان پر آتے ہی عالمِ اسلام کی جس عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت کا تصور فوراً ذہن میں آتا ہے وہ ہیں ضیغم اسلام قطب الارشاد حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی ہمہ جہت باکمال ذات برصغیر کے مشہور خطہ مراد آباد (امروہہ) کے ان نفوسِ قدسیہ میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہے جنہوں نے پورے عالم اسلام پر اپنے ہمہ گیر و گہرے اثرات چھوڑے۔ آپ صرف مدرسہ و مکتب کی فضا میں تحلیل یا کنز و ہدایہ میں گم ہو جانے والے مدرس نہ تھے بلکہ مسند تدریس کی وجاہت میں اضافہ کرنے والے معقول و منقول کے ایک اصولی اور خالص بے مثل مکتبی استاد بھی تھے اور علمی، تدریسی، مذہبی، سیاسی، سماجی، رفاہی خدمات سرانجام دینے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنے والے ایک عظیم المرتبت شیخ اور امامِ ملت اِسلامیہ بھی تھے آپ کی فکر کی ضیاء اور عمل کا فیض اگر سالکانِ طریقت و معرفت کے لئے مینارۂ نور ہے تو ان کی اصابت رائے، فکری جودت اور خداداد علمی قابلیت و صلاحیت متلاشیانِ جادۂ حق کے لیے دلیل راہ تھی۔ صائب رائے اور تعصب سے پاک آفاقی نکتۂ نظر رکھنے کی بناء پر ہر مشکل گتھی سلجھانے کے لیے بلا امتیاز تمام مکاتب کی نظر آپ کی طرف اٹھتی تھی۔

کیونکہ آپ صرف محراب و منبر کی زینت بننے والے واعظ خوش بیان نہ تھے بلکہ ہمیشہ اپنے سحر انگیز حسن گفتار سے دلوں کو موہ لینے والے ایسے مسیحا تھے جن کے پاس ہر درد کی دوا تھی اور بے رُوح ملت کے قالب میں حقیقی حرارتِ حیات منتقل کرنے کا سب سامان بھی تھا۔

رازیٔ دوراں علیہ الرحمۃ نے ویسے تو دینی، قومی، ملی تمام سلگتے اور دہکتے موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنے دور میں ہر شعبہ زندگی سے متعلق ابھرنے والے تمام مسائل کا کافی وشافی جواب دیکر ہر باطل کے بے ربط طوفان کے سامنے بند باندھ دیا کیونکہ آپ احقاقِ حق کے لیے ہر وقت کمر بستہ اور ابطالِ باطل کے لیے ہمہ وقت پابہ رکاب رہتے اور سر پر کفن سجائے ہر طاغوتی فکر کے سامنے مثل جبل شامخ کھڑے نظر آتے۔

بالخصوص آپ کے احوال واقوال اپنے آقا ومولا محبوبِ دوعالم نورِ مجسم ﷺ کی محبت کے سچے ترجمان تھے۔ آپ وہ محب صادق اور عاشق رسول تھے جو زندگی بھر خیمۂ محبوب کی نگہداشت کا فریضہ سرانجام دیتے اور حق دِفاع ادا کرتے رہے۔

آقائے دوعالم ﷺ کے تصرف واختیار، حسن وجمال اور نورانیت وکمال کو ایسے مضبوط اور واضح دلائل وبراہین سے ثابت کیا کہ فرقِ باطلہ کی ظلمت سے متاثر ہونے والوں کو بغیر نغمۂ رسول گنگنائے اور اسیرِ زلف رسول ہوئے چارہ نہ رہا۔

ذِکر روکے فضل کاٹے، نقص کا جویاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی

کے مصداق فریقِ مخالف جو دلیل اپنی ظلمت ایمانی کے ثبوت میں پیش کرتا حضرت غزالیٔ زماں اسی دلیل سے حسن رخسارِ مصطفیٰ ثابت کرتے۔ بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ سنگ وخشت سے تو ہر شخص جہاں تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے خارا شگاف قلم کی نوک سے علم وعرفان کے شہر آباد کرنے کا فن کوئی حضرت غزالیٔ زماں سے سیکھے۔

حضرت غزالیٔ زماں نے اپنی حیاتِ مستعار کو سرکارِ دوعالم ﷺ کی حدیث پڑھاتے، آپ کی گفتار ورفتار اور شمائل وکردار کی تشریح کرتے کرتے گزار دی۔ گویا آپ کی ہر تحریر وتقریر حق وانصاف اور عشق ومحبت سرکارِ ابد قرار ﷺ کا ایک نیا شہر آباد کرتی نظر آتی ہے کہ جب آپ فرمانِ الٰہی بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْ

مَغُہٗ فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ (بلکہ ہم حق کے ساتھ باطل پر کاری ضرب لگاتے ہیں تو وہ اس کا سر کچل دیتا ہے۔تو نا گہاں باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے) کے بمصداق روحانی و علمی ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنی کاری ضرب لگاتے تو اپنے حلقہ میں علم کا کوہِ گراں کہلانے والا مدِ مقابل صرف بونا ہی نہیں بلکہ خمیدہ کمر اور ماؤف ذہن بھی نظر آتا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اصل حقیقت یہ ہے کہ اپنے جوار میں روحانیانِ ملتان نے رسول خدا اولیاء اللہ کے باغیوں کے ڈیرے دیکھ کر اظہارِ نفرت کیا اور ناموسِ رسالت کے تحفظ و دفاعِ پاکانِ اُمت کے لیے اس بطل جلیل کو اپنی ڈیوڑھی پر لا کھڑا کیا۔جس نے ہر قدم پر تُعَزِّرُوْهُ (رسول کی تعظیم و توقیر بجالاؤ) کا علم بلند فرمایا اور عظمت رسول کے خلاف ہر اُٹھنے والی ایمان سوز صدا اور فتنہ کا آخری سرحد تک مقابلہ کیا۔اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

ملک التحریر علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت غزالیٔ زماں کے علمی تبحر و فیضان پر کیا خوبصورت تبصرہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔"مانا کہ ہدایت کسب سے نہیں، فضل الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔لیکن علم تو کسبی شے ہے پھر فن حدیث کی جو کتابیں کاظمی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر روضۂ رسول تک لے گئیں۔آخر تھانوی (و عامر عثمانی) کو وحشتِ نامرادی میں بھٹکنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا۔"

یہ دراصل ظاہری قیل و قال سے حاصل ہونے والا علم نہ تھا بلکہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (اللہ سے ڈرو اللہ تمہیں سکھائے گا) کا مظہر عطیۂ الٰہی علم لدنی اور فیضانِ نبوت تھا۔

حضرت غزالیٔ زماں نے دشمنانِ اسلام کے ایمان سوز اور فتنہ ساز منصوبوں کے جوابات کتنے مضبوط شواہد اور ٹھوس دلائل سے دیئے ہیں اس کا اندازہ تو آپ کے دینی، علمی و آفاقی فکر کے حامل مقالات کے مطالعہ سے حضرات قارئین خود ہی کر سکیں

گے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ

تازہ خواہی داشتن گردان ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

کہ آپ کے علمی جواہر پاروں کو جمع کر کے منظرِ عام پر لایا جائے تا کہ عشق ومحبتِ رسول کا جو چراغ آپ نے جلایا ہے اس کی لو کو مزید تیز کیا جائے اور تحفظِ ناموسِ محبوبِ جاں نواز ﷺ کا جو سبق آپ نے پڑھایا ہے اس کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مقالاتِ کاظمی کا یہ حصہ بھی ہے۔ طویل عرصہ بعد جس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ اس جلد میں جو مضامین شامل کئے گئے ان میں بطورِ خاص، علومِ قرآن پر تحقیقی نظر، تاریخ غلافِ کعبہ، مسئلہ ظل النبی پر عامر عثمانی صاحب کا تعاقب اور رَدّ اور حضور ﷺ کے جسمِ اقدس کے تاریک سایہ کے عدم اور نورِ حسی و حقیقی کے ثبوت میں معرکۃ الآراء ایک تحقیق نذرِ قارئین ہے اور اربابِ فکر و دانش کی سہولت اور عام افادہ و استفادہ کے لئے رِسالہ ظل النبی بھی مقالاتِ دوم سے یہاں نقل کر دِیا گیا ہے۔ برِ صغیر کی مشہور علمی شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ پر ایک اجمالی مضمون اور ان کے نظریۂ تصوف و عقائد کی اصل ترجمان کتاب انفاس العارفین سے کچھ اقتباسات کا حضرت غزالیٔ زماں کے قلم سے ترجمہ شامل ہے (کہ آج کل تحفۃ الموحدین، بلاغ المبین، تفہیمات جیسی فرضی کتابوں کے مصنف و مصلح کی حیثیت سے تو اِنہیں متعارف کرایا جاتا ہے لیکن انفاس العارفین، الدر الثمین، القول الجمیل، اطیب النعم فی مدح سید العرب والعجم کے مؤلف اور ایک عظیم صوفی و شیخِ طریقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تذکرہ نارِوا سمجھا جاتا ہے حالانکہ جماعت اہل حدیث سمیت فکرِ شاہ ولی اللہ کے بڑے بڑے علمبرداروں کو اِس بات سے بھی مجالِ اِنکار نہیں کہ شاہ صاحب کی کتب کا جو حصہ تصوف سے متعلق ہے

اس میں ایسا مواد ملتا ہے جس سے بریلویت کی خاصی تائید ہوتی ہے، اِسی سے مسلک اہلسنت کی عظمت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے) اسلام بالخصوص فقہ حنفی کے نفاذ کے لیے آسان آفاقی حکمتِ عملی پر مشتمل کل پاکستان سنی کانفرنس 1978ء کا خطبہ استقبالیہ، معاشرتی خرابیاں اور علماء کا فرض، الادلۃ الشرعیہ (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) سمیت کئی اہم اور نادر تحریریں شامل ہیں۔ اس میں تمام مضامین کو بغیر کسی ترمیم واضافہ کے اصل حالت میں برقرار رکھا گیا ہے (متعلقہ حوالوں سمیت)۔

فقیر اپنے دیرینہ کرم فرماؤں اور مخلص ترین احباب جناب ادیبِ شہیر محترم خلیل احمد رانا صاحب اور فاضل جلیل حضرت علامہ ابو البیان محمد جمیل الرحمٰن سعیدی صاحب مرتب کتاب "لمعاتِ کاظمی" کا شکر گزار ہے جنہوں نے قلمی مواد کی فراہمی اور ترتیب میں خصوصی تعاون فرمایا۔ اِن شاء اللہ العزیز بہت جلد حضرت غزالیٔ زماں کے اب تک دستیاب ہونے والے فتاویٰ جات کو بھی احسن ترتیب کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

اس کتاب کی کتابت وطباعت میں حتی الوسع احتیاط سے کام لیا گیا ہے پھر بھی اگر کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے آگاہ فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے۔

شکریہ

حافظ نقشبندی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علوم قرآن پر تحقیقی نظر

ہر کلام اپنے متکلم کے علم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ قرآنِ کریم (جو کلامِ الٰہی ہے) اللہ تعالیٰ کے علوم کا مظہر ہو۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ تمام مخلوقات کے علوم اس کے علم کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدائے عالم سے ابد تک جتنے علوم پائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کو اُن سب کا علم ہے اور اُن کے علاوہ علومِ باری تعالیٰ بے شمار اور غیر متناہی بالفعل ہیں۔ قرآن کریم کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے علومِ غیر متناہیہ کا حامل ہے۔

لیکن اِن علوم تک انسان کی رسائی طاقت بشری کی حد تک ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، جن کے قلبِ اطہر پر قرآن نازل ہوا، اور جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن تعلیم فرمایا، جن کی شان یہ ہے کہ اُن کے علوم کی زیادتی[۱] عین مطلوبِ ایزدی ہے اور جن کے علوم بلکہ کمالات ہر آن بڑھ[۲] رہے ہیں، باوجودیکہ علم الاولین والآخرین اور علوم ما کان وما یکون آپ کے علمِ اقدس کا ایک ادنیٰ ترین ذرہ[۳] ہیں۔ لیکن حضور

۱: وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۱۲

۲: وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی ۱۲

۳: فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْیَا وَضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

بے شک آپ کی بخشش کا ادنیٰ کرشمہ دُنیا و آخرت ہے اور آپ کے علوم کا بعض حصہ لوح اور قلم کا علم ہے۔ (قصیدہ بردہ)

ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے علومِ غیر متناہیہ کا احصاء و احاطہ نہیں فرمایا کیونکہ مخلوق کے لئے بالفعل غیر متناہی علوم کا حاصل کر لینا محال ہے، حالانکہ علومِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ہر آن زیادہ ہو رہے ہیں اور ابد تک زیادہ ہوتے رہیں گے۔ کسی حد پر آپ کے علوم کا ٹھہر جانا صحیح نہیں تاہم جب بھی سرکارِ ابد قرار ﷺ کے علوم کو دیکھا جائے محدود اور متناہی بالفعل ہی ہوں گے۔

اِس تفصیل کے بعد ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید میں مخلوقات سے متعلق جس قدر علوم و اصول مذکور ہیں خواہ وہ کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں، مگر چونکہ وہ متناہی ہیں اس لئے اُن کا احصاء و احاطہ حضور سید عالم ﷺ کے لئے ثابت ہے۔ اِس لئے کہ وہ تمام علوم قرآن مجید میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن اپنے حبیب ﷺ کو تعلیم فرمایا اور ان علوم مذکورہ کا حصول حضور ﷺ کے لئے کسی دلیل سے محال ثابت نہیں ہوا۔ بخلاف علوم غیر متناہیہ کے کہ ان کا حصول بالفعل ممکن نہیں۔ بہر حال دائرہ امکان میں قرآن مجید کے علم کا حصول حضور ﷺ کے لئے ضروری ہے اور علومِ قرآن کی وسعت حضور ﷺ کے علومِ مبارکہ کے وسیع ہونے کی روشن دلیل ہے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر اتقان میں قرآن سے علومِ مستنبطہ کے بیان کے لئے ایک مستقل نوع قائم کر کے فرماتے ہیں۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ وَقَالَ تَعَالٰى وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے کتاب میں کچھ کمی نہ فرمائی۔ نیز فرمایا اور نازل کی ہم نے آپ پر کتاب درآنحالیکہ وہ ہر شئے کا بیان واضح ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ عنقریب فتنے ہوں گے۔ عرض کیا گیا، حضور! ان سے بچ کر نکلنے کی کونسی جگہ ہے؟ ارشاد فرمایا۔ کتاب اللہ! کیونکہ اس میں تم سے پہلے اور تمہارے بعد کی تمام خبریں اور تمہارے درمیان کے تمام احکام ہیں۔ اِس حدیث کو ترمذی وغیرہ

نے روایت کیا اور حضرت سعید بن منصور نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ آپ نے فرمایا جس شخص نے علم کا ارادہ کیا اُسے چاہئے کہ قرآن مجید کو اپنے اوپر لازم پکڑے۔ کیونکہ اس میں اولین و آخرین کی خبریں ہیں۔ بیہقی نے کہا کہ اصول علم مراد ہیں۔

امام بیہقی کی روایت

بیہقی حضرت حسن سے روایت کرتے ہیں حضرت حسن (بصری) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ سو کتابوں کے علوم اُن میں سے چار کتابوں (توراۃ، زبور، انجیل، فرقان) میں رکھ دیئے۔ پھر ان میں سے تین کتابوں کے علوم "فرقان مجید" میں جمع فرما دیئے۔

امام شافعی کا ارشاد

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے جمیع اقوال سنتِ مبارکہ کی شرح ہیں اور تمام سنت مطہرہ قرآن کریم کی شرح ہے۔ نیز امام موصوف فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس قدر احکام نافذ فرمائے ان سب کو قرآن مجید ہی سے سمجھا تھا۔ میں (جلال الدین سیوطی) کہتا ہوں کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں صرف اسی چیز کو حلال قرار دیتا ہوں، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور صرف اسی چیز کو حرام کرتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا۔ اس حدیث کو ان لفظوں سے امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اُمّ میں روایت کیا۔

حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ کسی وجہ پر مجھے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہیں پہنچی۔ مگر میں نے اس کا مصداق قرآن مجید میں پالیا۔ ابن مسعود رضی اللہ

عنہ فرماتے ہیں جب میں تم سے کوئی حدیث بیان کروں تو اس کی تصدیق کتاب اللہ سے پیش کرسکتا ہوں۔ ان دونوں حدیثوں کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔

ایک مرتبہ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں فرمایا جس چیز کے متعلق چاہو مجھ سے سوال کرو۔ میں تمہیں قرآن مجید سے اس کی خبر دوں گا۔

ابوسراقہ کتاب الاعجاز میں ابوبکر بن مجاہد سے نقل فرماتے ہیں کہ ابوبکر بن مجاہد نے ایک دِن فرمایا کہ ما من شیء فی العلم الا وھو فی کتاب اللہ۔ عالم میں کوئی شئے نہیں، مگر اس کا ذِکر کتاب اللہ میں موجود ہے۔ ان سے کہا گیا کہ خانات (خیموں) کا ذِکر کتاب میں کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا قرآن مجید کی اِس آیت میں خانات کا ذِکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۔ بیوت غیر مسکونہ (وہ گھر جن میں سکونت یعنی مستقل اور دائمی رہائش نہ ہو) خانات کو شامل ہیں۔

بعض دیگر آئمہ و اکابر ملت نے فرمایا۔ عالم میں کوئی شئے ایسی نہیں جس کا استخراج قرآن مجید سے اہل فہم کے لئے ممکن نہ ہو۔ یہاں تک کہ بعض اہل فہم نے حضور سید عالم ﷺ کی تریسٹھ سال عمر اقدس کا استنباط سورۃ منافقین کی اس آیت سے کیا۔ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا ۔ وجہ استنباط یہ ہے کہ سورۃ منافقین (جس میں آیت اجل وارد ہے) تریسٹھویں سورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد سورۃ تغابن کو رکھا تا کہ رسول اللہ ﷺ کے فقدان میں تغابن ظاہر ہو جائے۔

حضرت مرسی کا قول

حضرت ابن ابی الفضل مرسی رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ قرآن مجید نے (غیر متناہی) علوم اوّلین و علوم آخرین کو جمع کرلیا۔ اِس حیثیت سے کہ ان

علوم کا احاطۂ حقیقی اللہ تعالیٰ (جو متکلم قرآن ہے) کے سوا کسی نے نہیں کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان علوم کا احاطہ کیا۔ بجز ان علوم کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خاص فرمالیا ہے۔ (سابقاً) مذکور ہو چکا ہے کہ غیر متناہی مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ نے احاطۂ علوم نہیں فرمایا البتہ ما کان وما یکون کے علوم جو متناہی ہیں حضور ﷺ کے احاطہ میں شامل ہیں۔ پھر ان علوم کا بہت بڑا حصہ اجلہ صحابہ مثلاً حضرات خلفاء راشدین وعبداللہ بن مسعود وعبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو ملا۔ حتیٰ کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ لَوْضَاعَ لِی عقال بعیرٍ لَوَجَدْتُہٗ فی کتاب اللہ تعالی۔ اگر میرے اونٹ کی رسی ضائع ہو جائے تو میں اُسے بھی کتاب اللہ میں پالوں گا۔ ان کے بعد اس علم کے وارث تابعین کرام ہوئے۔ تابعین کے بعد ایسا دور آیا کہ لوگوں کی ہمتیں علومِ قرآن سے قاصر ہونی شروع ہو گئیں اور وہ ان علوم کے اٹھانے سے عاجز و قاصر ہو گئے، جنہیں صحابہ کرام اور تابعینِ عظام نے اپنے سینوں میں اُٹھایا تھا۔ تابعین کے بعد علماء کرام نے قرآن مجید کے علوم وفنون کی انواع قائم کیں اور ایک ایک گروہ نے ایک ایک نوع کو اپنالیا اور وہ اُسی میں مشغول ہو گئے۔

بعض لوگ لغاتِ قرآن اور اس کے کلمات کی تحریر اور اس کے حروف کے مخارج کی معرفت اور اعداد حروف وکلمات وآیات وسُوَر میں مشغول ہو گئے اور اس کے پاروں اور نصفوں اور ربعوں وغیرہ کا کام شروع کر دیا۔ نیز کلمات متشابہ اور آیات متماثلہ کے حصر میں منہمک ہو گئے۔ انہوں نے معانی قرآن سے کچھ تعرض نہ کیا۔ انہوں نے اس فن کا نام قرأت رکھ دیا۔

نحوی قرآن کے معرب، مبنی، اسماء، افعال، حروف عاملہ وغیر عاملہ میں مستغرق ہو گئے اور انہوں نے اسماء اور ان کے توابع اور ضروب افعال ولازم ومتعدی اور رسوم خط کلمات اور ان کے متعلقات میں نہایت وسیع کلام کیا۔ مفسرین نے اپنا

کام کیا کہ الفاظ کی دلالت پر غور کر کے دیکھا کہ کس لفظ کی دلالت ایک معنی پر ہے اور کس کی دلالت ایک سے زیادہ پر ہے۔ آیات محکمہ کتنی ہیں اور ان سے کیا کیا احکام ثابت ہوتے ہیں۔ اصولیوں نے قرآن مجید کے دلائل عقلیہ کی طرف توجہ کی اور شواہد اصلیہ ونظریہ پر غور کیا اور بکثرت آیاتِ قرآنیہ سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی بقاء اور قدم اور علم وقدرت پر استدلال کیا اور عیوب ونقائص سے اس کی تنزیہ پر دلیلیں قائم کیں اور اس کا نام علمِ اصولِ دین رکھا۔

ایک قوم نے اس کے معانی خطاب میں غور کیا کہ کونسا کلمہ مقتضی عموم ہے اور کونسا مقتضی خصوص۔ اور انہوں نے اس سے احکام نعت، مثلاً حقیقت، مجاز کا استنباط کیا، اور تخصیص واخبار، نص، ظاہر، مجمل، محکم، متشابہ، امر، نہی، فسخ وغیرہ میں کلام کیا اور قیاسوں پر گفتگو کی اور استصحابِ حال واستقراء پر بحث کی۔ اس فن کا نام انہوں نے اصولِ فقہ رکھا۔

ایک جماعت نے نظرِ صحیح اور فکرِ صادق سے کام لیکر حلال وحرام اور باقی احکام قرآن کریم سے حاصل کئے اور اس کا نام علم "فرع" اور علمِ فقہ رکھا۔

الغرض علمِ تاریخ وقصص، وعظ وخطابت، اصول تعبیر، علم حساب، علم نجوم و بروج، علم المواقیت، معانی، بیان، بدیع، تصوف، طب، جدل، ہیئت، ہندسہ، جبر و مقابلہ، علم صنائع اور باقی تمام علوم قرآن مجید سے مستنبط ہوئے۔

قاضی ابوبکر بن عربی قانون التاویل میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ۷۷ ہزار ۴ سو ۵۰ علم ہیں۔ (تفسیر اتقان جلد ثانی مصری ص۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸)

اخرج ابن ابی حاتم من طریق الضحاك وعن ابن عباس قال کل شیء فی القراٰن لو فاتہٗ شیء لا یکون ابداً

''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ ہر چیز قرآن مجید میں ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن مجید سے فوت ہو جائے تو ابد تک نہ ہو۔

(تفسیر اتقان جلد اول مصری ص ۱۷۴، ۱۷۵)

امام جلال الدین سیوطی کا ارشاد

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صرف اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسائل مستنبط ہو سکتے ہیں۔

اب امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان اور ان کی احادیث و آثار و اخبار منقولہ سے علومِ قرآن کی جو وسعت ثابت ہوئی وہ ناظرین کرام کے پیش نظر ہے۔

پھر یہ کہ صحابہ کرام بلکہ تابعین عظام کی قوتِ علمیہ کا یہ حال ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اپنے اونٹ کی گم شدہ رسی کو قرآن کریم میں پا سکتے ہیں اور ابو بکر بن مجاہد ہر چیز کا علم قرآن کریم میں پاتے ہیں۔ علومِ قرآنیہ پر جب حضور سیدِ عالم ﷺ کے غلاموں کی نظر اس قدر حاوی ہے تو سرکارِ دو عالم نورِ مجسم ﷺ کی نظر علمی اور قوتِ علمیہ کا کیا عالم ہوگا اور نگاہِ رسالت کس وسعت کے ساتھ علومِ قرآن کی حامل ہوگی۔

اِس بیان کو ذہن نشین کرتے ہوئے اُن لوگوں کے قول پر ایک نظر ڈالیں جو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تو قرآن کی وسعت کو جانا، نہ حضور ﷺ کی قوتِ علمیہ کو تسلیم کیا۔ قرآن مجید کو عام کتابوں کی طرح جانا اور حبیب اکرم ﷺ کو عام انسانوں پر قیاس کیا۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ ط

(ماہنامہ السعید ملتان ستمبر/اکتوبر، پانچواں سال، شمارہ ۵/۶، ص ۵ تا ۸)

ایک لذت سے جنت بھی محروم ہے

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الشھید لا یجد الم القتل الا کما یجد احد کم الم القراصۃ رواہ الترمذی والنسائی والدارمی (مشکوٰۃ شریف جلد ثانی ۵۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''شہید قتل کی تکلیف محسوس نہیں کرتا، لیکن صرف ایسی کہ جیسے تم میں سے کوئی شخص چٹکی (بھرنے) یا چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف محسوس کرتا ہے، اس حدیث کو ترمذی، دارمی اور نسائی نے روایت کیا۔ الفاظ حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے یعنی اللہ کے نام پر قتل ہونے والا قتل کی شدید تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ جہاں تک ایمان اور عقیدہ کا تعلق ہے۔ مردِ مومن بارگاہِ رسالت میں یہ کہہ کر جھک جاتا ہے کہ

ع عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ

لیکن تاوقتیکہ زبانِ رسالت کے ادا کئے ہوئے الفاظ کو عقل سلیم کے معیار پر دنیا کے روشن خیال اور صالح افراد کے ذہن نشین نہ کرا دیا جائے۔ علم و عقل کی دنیا میں عظمت نبوت کا وزن صحیح قائم نہیں کیا جا سکتا۔

مقتول کا قتل کی تکلیف محسوس کرنا ایک ایسا فطری امر ہے جس کو واقعات کی روشنی میں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مقتولین کا قتل کے وقت کیا حال ہوتا ہے۔ ان کی چیخ و پکار، آہ و فغاں صاف اور واضح طور پر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہی ہے کہ یہ لوگ شدید ترین تکالیف و آلام میں مبتلا ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ

حدیث شریف میں کامل غور وخوض کے بعد اس استبدادِ ظاہری کو دور کریں تا کہ زبانِ رسالت سے نکلے ہوئے الفاظ کے مرادی معنی اچھی طرح واضح ہو جائیں اور علم وعقل کی دنیا میں نبوت ورسالت کے وقار کو نافہموں کی طرف سے کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

حدیث زیرِ بحث کے فہم کو آسان کرنے کے لئے ناظرین کرام کو بخاری شریف کی ایک حدیث کے مضمون کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں سے ارشاد فرمائے گا کہ میں تم کو تمام دنیا کی نعمتیں عطا فرما کر دنیا میں واپس بھیجتا ہوں۔ تم جنت چھوڑ کر دنیا میں واپس جانا چاہتے ہو؟ اس ارشاد کے جواب میں تمام جنتی دنیا میں جانے سے انکار کر دیں گے لیکن شہید عرض کرے گا، مولا تعالیٰ! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ اس لئے نہیں کہ دنیا اور اس کی نعمتیں نعمائے جنت سے بہتر ہیں، بلکہ صرف اس واسطے کہ دنیا میں پھر تیرے نام پر قتل کیا جاؤں، اور زندہ ہو کر پھر دنیا میں جاؤں اور پھر جامِ شہادت نوش کروں۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں سب کچھ ہے مگر ایک لذت ایسی ہے جو جنت میں بھی میسر نہیں۔ اور وہ تیرے نام پر سر کٹانے کی لذت ہے۔ غیر شہید چونکہ لذتِ شہادت سے واقف نہیں، اس لئے وہ سب انکار کر دیں گے اور شہید اس مزہ سے آشنا ہو چکا ہے۔ اس لئے تمنا کرے گا۔

یہاں اس بات کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جنت کی لذتوں کے سامنے سارے جہاں کی لذتیں ہیچ ہیں لیکن شہید پھر بھی یہی چاہے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کر شہادت کا مزہ حاصل کرنے کے لئے دنیا میں چلا جاؤں۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ لذت شہادت کیسی ہوگی؟

یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ جنت کی ہر چیز راحت وآرام پر مشتمل ہے اور قتل ہونا سراسر تکلیف واذیت کا موجب ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ شہید راحت وآرام چھوڑ کر اذیت ومصیبت کی طرف جانا چاہے گا۔ یہ بات تو قانونِ فطرت کے خلاف ہے!

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قانون تو یہی ہے کہ تکلیف و مصیبت سے بچنے اور راحت و آرام حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر محبت کا قانون اس کے برعکس ہے۔ احساس محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر الم میں راحت پاتا ہے اور ہر درد میں لذت محسوس کرتا ہے، محبت کا مزاج اس کا شعور و ادراک سب کچھ جداگانہ ہے۔ اس کے نزدیک موت میں حیات ہے، رنج میں راحت، لوٹنے، تڑپنے میں اسے مزہ آتا ہے، محبت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کانٹے کو پھول سمجھتی ہے اور نار کو گلزار، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محب کی نگاہوں میں اس کے محبوب کا حسن و جمال سمایا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے قلب و روح کی گہرائیوں بلکہ تمام روحانی نظام میں جلوہ ہائے محبوب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا دِماغ شرابِ الفت میں چور اور آنکھیں نشۂ محبت میں مخمور ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کسی مریض کا آپریشن کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے کلوروفام سنگھاتا ہے۔ مریض اس کے نشہ میں ایسا بیہوش ہوتا ہے کہ اسے اپنے جسم کے کٹنے اور پھاڑے جانے کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔

جب کلوروفام کے نشہ کا یہ حال ہے تو نشۂ شرابِ محبت کا کیا حال ہوگا۔ نشہ سونگھنے والے مریض کو جسم کے کاٹے جانے کا پتہ نہیں لگتا تو شرابِ الفت کے نشہ میں مخمور ہونے والوں کو سر کٹنے کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟

یقین نہ ہو تو قرآن کریم میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ پڑھ لیجئے۔ زنانِ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھا اور چھری سے پھل تراشنا چاہا تو پھل کاٹنے کی بجائے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ان عورتوں نے پھلوں کی بجائے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، لیکن انہیں اپنے ہاتھوں کے کٹنے کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ اگر انہیں احساس ہوتا تو فوراً کہتیں کہ ہمارے ہاتھ کٹ گئے۔ مگر اپنے ہاتھوں کے کٹنے کا ذِکر نہیں کرتیں بلکہ کہتی ہیں کہ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا!

بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○ خدا کی قسم یہ بشر نہیں۔ یہ تو بزرگ فرشتہ ہے۔
جن کی نگاہوں میں یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کے جلوے تھے۔ انہیں ہاتھوں کے کٹنے کا پتہ نہ چلا تو جن کی نظروں میں جمال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے سمائے ہوئے ہیں انہیں سر کٹنے کا کیا احساس ہو سکتا ہے؟

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا ؎

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

معلوم ہوا کہ شہداء چونکہ شرابِ محبت محمدی کے نشہ میں مخمور ہوتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں حسنِ مصطفائی کے جلوے سمائے ہوتے ہیں اس لئے انہیں الم قتل کا احساس نہیں ہوتا۔

ماہنامہ السعید ملتان، ماہِ جنوری ۱۹۶۲ء، جلد ۳، شمارہ ۹، ص ۹، ۱۰

الادلۃ الشرعیہ
کتاب، سنت، اجماع، قیاس

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۝(النساء:۵۹)

حکام اور والیانِ امور کو ادائے امانت اور عدل فی الحکومت کا امر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے ضمن میں عامۃ المؤمنین کو حکام اور والیانِ امور کی اطاعت کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی میں اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کرلو، نیز جو رسول احکامِ خداوندی کی تبلیغ کے لئے تمہاری طرف مبعوث ہوا ہے اس کے ہر امر و نہی میں اس کی فرمانبرداری اختیار کرو۔ کلبی فرماتے ہیں کہ فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور سنن میں رسول اللہ ﷺ کی۔ لیکن پہلے معنی اولیٰ ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ کلیۃً مقترن ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت فرما کر فعل ''اَطِیْعُوْا'' کا اعادہ فرمایا، جس کی وجہ اعتنا بشان النبی ﷺ ہے اور اس وہم کو قطع کرنا مقصود ہے کہ جو چیز قرآن میں نہ ہو اس کا امتثال واجب نہیں اور اس بات کو ظاہر کرنا

ہے کہ نبی ﷺ کے لئے وہ استقلال بالطاعت ثابت ہے جو حضور کے غیر کے لئے ثابت نہیں۔ اس لئے وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ میں اس کا اعادہ نہیں فرمایا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ أُولِي الْأَمْرِ کے لئے وہ استقلال بالطاعت قطعاً حاصل نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے لئے حاصل ہے۔

"اولی الامر" سے کیا مراد ہے؟

علماء نے کہا کہ أُولِي الْأَمْرِ سے امراء مسلمین مراد ہیں، جن میں خلفاء، سلاطین اور قضاۃ سب شامل ہیں۔ سیاق آیت اسی قول کا مؤید ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے لشکروں کے امیر مراد ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ اور میمون بن مہران سے مروی ہے اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدّی سے اخراج کیا اور اسی کا اخراج ابن عساکر نے بروایت ابی صالح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لشکر میں بھیجا۔ اس میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ سب لوگ منزلِ مقصود کی طرف چلے۔ مہاجرین کا یہ لشکر کفار کی جس قوم کی طرف جا رہا تھا، اُسے کسی جاسوس نے اس لشکر کی خبر دی۔ وہ سب لوگ راتوں رات بھاگ گئے۔ صرف ایک آدمی ایسا تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں حضرت خالد کے لشکر میں پہنچا اور لوگوں سے پوچھتا ہوا عمار بن یاسر کے پاس گیا اور اُن سے کہا "اے ابو الیقظان! میں مسلمان ہو گیا ہوں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبدِ مقدس اور اس کے رسول برحق ہیں۔" اس نے یہ بھی بتایا کہ میری قوم نے جب آپ لوگوں کے آنے کی خبر سنی تو ساری قوم بھاگ گئی۔ صرف میں باقی رہا تو کیا میرا اسلام کل مجھے کچھ نفع دے گا۔ اگر نہیں تو میں بھی بھاگ جاؤں۔

حضرت عمار نے فرمایا کہ تیرا اِسلام تجھے ضرور نفع دے گا۔ تو جا اور اپنی بستی میں ٹھہرا رہ، وہ چلا گیا اور اپنے گھر ٹھہر گیا۔ جب صبح کے وقت خالد بن ولید نے اُن پر حملہ کیا تو سوائے اُس ایک آدمی کے کسی کو بھی وہاں نہ پایا۔ اُسی کو پکڑ لیا اور اس کا مال بھی لے لیا۔ یہ خبر حضرت عمار کو ہوئی تو وہ خالد بن ولید کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ آپ اس آدمی کو چھوڑ دیں، یہ اسلام لے آیا ہے اور میری امان میں ہے۔ خالد بن ولید کہنے لگے آپ کون ہوتے ہیں امان دینے والے۔ دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہوئی اور ان کا مقدمہ بارگاہِ نبوت میں پیش ہوا۔ حضور ﷺ نے حضرت عمار کی امان کو برقرار رکھا اور اُنہیں اس بات سے منع فرمادیا کہ آئندہ وہ منشاءِ امیر کے خلاف کسی کو امان نہ دیں۔ حضور ﷺ کی موجودگی میں بھی اُن کی آپس میں کچھ سخت کلامی ہوئی۔ خالد بن ولید نے عرض کیا کہ حضور آپ نے اس عبدِ رجدع کو مجھے گالیاں دینے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے خالد! خبردار، عمار کے حق میں سخت کلامی نہ کرو، کیونکہ جس نے عمار کو بُرا کہا (گویا) اس نے اللہ تعالیٰ کے حق میں بُرے کلمے استعمال کئے۔ جو عمار سے بغض رکھتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے۔ جس نے عمار پر لعنت کی، اللہ تعالیٰ اُس پر لعنت فرماتا ہے۔ حضرت عمار خالد بن ولید سے ناراض ہو کر چلے دیئے، خالد بن ولید اُن کے پیچھے دوڑے۔ یہاں تک کہ ان کا دامن پکڑ لیا اور ان کی طرف معذرت کی اور معافی چاہی، جس کے بعد حضرت عمار اُن سے راضی ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ روایت دوسرے قول کی تائید کرتی ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ "اولی الامر" سے اہل علم مراد ہیں، اس قول کو اکثر مفسرین نے عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ مجاہد، حسن بصری اور عطا رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اور ان کے علاوہ ایک جماعت سے روایت کیا۔

حضرت ابو العالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس تیسرے قول کی صحت پر اللہ

تعالیٰ کے قول وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ سے استدلال کیا۔ کیونکہ احکامِ شرعیہ کا استنباط واستخراج کرنے والے صرف علماء ہیں۔

چوتھا قول جو بعید عن الصواب نہیں وہ ہے جسے کثیر علماء نے اختیار کیا کہ اولی الامر حکام اور علماء سب کو شامل ہونے کی وجہ سے سب کے لئے عام ہے۔ امراء کو اس لئے کہ ان کے لئے جیش وقتال کی تدبیر کا امر ثابت ہے اور علماء کو اس لئے کہ ان کے لئے حفظِ شریعت اور تحفظِ حرام وحلال کا امر ثابت ہے، لہٰذا سب اولی الامر ٹھہرے۔

البتہ علماء کو مراد لینے کی تقدیر پر ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ'' سے ضرور اشکال پیدا ہوگا۔ کیونکہ مخاطبین مطلقاً عام مومنین ہیں اور الشیء امر دین کے ساتھ خاص ہے اور معنی یہ ہیں کہ اے ایمان والو! اگر تم ''اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' کے ساتھ امورِ دین میں سے کسی امر میں تنازعہ کرو تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اس بات کو چاہتے ہیں کہ اولی الامر کا حمل علماء کی بجائے امراء پر کیا جائے کیونکہ عامۃ المسلمین کا منازعہ امراء کے ساتھ بعض امور میں سکتا ہے۔ لیکن علماء کے ساتھ عوام کا منازعہ متصور نہیں۔ کیونکہ علماء سے مراد یہاں مجتہد ہیں اور عام لوگ ان کے احکامِ مستنبطہ میں اُن سے منازعہ نہیں کر سکتے۔ ہاں مجتہدین آپس میں دلیل وحجت کے ساتھ باہمی اختلاف کرنے کے مجاز ہیں۔ اسی لئے بعض مفسرین نے تَنَازَعْتُمْ کا مخاطب علی سبیل الالتفات اولی الامر کو قرار دیا ہے تا کہ اشکال لازم نہ آئے۔

بعض علماء نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ ''تَنَازَعْتُمْ'' کے مخاطب عامۃ المؤمنین ہیں اور منازعہ سے مومنین اور امراء کا باہمی منازعہ مراد ہے۔ اس اعتبار سے کہ امراء بھی عام مومنین کے بعض افراد ہیں۔ اس صورت میں اولی الامر کے حکم

سے علماء مجتہدین مراد لئے جائیں تو کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ پھر یہ امر قابل فراموش نہیں کہ امراء کی اطاعت کا وجوب اسی صورت میں ہے جبکہ وہ حق پر ہوں۔

خلاف شرع امور میں ان کی اطاعت واجب نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا لا طاعة لبشر فی معصیة الله تعالی۔ نیز شیخین (بخاری و مسلم) امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ حضرت علی نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور اس پر ایک انصاری[1] کو امیر بنایا اور تمام لشکریوں کو امر فرمایا کہ اس کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اتفاقاً امیر کسی وجہ سے لشکریوں پر غضب ناک ہو گیا۔ غصہ کی حالت میں اس نے حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو اور اُنہیں آگ لگا دو۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ لکڑیاں جمع کیں اور انہیں آگ لگا دی۔ پھر امیر نے لشکریوں سے کہا کہ حضور ﷺ نے تمہیں اس بات کا حکم نہیں فرمایا کہ تم میرا حکم سُن کر میری اطاعت کرو؟ سب نے کہا کیوں نہیں، ضرور فرمایا ہے۔ امیر نے کہا کہ تم سب اس آگ میں داخل ہو جاؤ! لشکری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور سوچ کر اُنہوں نے کہا کہ ہم لوگ تو آگ ہی سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف بھاگ کر آئے تھے۔ اسی غور و فکر اور گفت و شنید میں آگ بجھ گئی اور امیر کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ جب یہ سب لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں واپس آئے اور حضور ﷺ کے سامنے یہ واقعہ پیش ہوا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اگر لشکری اس آگ میں داخل ہو جاتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے۔ طاعت صرف معروف میں ہے۔

---

[1]: علقمه کما فی منهیه روح المعانی و عبدالله بن حذافة السهمی فی ما قاله ابن سعد ۱۲

امر مباح میں وجوب طاعت کا حکم

رہا یہ سوال کہ امر مباح میں اولی الامر کی طاعت واجب ہے یا نہیں، تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال کرنے کا حق حاصل نہیں۔ نہ اللہ کے حرام کو حلال کرنا کسی کے لئے جائز ہے اور بعض علماء کا قول ہے کہ واجب ہے۔ جیسا کہ علامہ حصکفی وغیرہ نے فرمایا ہے اور بعض محققینِ شافعیہ نے کہا کہ امام کی اطاعت اس کی ہر نہی اور اس کے ہر امر میں واجب ہے، جب تک کہ وہ کسی حرام کا امر نہ کرے۔

(روح المعانی پ ۵، ص ۵۹، ۶۰، ملخصاً)

آیت مبارکہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ سے جس طرح کتاب اللہ کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے اُسی طرح سنتِ نبی کریم ﷺ کا حجتِ شرعیہ ہونا بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے کیونکہ اَطِیْعُوا اللّٰہ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ کتاب اللہ کو حجتِ شرعیہ مان کر اس پر عمل کیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا مفہوم بھی بجز اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ سنتِ نبوی کو حجتِ شرعیہ تسلیم کر کے اس کو معمول بہا بنایا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ آیت مقدسہ اجماع اُمت اور قیاس آئمہ مجتہدین کے شرعی حجت ہونے پر بھی روشن دلالت کر رہی ہے۔

روح المعانی میں ہے

الحق ان الاية دليل على اثبات القياس بل هي متضمنة لجميع الادلة الشرعية فان المراد باطاعة الله تعالى العمل بالكتاب وباطاعة الرسول العمل

بالسنة وبا الرد اليهما القياس لان رد المختلف فيه الغير المعلوم من النص الى المنصوص اليه انما يكون بالتمثيل والبناء عليه وليس القياس شيئا وراء ذالك وقد علم من قوله سبحانه ان تنازعتم انه عند عدم النزاع يعمل بما اتفق عليه وهو الاجماع۔ انتہی (ص ۶۰ پ ۵)

منکرینِ قیاس اِس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قیاس کی طرف نہیں، بلکہ کتاب وسنت کی طرف رجوع کو واجب قرار دیا۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ آیت اثباتِ قیاس کی دلیل ہے بلکہ تمام ادلۂ شرعیہ کو متضمن ہے۔ اس لئے کہ ''اطاعت اللہ تعالیٰ'' سے عمل بالکتاب مراد ہے اور ''اطاعت الرسول'' سے عمل بالسنۃ مراد ہے اور بالرد الیہما سے قیاس مراد ہے۔ اِس لئے کہ جو اختلافی مسئلہ نص سے معلوم نہ ہو اس کو منصوص علیہ کی طرف پھیرنا اسی طرح ممکن ہے کہ غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا جائے اور غیر منصوص کی منصوص پر بنا کی جائے۔ ظاہر ہے کہ قیاس اس کے سوا کچھ نہیں۔ معلوم ہوا کہ آیت قیاس کی مثبت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے قول ''فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ'' سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب کسی امر غیر منصوص میں جھگڑا نہ ہوا ہو۔ یعنی تمام اہل حل وعقد اس پر متفق ہوں تو پھر اس مسئلہ کو کتاب وسنت کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا (یعنی قیاس کی ضرورت نہ ہوگی) بلکہ اس وقت متفق علیہ بات پر عمل کیا جائے گا اور یہ اجماع ہے۔ سبحان اللہ، قرآن کریم کی شانِ اعجاز ملاحظہ فرمائیے۔ ایک چھوٹی سی آیت میں شریعت کے چاروں اصول نہایت حسن وخوبی اور کمال جامعیت کے ساتھ بیان کر دیئے اور ساتھ ہی علامہ سید محمود الوسی حنفی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی قابلیت بھی قابلِ داد ہے کہ مختصر کلام

میں ادلۂ اربعہ کا اثبات آیت قرآنیہ سے فرمایا۔ امید ہے کہ اہل علم حضرات علامہ کے اس اندازِ بیان سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ اس کے بعد امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ انہوں نے کس بہترین علمی پیرایہ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں غور و تدبر کے بعد معلوم ہوگا کہ منکرینِ قیاس کا استدلال اس آیت سے درست نہیں بلکہ یہ آیت شریفہ تمام ادلہ شرعیہ کو متضمن ہے۔ اطیعوا اللہ سے کتاب اللہ مراد ہے اور اطیعوا الرسول سے سنت رسول اللہ ﷺ مراد ہے۔ دونوں جملوں کے درمیان واؤ عاطفہ لانے کی حکمت یہی ہے کہ دونوں دلالتوں کا بیان ہو جائے۔ کتاب کی دلالت امر اللہ پر ہے اور سنت کی دلالت امر رسول ﷺ پر۔ کتاب سے امر اللہ کا علم ہونے کے بعد امر رسول معلوم ہوگا۔ اسی طرح ہم سنتِ رسول سے امر رسول کو جان کر امر اللہ کو جانیں گے۔ اِن دونوں دلالتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کتاب و سنت کی متابعت کے وجوب پر دال ہے۔

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کا امر جزم و قطع کے ساتھ فرمایا ہے اور جس کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ جزم و قطع کے طور پر فرمائے اس کا خطاء سے معصوم[1] ہونا

---

[1]: معصوم سے یہاں وہ معنی مراد ہیں، جن کی تشریح حاشیۂ انضری علی التلویح میں ہے (قولہ ان اشترط عصمۃ من صدر) لیس المراد بہ عصمۃ المجتہدین عن المناھی اذلا یلزم ذالک فی الاجماع بل عصمتھم عن الخطاء فی ھذا الصادر وھذا متحقق فی الاجماع لقولہ علیہ الصلوۃ والسلام لا تجتمع اُمتی علی الضلالۃ ویحتمل ان یرید بہ عصمتھم مما یسقط العدالۃ من فسق او بدعۃ (حاشیۂ انضری علی التلویح جلد اول مصری ص ۱۰۸، ۱۰۹)

ضروری ہے۔ کیونکہ جس کام کا امر ہو وہ مامور بہ (واجب) ہوتا ہے اور خطا شرعاً منہی عنہ (وممنوع) ہے۔ تو جس کام میں امر اور خطا دونوں جمع ہو جائیں، وہ کام امر کی وجہ سے مامور بہ (واجب) اور خطا کی وجہ سے منہی عنہ (ناجائز) ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کا امر فرمایا، تو اُن کی اطاعت کا واجب ہونا ثابت ہو گیا۔ اب اگر انہیں معصوم عن الخطاء نہ مانا جائے تو ان کے اقدام علی الخطاء کی صورت میں خطاء کی وجہ سے ان کی اطاعت ناجائز ہوگی اور یہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ ایک کام کا ایک ہی اعتبار سے بیک وقت جائز و ناجائز ہونا محال ہے۔

معلوم ہوا کہ اولی الامر کا معصوم عن الخطا ہونا واجب ہے۔ اس کے بعد ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ معصوم مجموع اُمت ہے یا بعض امت! ''بعض امت کا'' مراد ہونا تو کسی طرح جائز نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کو واجب کیا ہے (کسی گروہ یا بعض کی اطاعت کا حکم نہیں دیا) اور ان کی اطاعت کا واجب ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ہم ان اولی الامر کے عارف ہوں اور ان تک پہنچنے اور استفادہ پر قادر ہوں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ اس زمانہ میں ہم امام معصوم کے پہچاننے اور اس تک پہنچنے اور اس سے علمِ دین کے استفادہ سے بالکل عاجز ہیں۔ ایسی حالت میں ہمیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ جس معصوم کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ ابعاض امت میں سے بعض نہیں اور نہ ان کی جماعتوں میں سے کوئی جماعت ہے۔ بلکہ اولی الامر سے مراد مجموع[1] امت ہے اور وہ امتِ محمدیہ کے اہل حل وعقد

1: اگر کہا جائے کہ اولی الامر سے مراد معصوم عن الخطا ہے اور معصوم عن الخطا سے مراد ہیں اہل حل و عقد اور ظاہر ہے کہ اہل حل وعقد جمیع امت کا بعض ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ یہ معصوم مجموع امت ہے۔ بعض امت یا طائفۃ من طوائفھم نہیں۔ کیونکر صحیح ہوگا تو ہم کہیں گے کہ اس میں شک نہیں کہ ارباب حل وعقد انفرادی طور پر باعتبار اپنے اشخاص وذوات کے بعض (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

حضرات ہیں۔ اِس بیان سے قطعاً ثابت ہو گیا کہ اجماع اُمت حجت شرعیہ ہے۔

قیاس

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ سے قیاس کا دلیل شرعی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ امور متنازعہ فیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ امور جن کا حکم کتاب، سنت یا اجماع امت میں منصوص علیہ ہے۔ دوسرے وہ جن کا حکم منصوص علیہ نہیں۔ اب بتائیں کہ آیت مبارکہ میں کن امور میں تنازعہ مراد ہے۔ قسم اول کا مراد لینا باطل ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں اللہ اور رسول ﷺ

بقیہ صفحہ گزشتہ: اُمت ہیں لیکن اپنے مخصوص کمالات اور درجہ اجتہاد و استنباط پر فائز ہونے کی وجہ سے اُمت کے لئے بمنزلہ روح رواں ہوتے ہیں۔ پھر جب کسی امر پر ان کا اجماع ہو جاتا ہے تو وہ اپنی اس اجماعی حیثیت کی بناء پر مجموع اُمت کے حکم میں ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کا اجماع صرف انہی کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ اجماع اُمت کہلاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ لا تجمتع امتی علی الضلالۃ میری اُمت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہو گی۔ امور منصوصہ میں اجماع کی حاجت نہیں، اور غیر منصوصہ میں جمیع افراد امت کا اجماع متصور نہیں۔ اس لئے کہ افرادِ امت کا امصار و دیار میں انتشار اس اجماع کے منافی ہے۔ لہٰذا حدیث مذکور میں اُمتی سے مراد وہی ارباب حل وعقد ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت سے بعض امت ہونے کے باوجود ارباب حل وعقد ہونے کے باعث اپنی اجماعی حیثیت سے مجموع اُمت ہونے کا حکم رکھتے ہیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ان کو معصوم عن الخطاء کے لفظ سے تعبیر کرنا ان کی مجموعی شان اور اجماعی حیثیت پر مبنی ہے یعنی ان کا کوئی فرد انفرادی حیثیت سے معصوم نہیں، بلکہ وہ اجماع جو اُن کے مجموعہ سے صادر ہے اس میں معصوم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح ان کا مجموع ہونا جہت اجماع سے ہے اسی طرح معصوم ہونا بھی اسی جہت اجماع سے ہے، اگر یہ جہت ملحوظ نہ ہو تو محض انفرادی حیثیت سے نہ وہ مجموع ہیں نہ معصوم۔ ۱۲

اور اولی الامر کی اطاعت واجب ہے اور یہ بیشک اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں داخل ہے۔ اس کو الگ بیان کرنا بے فائدہ اور تکرار عبث ہے۔ (تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا) جب قسم اول کا بطلان واضح ہو گیا تو قسم ثانی متعین ہو گئی۔ اس تقدیر پر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ جس بات میں تم جھگڑے اس کا حکم نصوص کتاب وسنت یا اجماع سے طلب کرو، بلکہ یہ معنی ہوں گے کہ شیَ متنازعہ فیہ کا حکم ان احکام کی طرف لوٹاؤ، جو اس شیَ سے مشابہت رکھنے والے واقعات میں نص کئے ہوئے ہیں اور یہی قیاس ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ آیت امر بالقیاس پر دلالت کرتی ہے۔ تتمہ کلام میں اللہ تعالیٰ نے اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذَالِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○ فرما کر اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ ایمان کا مقتضیٰ یہی ہے اور حسن مآل کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔

(ماہنامہ السعید ملتان، ستمبر ۱۹۶۴ء، چھٹا سال شمارہ ۴، ص ۵ یا ۱۰)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تمہید

اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیاں اور اس کے نام سے نسبت کی بزرگی اور شرف رکھنے والی تمام چیزیں جن کے تصور سے اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو جائے "شعائر اللہ" اور "حرمات اللہ" کے عموم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ" "اور جو تعظیم بجالایا اللہ کی حرمتوں کی تو وہ بہتر ہے اس کے لئے اس کے رب کے نزدیک"...... حرام چیزوں کی اہمیت کا احساس کر کے انہیں چھوڑ دینا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محترم قرار دی ہوئی چیزوں کا ادب و احترام قائم رکھنا اور ان کی تعظیم بجالانا یہ سب کچھ حرمات اللہ کی تعظیم میں شامل ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" اور جو ادب بجالائے اللہ کے دین کی نشانیوں اور اس کے نام کی نسبت سے بزرگی رکھنے والی چیزوں کا تو وہ دل کی پرہیزگاری سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق رکھنے والی کسی چیز کا ادب و احترام بجالانا اور اس کی تعظیم کرنا شرک میں داخل نہیں بلکہ عین توحید کی نشانیوں میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے لوگ ہی ان چیزوں کی قدر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف بالواسطہ یا بلاواسطہ منسوب ہیں۔

غلافِ کعبہ بھی بلا شبہ ان چیزوں میں داخل ہے جن کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا اللہ تعالیٰ کی محبت اور ایمان کی نشانی ہے بلکہ وہ تمام چیزیں جو مقربین بارگاہِ ایزدی کے ساتھ شرف نسبت رکھنے والی ہیں سب اسی حکم میں شامل ہیں کہ ان کا ادب و احترام

ایمان اور تقویٰ کی علامت ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کہ بعض دوستوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ غلاف جب تک کعبہ شریف پہنچ کر بیت اللہ الحرام کو پہنایا نہ جائے اُس وقت تک کیونکر قابل احترام ہو سکتا ہے تو اس کا ازالہ یہ ہے کہ حرمات اللہ اور شعائر اللہ کا جو مفہوم ہم نے مختصراً بیان کیا ہے اس میں اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانی ہو اور اللہ تعالیٰ کے نام سے منسوب ہو کر بالواسطہ یا بلاواسطہ نسبت کی وجہ سے بزرگی اور شرف حاصل کر لے وہ ادب واحترام کے لائق ہے۔ غلافِ کعبہ کعبے کی طرف منسوب ہے اور کعبے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اور یہ نسبت یقیناً شرف اور بزرگی کا موجب ہے جس میں احترام کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے کعبہ مطہرہ کو بیت اللہ الحرام کہا گیا جس کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کی حرمت والا گھر۔ لہٰذا کعبہ کو پہنانے کی نیت سے جب غلاف بنایا گیا تو اسے کعبۃ اللہ کے ساتھ ایک خصوصیت حاصل ہو گئی جو یقیناً عزت و شرف کا موجب ہے۔

مثال کے طور پر ہدی کے جانوروں کو لے لیجیے کہ آپ قربانی کے قابل کسی جانور کو حرم کعبہ میں قربانی کے لیے بھیجتے ہیں اور اس کے گلے میں بطور نشانی قلادہ وغیرہ ڈال کر اسے کعبہ کی طرف روانہ کر دیتے ہیں وہ جانور ابھی تک اپنے محل پر نہیں پہنچا اور حرم کعبہ میں پہنچنے کا ظاہری شرف اسے حاصل نہیں ہوا مگر چونکہ اس کی نسبت حرم کعبہ کی طرف ہو چکی اور وہ اس واسطے سے اللہ کے نام سے منسوب ہو گیا اب وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محترم قرار پا گیا اور اس جانور سے جو ظاہری منافع اس کو ہدی قرار دینے سے پہلے حاصل کرنا جائز تھے ان کا حاصل کرنا (بجز ضرورت شدیدہ کے) محض ادب واحترام کی بنا پر جائز نہ رہا اور اس قسم کے جانوروں پر سوار ہونا، ان کی اون تراشنا، دودھ دوہنا یا

ان کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا ان کے ادب واحترام کے خلاف قرار پایا۔ معلوم ہوا کہ کعبہ کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کا ادب واحترام کعبہ پہنچنے پر موقوف نہیں بلکہ محض نسبت اور ان کی شہرت وعلامت ہی ان چیزوں کے لائق ادب واحترام ہونے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا غلافِ کعبہ اپنی اس نسبت شریفہ کی وجہ سے حرم کعبہ میں پہنچنے سے پہلے بھی لائق احترام ہے۔

پاکستان میں غلافِ کعبہ کی تیاری ہمارے ملک کے لیے آنے والی خوش حالیوں، برکتوں اور رحمتوں کے لیے نیک فال ہے۔ ہم اس سلسلہ میں سب سے پہلے عالی جناب سفیر مملکت سعودیہ عربیہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اجازت مرحمت فرما کر پاکستان کے عامۃ المسلمین کو زیارتِ غلافِ کعبہ سے مشرف ہونے کا موقع مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحامد قادری بدایونی صدر مرکزی جمعیۃ العلماء پاکستان ورکن اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان اور روزنامہ جنگ کے مینیجنگ ایڈیٹر کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی مساعی جمیلہ سے زیارتِ غلافِ کعبہ کے انتظامات مکمل ہوئے اور آخر میں ریلوے حکام کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے دینی ومذہبی جذبات سے کام لے کر کراچی سے پشاور تک کے لیے غلافِ کعبہ کی زیارت کرانے کے لیے ریل کا ایک پورا ڈبہ بلا معاوضہ مرحمت فرمایا۔ ساتھ ہی ہم ان تمام معزز حضرات کے بھی شکر گزار ہیں جو غلافِ کعبہ کی معیت میں یہ دورہ کر رہے ہیں اور ملت پاکستانیہ کو ان کی وجہ سے غلافِ کعبہ کی زیارت کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

غلافِ کعبہ اور اس کی ابتداء

غلافِ کعبہ کی رسم کوئی نئی رسم نہیں بلکہ قبل البعثت تبابعہ یمن سے اس کا آغاز ہوا اور شاہانِ یمن میں سے اسعد نامی ایک بادشاہ نے جو تبع الحمیری کے لقب سے مشہور تھا سب سے پہلے کعبہ مطہرہ کو غلاف پہنایا۔ ہم سب سے پہلے اس بادشاہِ یمن کے متعلق کچھ

تاریخی معلومات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس کے بعد عہد جاہلیت میں غلاف کعبہ کا دوسرا دور تاریخ کی روشنی میں بیان کریں گے۔ پھر عہد رسالت میں عہد خلافت راشدہ میں کعبہ کو لباس پہنانے کا تذکرہ تاریخی اعتبار سے کریں گے۔ خلافت راشدہ کے بعد آنے والے ادوار میں مثلاً خلفاء عباسیہ، ان کے بعد سلاطین مصر اور سلاطین آل عثمان کے عہد میں غلاف کعبہ کی تاریخ اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔

نہایت مختصر وقت بلکہ چند گھنٹوں میں ہم نے یہ مواد شائقین کرام کے لیے زیارت غلاف کعبہ کی تقریب سعید کے موقعہ پر مہیا کیا ہے۔ اگر بالغ نظر حضرات اس میں کوئی کمی محسوس کریں تو ہم اس کے لیے پہلے سے معذرت خواہ ہیں۔

تبع ابو کرب تبان اسعد، مِلكُ اليمن

شاہانِ یمن میں ایک بادشاہ تبع ابو کرم تبان اسعد گزرا ہے۔ یمن کا ہر بادشاہ تبع کہلاتا تھا جیسے زمانہ ماقبل میں فارس کے ہر بادشاہ کو کسریٰ اور مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ فراعنہ مصر کی طرح تبابعۂ یمن تبابان ملک یمن ہوتے تھے۔ اسعد نامی بادشاہ یمن قبیلہ حمیری سے تھا اسی لیے اسے تبع الحمیری سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ قبیلہ بنی عدی بن نجار کے کسی یہوی مذہب رکھنے والے شخص نے جو مدینہ کا باشندہ تھا اصحابِ تبع میں سے کسی آدمی پر زیادتی کی اور اسے معمولی سی بات پر قتل کر دیا۔ اس بنا پر تبع ان یہودیوں سے قتال کرتا رہا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ تبع ابھی یہودیوں کے قتال میں مصروف تھا کہ اس کے پاس بنی قریظہ کے احبار یہود میں سے دو حبر (یعنی عالم) آئے جو اپنے علم میں بڑے راسخ تھے۔ انہوں نے سنا تھا کہ تبع مدینہ اور مدین کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔ ان دونوں نے اس سے کہا کہ اے بادشاہ! تو ایسا نہ کر۔ اگر تو اپنے اس ارادہ سے باز نہ آیا تو ہمیں خوف ہے کہ تیرے اس ارادہ فاسدہ کے بروئے کار آنے سے پہلے کہیں تجھ پر سخت

عذاب نہ آ جائے۔ تبع نے کہا یہ کیوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ شہر مدینہ اس نبی آخر الزمان کا مقام ہجرت ہے جو اس حرم سے قبیلہ قریش سے پیدا ہوگا اور مدینہ اس کا دار اور جائے قرار رہے گا۔ تبع یہ سن کر اپنے ارادہ سے باز آ گیا اور اس نے سوچا کہ یہ دونوں اہل علم ہیں۔ ان دونوں کی باتیں بھی اسے بہت پسند آئیں اور وہ ان دونوں کا دین اختیار کر کے مدینہ سے واپس چلا گیا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ تبع اور اس کی ساری قوم بتوں کے پجاری تھے۔ تبع مدینہ سے یمن کی طرف جاتے ہوئے مکہ کی طرف متوجہ ہوا۔ کیونکہ اس کا راستہ ہی مکہ کی طرف سے تھا جب وہ عسفان اور امج کے درمیان پہنچا تو اس کے پاس ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن سعد بن عدنان کے قبیلے کے چند افراد آئے اور وہ کہنے لگے کہ اے بادشاہ! کیا ہم ایک ایسے گھر کی طرف تیری رہنمائی نہ کریں جو اموال کثیرہ کا مخزن ہے۔ آپ سے پہلے تمام بادشاہ اس کی طرف سے غافل رہے۔ اس میں موتی، زبرجد، یاقوت اور سونا چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ تبع نے کہا کیوں نہیں! آپ ضرور میری راہنمائی کیجیے۔ انہوں نے کہا وہ ایک گھر ہے مکہ میں، مکے والے اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے قریب اپنے مذہب کے مطابق عبادت کے طریقے بجالاتے ہیں۔ قبیلہ بنی ہذیل کے جن لوگوں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا وہ چاہتے یہ تھے کہ تبع کسی طرح ہلاک ہو جائے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ جس بادشاہ نے بھی بیت اللہ شریف پر لشکر کشی کی وہ ضرور ہلاک ہو گیا۔ تبع ان لوگوں کے مشورہ کے مطابق عمل کرنے کے لیے جب تیار ہو گیا تو اس نے ان دونوں یہودی عالموں کے پاس پیغام بھیجا اور اس بارے میں ان سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جن لوگوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا تمام لشکر ہلاک ہو جائے۔ خدا کی قسم! ہم تمام روئے زمین میں اس کے سوا کوئی ایسا گھر نہیں جانتے جسے اللہ عزوجل نے اپنی ذات پاک کی

طرف منسوب ہونے کا شرف بخشا ہو۔ اگر آپ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا تو یقیناً آپ اور آپ کے تمام ساتھی ہلاک ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر تبع نے ان یہودی عالموں سے دوبارہ سوال کیا کہ اگر بالفرض میں بیت اللہ پر حاضر ہوں تو مجھے وہاں کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ وہی کام کریں جو وہاں جا کر بیت اللہ کے آداب بجا لانے والے کرتے ہیں۔ آپ وہاں طوافِ کعبہ کریں۔ اس کی تعظیم و تکریم بجالائیں اور اپنا سر منڈائیں۔ اور وہاں سے واپس آنے تک برابر عاجزی کرتے رہیں۔ اس کے بعد تبع نے ان دونوں یہودی عالموں سے پوچھا کہ آپ خود ایسا کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ بے شک ہمارے جدّ امجد ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا گھر ہے اور وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم نے آپ کو بتایا۔ مگر بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں کا وہاں قبضہ ہے وہ ہمارے اور اس بیت اللہ کے درمیان حائل ہیں۔ انہوں نے کعبہ کے گرد و پیش بت نصب کئے ہوئے ہیں اور وہ خدا کے گھر کے نزدیک ان بتوں کے لیے جانوروں کا خون بہاتے ہیں۔ وہ لوگ اکثر اہل شرک ہیں اور شرک کی نجاست میں مبتلا ہیں۔ تبع ان کی نصیحت کو خوب سمجھا اور اسے ان کی باتوں کا پورا یقین ہو گیا۔ قبیلہ بنی ہزیل کے اس گروہ کو بلا کر اس نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے۔ پھر کعبہ کی حاضری دی۔ طواف کعبہ کیا اور حرم کعبہ کے نزدیک قربانی کی۔ اپنا سر منڈایا اور چھ دن مکہ میں قیام کیا۔ ان ایام میں وہ بہت سے جانور ذبح کر کے مکہ والوں کو کھلاتا رہا اور شہد وغیرہ پلا کر ان کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ انہی دنوں اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ خانہ کعبہ کو غلاف پہنا رہا ہے۔ پہلے اس نے چمڑے کا موٹا غلاف پہنایا۔ پھر اس نے خواب دیکھا کہ وہ اچھا لباس پہنا رہا ہے۔ تو اس نے معافر کے کپڑوں کا بنا ہوا پہلے سے اچھا لباس خانہ کعبہ کو پہنایا۔ پھر تیسری مرتبہ اس نے خواب میں دیکھا کہ میں اس سے بھی اچھا لباس خانہ کعبہ کو پہنا رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے بیدار ہونے کے

بعد ایک خاص قسم کا قیمتی کپڑا جو اس زمانہ میں رانوں پہ پہنا جاتا تھا جس کو ملاء کہتے ہیں اور بہترین یمنی چادروں کا لباس پہنایا۔ اور تبع لوگوں کے گمان کے موافق وہ پہلا شخص ہے جس نے خانہ کعبہ کو غلاف پہنایا اور اپنے حکام کو اس کی وصیت کی جو قبیلہ بنی جرہم سے تھے اور ان سب کو امر کیا کہ وہ خانہ کعبہ کو ہمیشہ پاک صاف رکھیں۔ کسی قسم کا خون اور مردار اور کسی قسم کی آلائش ونجاست اس کے قریب نہ آنے پائے۔ تبع نے خانہ کعبہ کا ایک دروازہ بھی تعمیر کر دیا اور اس کی ایک کنجی بھی بنوادی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ملک تبع یہ سب کام کر کے اپنے ساتھیوں، تمام لشکروں اور دونوں یہودی عالموں کو ساتھ لے کر اپنے ملک یمن کی طرف متوجہ ہوا۔ جب اس میں داخل ہوا تو اس نے اپنی قوم کو بھی اپنے دین میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ سب نے انکار کر دیا اور وہ آگ کی طرف اپنا مقدمہ لے گئے۔ ابراہیم بن محمد بن طلحہ کا بیان ہے کہ تبع جب یمن کے قریب آیا اور اس نے اپنے ملک میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو قبیلہ حمیر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ جب تم نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا تو اب تم ہم پر داخل نہیں ہو سکتے۔ تبع نے ان کو اپنے دین کی طرف بلایا اور کہا کہ یہ تمہارے دین سے بہتر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آگ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ تبع راضی ہو گیا۔ یمن میں ایک آگ تھی جس کے متعلق اہل یمن کا اعتقاد تھا کہ وہ باہمی اختلافات اور مقدمات کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ ظالم کو پکڑ لیتی ہے اور مظلوم کو نقصان نہیں دیتی۔ قوم حمیر کے لوگ اپنے بتوں اور باطل معبودوں کے ساتھ میدان میں آئے اور وہ دونوں یہودی عالم بھی اپنے مصاحف کو اپنی گردنوں میں لٹکائے ہوئے حاضر ہو گئے۔ سب لوگ اس جگہ بیٹھ گئے جہاں سے آگ باہر نکلتی تھی۔ اچانک آگ نکلی جب لوگوں کی طرف بڑھی تو لوگ بھاگنے لگے۔ تبع نے تمام لوگوں کو جھڑکا اور کہا کہ سب ٹھہرے رہیں۔ لوگ ٹھہر گئے۔ یہاں تک کہ آگ نے سب لوگوں کو ڈھانک لیا۔ بتوں کو اور تمام

باطل معبودوں کو ان سب لوگوں کو جو بت لے کر آئے تھے، آگ نے جلا دیا اور وہ دونوں یہودی عالم اپنی گردنوں میں اپنے صحیفے لٹکائے ہوئے اس آگ کی لپیٹ سے باہر نکل آئے۔ ان کی پیشانیاں عرق آلود تھیں مگر آگ نے انہیں کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچایا تھا۔ یہ واقعہ دیکھ کر قبیلہ حمیر کے تمام لوگوں نے ان یہودی عالموں کا مذہب اختیار کرلیا۔ اسی وجہ سے یمن میں یہودیت نے جڑ پکڑی۔ ہم نے اس حدیث کی تفسیر میں جو نبی ﷺ سے وارد ہوئی "لا تسبوا تبعا فانه قد کان اسلم" ہم نے ذکر کیا کہ سُہیلی فرماتے ہیں کہ معمر نے ہمام بن منبہ سے روایت کی۔ وہ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "لا تسبوا اسعد الحمیری فانهٗ اول من کسا الکعبة" "تم اسعد حمیری کو برا نہ کہو کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے کعبہ کو غلاف پہنایا۔"

سُہیلی فرماتے ہیں کہ جب ان دونوں یہودی عالموں نے ملک تبع کو رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے کی خوشخبری سنائی تو ملک تبع نے یہ شعر کہے

۱۔ شهدت علی احمد انهٗ رسول من الله باری النسم

۱۔ "میں اس بات پر شاہد ہوں کہ احمد مجتبیٰ ﷺ اس اللہ کے رسول ہیں جو تمام جانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔"

۲۔ فلو مد عمری الی عمره لکنت وزیر اله وابن عم

۲۔ "اگر میری عمر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک دراز ہوئی تو میں ان کا بوجھ اٹھاؤں گا اور چچازادوں کی طرف ان کی مدد کروں گا۔"

۳۔ وجاهدت بالسیف اعدائه وخرجت عن صدره کل هم

۳۔ "اور تلوار لے کر میں ان کے دشمنوں سے لڑوں گا اور ان کے سینے سے ہر قسم کے رنج والم کو دور کردوں گا۔"

سہیلی کہتے ہیں کہ انصار توارث کے ساتھ ان اشعار کو محفوظ کرتے چلے آئے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس یہ شعر تھے۔ سُہیلی نے کہا کہ ابن ابی الدنیا محدث کتاب القبور میں لکھتے ہیں کہ صنعاء میں ایک قبر کھودی گئی۔ اس میں دو عورتیں پائی گئیں۔ ان کے ساتھ چاندی کی ایک تختی تھی جس پر سونے کے پانی سے لکھا ہوا تھا یہ قبر لمیس اور حُبی کی ہے جو دونوں ملک تبع کی بیٹیاں ہیں۔ وہ دونوں اس حال میں مری ہیں کہ وہ شہادت دیتی تھیں اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اسی شہادت پر ان سے پہلے نیک لوگوں کی موت واقع ہوئی ہے۔ (البدایہ والنہایہ مصری)

غلافِ کعبہ کا ایک دُوسرا دَور

علامہ ارزقی فرماتے ہیں کہ سعید ابن ابی سالب ابن مُلکیہ سے روایت کرتے ہوئے مجھ سے بیان کیا کہ کعبہ کے لیے مختلف لباس بطور ہدایا بھیجے جاتے تھے۔ جب لباس بوسیدہ ہو جاتا تھا تو اسے اتارنے کے بجائے اس پر دوسرا غلاف چڑھا دیا جاتا تھا اور زمانہ جاہلیت میں (عہد رسالت سے قبل تمام قریش قصی ابن کلاب کے وقت سے لے کر ابو ربیعہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن مخزومہ کے زمانہ تک) خانہ کعبہ کی غلاف پوشی کے سلسلہ میں باہمی تعاون کرتے تھے۔ اور ہر قبیلہ پر اس کی حسب استطاعت ایک رقم مقرر کر دیتے تھے۔ جب ابو ربیعہ کا دور آیا تو چونکہ وہ ایک متمول اور بہت بڑا تاجر تھا۔ اس نے قریش سے کہا کہ ایک سال صرف تنہا میں غلافِ کعبہ بناؤں گا اور ایک سال تمام قریش مشترکہ طور پر یہ خدمت انجام دیتے رہیں۔ ابو ربیعہ کی حیات تک یہی دستور جاری رہا۔ چنانچہ قریش نے اس کا نام العدل رکھ دیا۔ عدل کے معنی برابری کے ہیں یعنی لباس پوشانی کعبہ کے بارہ میں اس نے اپنی ایک ذات کو تمام قریش کے برابر قرار دیا۔ اس لیے اس کی اولاد کو بنو العدل کہا جاتا تھا۔

عہدِ رسالت میں غلافِ کعبہ

علامہ ارزقی کا دوسرا بیان ہے کہ مجھے محمد بن یحییٰ نے بروایت مؤرخ واقدی خبر دی وہ اسمٰعیل بن ابراہیم بن ابی حبشہ سے روایت کرتے ہیں اور اسمٰعیل بن ابراہیم اپنے والد سے راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خانہ کعبہ کو یمانی چادروں کا غلاف پہنایا۔

خلافتِ راشدہ یعنی
عہدِ فاروقی وعثمانی میں غلافِ کعبہ

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے خانہ کعبہ کو کتان سے بنے ہوئے مصری ساخت کے قباطی کپڑے کا غلاف پہنایا اور دورِ عثمانی میں ہر سال دو غلاف پہنائے جاتے تھے۔ پہلے لباس کا بالائی حصہ بغیر سیا ہوا یوم ترویہ یعنی آٹھویں ذی الحجہ کو لٹکا دیا جاتا تھا اور حصہ زیریں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ ہجومِ حجاج کے چھونے اور چومنے سے پھٹ نہ جائے۔ پھر یوم عاشورا کو حصہ زیریں کا لباس بالائی حصہ کے ریشمی لباس کے ساتھ ملا کر آویزاں کر دیا جاتا تھا اور یہ مکمل لباسِ کعبہ ۲۷ رمضان المبارک تک آویزاں رہتا اور ۲۷ رمضان کو یہ لباس بدل کر مذکورہ بالا قباطی کپڑے کا لباس پہنا دیا جاتا تھا۔

عہد مامون الرشید میں
ملبوسِ کعبہ کی نوعیت

مامون الرشید عباسی نے اپنے دورِ حکومت میں کعبہ شریف کو سال میں تین مرتبہ لباس پہنانے کا حکم جاری کیا جس کی ترتیب یہ تھی کہ یوم ترویہ ۸ ذی الحجہ کو سرخ ریشمی لباس پہنایا جاتا اور یکم رجب کو قباطی، پھر عید الفطر کو سفید ریشمی۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ پھر مامون الرشید کو معلوم ہوا کہ یوم عاشورہ میں جو چادر یوم ترویہ والی اوپر کی سرخ

ریشمی چادر کے ساتھ ملا کر پہنائی جاتی ہے وہ پورے سال تک نہیں ٹھہرتی اور عید الفطر کے موقع پر عید والی سفید ریشمی چادر بالائی کے ساتھ نیچے کی نئی چادر پہنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اس نے حکم دیا کہ عید رمضان میں بالائی حصہ کی نئی چادر پہنائی جاتی رہے۔

خلیفہ متوکل کے عہد میں اس ترتیب کی تبدیلی

خلیفہ متوکل کو اپنے عہد حکومت میں اس بات کا علم ہوا کہ کعبہ مطہرہ کے حصہ زیریں کی چادر ہجوم حجاج کے چھونے اور چومنے کی وجہ سے ماہ رجب سے پہلے ہی بوسیدہ ہو جاتی ہے تو اس نے حصہ زیریں کے لیے ایک اور چادر کا اضافہ کر دیا اور حکم دیا کہ اوپر کی سرخ ریشمی چادر زمین تک لٹکا دی جائے اور پھر ہر دو مہینے کے بعد اس کے اوپر ایک اور چادر پہنا دی جائے۔ یہ واقعہ ۲۴۰ھ کا ہے۔

شاہانِ مصر و یمن کے دَور میں غلافِ کعبہ کا اہتمام

جب خلفائے عباسیہ کی شوکت و قوت کا دور ختم ہوا تو کعبہ شریفہ کا غلاف کبھی شاہانِ مصر کی طرف سے اور کبھی ملوکِ یمن کی طرف سے آتا رہا۔ آخر میں یہ سعادت مستقل طور پر سلاطین مصر کے حصہ میں آ گئی اور سلطان مصر ملک صالح ابن سلطان ملک ناصر قلاودن نے مصر میں دو مواضع بیسوس اور سندنیس خرید کر سال بسال غلاف کعبہ کی تیاری اور مصارفِ روانگی کے لیے وقف کر دیئے اور یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رہا۔ سلاطین مصر کا ایک طریقہ یہ بھی رہا کہ ہر نئے بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے موقع پر اس سیاہ غلافِ کعبہ کے ساتھ جو خانہ کعبہ کے ظاہری حصہ کو پہنایا جاتا تھا بیت اللہ شریف کے اندرونی حصہ کے لیے سرخ رنگ کا غلاف اور اس کے علاوہ مدینہ منورہ میں حجرہ شریفہ نبویہ کے لیے سبز رنگ کا غلاف بھیجتے رہے۔ ان تینوں سیاہ، سرخ، سبز غلافوں پر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه" لکھا ہوتا تھا۔ اور ان کے حاشیوں پر مناسب آیاتِ قرآنیہ یا اسماء اصحابِ رسول اللہ ﷺ تحریر ہوتے تھے۔ کبھی یہ حاشیے سادہ بھی چھوڑ دیئے جاتے تھے۔

سلاطینِ آلِ عثمان کا دَور اور اس دستور کا استمرار

گزشتہ ادوار کے بعد جب ممالک عربیہ سلاطین آلِ عثمان کے قبضہ میں آ گئے تو سلطان سلیم خاں ابن سلطان بایزید خاں مرحوم نے سیاہ غلاف ہائے کعبہ اور سبز غلاف مدینہ منورہ حسب دستور مستقل طور پر جاری رکھے۔ اس کے بعد سلطان سلیمان خاں کے عہد حکومت میں یہ سلسلہ حسب سابق جاری رہا۔ ایک زمانہ کے بعد موضع بیسوس اور موضع سندنیس جو غلافِ کعبہ کی تیاری و روانگی کے اہتمام کے لیے وقف تھے، ویران ہو گئے اور ان کی آمدنی اس مصرف مبارک کے لیے کافی نہ ہو سکتی تو سلطان سلیمان خاں نے حکم دیا کہ مصر کے شاہی خزانے سے یہ مصارف پورے کیے جائیں اور اس کے بعد ان دونوں دیہات کے علاوہ چند مزید دیہات بھی غلافِ کعبہ کے مصارف کے لیے وقف کر دیئے اور یہ وقف دوامی قرار پایا۔ (تاریخ قطبی طبع مصر)

پاکستان میں غلافِ کعبہ کی تیاری

غلافِ کعبہ اب تک مصر سے آتا رہا۔ حتیٰ کہ امسال یعنی ۱۳۸۲ھ میں یہ سعادت ہمیں نصیب ہوئی کہ خدائے قدوس کے پاک گھر کا مقدس غلاف سرزمین پاکستان میں کمال اعزاز و اکرام کے ساتھ تیار کیا گیا اور اب لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں پاکستانی مسلمان انتہائی عقیدت و محبت اور کمال عزت و عظمت کے جذبات اپنے دلوں میں لئے ہوئے اس کی زیارت سے مشرف ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنے رب کعبہ کے لطف و کرم سے امید ہے کہ ہمارے دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دُعائیں غلافِ کعبہ کے

دامن سے لپٹی ہوئی عنقریب حرم کعبہ میں پہنچ کر بارگاہِ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل کریں گی۔

سید احمد سعید کاظمی امروہی
ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ العلماء پاکستان
مہتمم مدرسہ عربیہ انوار العلوم، ملتان

مقامِ شکر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ امسال غلافِ کعبہ تیار کرنے کی سعادت پاکستان کو نصیب ہوئی۔ اور آج کروڑوں فرزندانِ توحید محبت وعقیدت کے موتی نچھاور کرتے ہوئے پروانہ وار غلافِ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو رہے ہیں۔

حضرت غزالیٔ وقت علامہ سید احمد سعید صاحب کاظمی شیخ الحدیث انوار العلوم ملتان نے تاریخ غلافِ کعبہ لکھ کر واقعی مسلمانانِ پاکستان پر احسان فرمایا ہے۔ الحاج شیخ ریحان الدین صدیقی سابق ایم پی اے مینجنگ ڈائریکٹر ہریانا یونائیٹڈ ٹرانسپورٹ کمپنی لمیٹڈ ملتان بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہیں یہ علمی تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس مقدس غلافِ کعبہ کی برکت سے پاکستان کی مزید ترقیاں فرمائے۔ آمین!

غلام مصطفیٰ رضوی سعیدی
مدرس انوار العلوم، ملتان

مسئلہ ظل النبی (سایہ رسول) ﷺ پر

تحقیقی نظر اور دلائل نفی و اثبات کا جائزہ

تقریباً ایک مہینہ ہو گیا (حضرت غزالیٔ زماں علیہ الرحمہ نے یہ بات ماہنامہ "السعید" ملتان، (ظل نمبر) شمارہ، شوال ۱۳۷۹ھ/اپریل ۱۹۶۰ء کے ص ۹ پر لکھی) کہ مختلف اور متعدد مقامات سے احباب کے پیغامات آرہے ہیں کہ ماہنامہ تجلی دیوبند اور ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور وغیرہ رسائل میں حضور نبی کریم ﷺ کے جسم اقدس کا تاریک سایہ ثابت کرنے کے لئے زوردار مضامین شائع کئے گئے ہیں اور اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ایک رسالہ "نفی الفیء عمن انار بنورہ کل شیء" حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے پر تحریر فرمایا ہے، اس پر اچھی طرح پھبتیاں کسی گئی ہیں اور اس کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے، نہ صرف یہ بلکہ صحیح حدیثوں سے حضور ﷺ کا سایہ ثابت کیا گیا ہے جنہیں پڑھ کر عامۃ المسلمین نہایت مضطرب اور متعجب ہیں، اس لئے ان حدیثوں کے جوابات اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ مبارکہ کی تائید و توضیح نہایت ضروری ہے تاکہ مسلک اہل سنت بے غبار ہو جائے اور کسی قسم کا خلجان (شک و شبہ) باقی نہ رہے، اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے موصول شدہ خطوط (موصول شدہ خطوط میں ایک خط مولانا ابوداؤد محمد صادق صاحب نگران اخبار "رضائے مصطفیٰ" گوجرانوالہ کا ہے اور ایک خط مرزا ریاض احمد صاحب حافظ آبادی کا ہے جو امام اہل سنت حضرت قبلہ علامہ ابوالبرکات صاحب شیخ التفسیر والحدیث دارالعلوم حزب الاحناف کے نام آیا تھا اور دفتر ماہنامہ رضوان لاہور سے فقیر کو موصول

ہوا۔ احمد سعید کاظمی) سے منکرین نور مصطفیٰ ﷺ کے مضامین کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

(ا)۔ ماہنامہ تجلی دیوبند نے لکھا ہے!

"بہت سی غلط باتوں کی طرح ایک یہ بات بھی شہرہ پا گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہیں تھا، بعض سادہ فطرت اور جذباتی اسلاف نے تو اس بے اصل خیال کا چرچا کیا ہی تھا لیکن ہندوستان میں اسے پھیلانے کی ذمہ داری قبر پرستوں پر عموماً اور مولانا احمد رضا خان صاحب پر خصوصاً ہے، انہوں نے "اناہ الفی"[1] نام سے ایک کتابچہ لکھا تھا جس میں اپنے معروف علم کلام کے ذریعہ سے اس بے اساس عقیدے کو حقیقت ثابتہ منوانے کی کوشش کی تھی، نتیجہ ظاہر ہے ان کے معتقدین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بات پھیل گئی"۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند، ص ١١، بابت فروری ١٩٥٩ء)

اس کے بعد ماہنامہ تجلی میں لکھتے ہیں!

"دیوبندی مکتبہ فکر کو اگر ایک عمارت سمجھ لیا جائے تو کون نہیں جانتا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اس کے ایک ستون رہے ہیں ان کا فتویٰ ملاحظہ ہو۔ فتاویٰ رشیدیہ جلد اول (مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دہلی) میں عنوان ہے۔ "حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہ پڑنے کی حدیث کا موضوع ہونا"، اس کے تحت ایک سائل کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں "سائل نے اسی روایت کا ذکر کیا تھا جو الخصائص الکبریٰ کے واسطہ سے مفتی کا مستدل ہے، یہ روایت کتب صحاح میں

[1] تجلی کی اصل تحریر میں اسی طرح ہے۔

نہیں اور نوادر کی روایت کا بندہ کو حال معلوم نہیں کہ کیسی ہے،
نوادرالاصول حکیم ترمذی کی ہے نہ کہ ابوعیسیٰ ترمذی کی"۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند، شمارہ، فروری، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۲، کالم ۲)

نیز صفحہ نمبر ۱۳ پر ماہنامہ تجلی میں مرقوم ہے!

"الحاصل اوّل تو ایک ایسے عامۃ الورود واقعہ میں تمام صحابہ کا سکوت اور صرف ایک حدیث مرسل کا اس میں مذکور ہونا ہی علامت قویہ، روایت کے غیر ثابت وغیر معتبر ہونے کی ہے۔ ثانیاً روایت مرسل ہے۔ ثالثاً اس کا راوی بالکل کاذب واضع حدیث ہے، جس سے اگر حدیث کو موضوع کہہ دیا جائے تو بعید نہیں"۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند، بابت ماہ فروری، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۳)

منکرین کے مضامین کا یہ خلاصہ مرزا ریاض احمد صاحب حافظ آبادی کے مکتوب سے لیا گیا ہے۔

(۲)۔ اب مولانا ابوداؤد محمد صادق صاحب نگران "رضائے مصطفیٰ" گوجرانوالہ کے مکتوب گرامی سے ہم ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو مولانا ممدوح نے منکرین کے رسائل وجرائد سے نقل فرمائی ہیں اور منکرین نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

حدیث نمبر ۱۔ مسند امام احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے، اس میں ایک گھریلو شکر رنجی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اُم المومنین فرماتی ہیں فبینما انا یوماً بنصف النہار اذا انا بظل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقبل۔ پس ایک دن دوپہر کے وقت دفعۃً رسول اللہ تشریف لائے اور میں نے پہلے ان کا سایہ ہی دیکھا۔

حدیث نمبر ۲۔ ایک حدیث حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب "حادی الارواح الی بلاد الافراح" میں بیان کی ہے، اس میں حضور ہی کی زبان مبارک سے "ظلی وظلکم" (میرا اور تمہارا سایہ) کے الفاظ صادر ہوئے ہیں، یہ روایات نہ مرسل ہیں نہ ان کا کوئی راوی ساقط الاعتبار ہے۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، شمارہ فروری، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۸۔ رسالہ "ظل نبی" ص ۶، ۷)

حدیث نمبر ۳۔ آٹھویں صدی کے مشہور محدث حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الھیثمی نے اپنی کتاب مجمع الزوائد، جلد چہارم، طبع قاہرہ کے صفحہ ۳۲۳ پر نقل کی ہے اور اس کے تمام راویوں کی توثیق فرمائی ہے، امید ہے آپ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم فی سفر ونحن معہ فاعتل بعیر لصفیة وكان مع زینب فضل فقال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بعير صفية قد اعتل فلو اعطيتها بعيرا لك قالت انما اعطى هذه اليهودية فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهجرها بقية ذى الحجة ومحرم وصفر واياماً من شهر ربيع الاول حتى رفعت متاعها وسريرها وظنت انه لا حاجة له فيها فبينما هى ذات يوم قاعدة بنصف النهار اذ رأت ظله قد اقبل فاعادت سريرها ومتاعها۔

(ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" لاہور، شمارہ ۸ رجنوری ۱۹۶۰ء، ص ۴)

احباب کے خطوط سے منکرین کے دلائل کا جو مواد ہمارے سامنے آیا وہ من وعن ناظرین کرام کی خدمت میں ہم نے پیش کر دیا، منکرین کی تحریروں میں سے

صرف ایک رسالہ "ظل نبی" منظوم بزبان پنجابی ہماری نظر سے گذرا ہے، ماہنامہ تجلی دیوبند ہمیں نہیں ملا، نہ مجمع الزوائد دستیاب ہو سکی، البتہ مسند امام احمد میں منکرین کی پیش کردہ روایت ہم نے تلاش کر لی، جس کے دیکھنے سے ہمیں پتہ چل گیا کہ مجمع الزوائد، جلد چہارم، ص ۳۲۳ اور مسند امام احمد، جلد ۶، ص ۱۳۲ سے منقولہ دونوں روایتوں کا مضمون واحد ہے اور ان دونوں پیش کردہ روایتوں میں حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہی ایک واقعہ مذکور ہے جس کا خلاصہ ترجمہ درج ذیل ہے۔

"حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں حضور ﷺ ایک سفر میں تھے اور ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ تھے، راستہ میں (اُم المومنین حضرت) صفیہ کا اونٹ بیمار ہو گیا، (اُم المومنین حضرت) زینب کے پاس فالتو اونٹ تھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے فرمایا کہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہو گیا ہے اور تمہارے پاس زیادہ اونٹ موجود ہے، اگر تم اپنا ایک اونٹ صفیہ کو دے دو تو بہتر ہے، حضرت زینب نے کہا حضور! اس یہودیہ کو میں اپنا اونٹ دے دوں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ناراض ہو گئے اور ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دیا (حجۃ الوداع کے سفر میں بماہ ذی الحجہ یہ واقعہ پیش آیا تھا) حضرت زینب کو چھوڑے رکھنے کا زمانہ اتنا طویل ہوا کہ ذی الحجہ کا بقیہ مہینہ گزر گیا، محرم اور صفر کے دونوں مہینے گزر گئے اور ماہ ربیع الاول کے چند دن بھی اسی حال میں گزرے، حتیٰ کہ حضرت زینب نے اپنا بستر اور چارپائی وغیرہ سامان بھی اٹھا دیا اور یہ سمجھا کہ حضور ﷺ کو اب ان کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے، وہ اسی حال میں ایک

دن بیٹھی ہوئی تھیں، دوپہر کا وقت تھا، ناگہاں انہوں نے حضور ﷺ کے ظل کریم کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا تو اسی وقت اپنے بستر وغیرہ کو واپس لوٹا دیا"۔

تنظیم اہل حدیث کا پرچہ بھی ہمیں نہ مل سکا، اور "حادی الارواح الیٰ بلاد الافراح" مصنفہ علامہ ابن قیم بھی دستیاب نہ ہوسکی، لیکن رسالہ "ظل نبی" سے اس کا مضمون سامنے آگیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ!

"حضور نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے دوزخ و جنت کو حضور کے سامنے کر دیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ سے ارشاد فرمایا! پھر میں نے اپنے اور تمہارے درمیان نار کو دیکھا، اور ساتھ فرمایا "حتیٰ لقد رأیت ظلی وظلکم" (یہاں تک کہ میں نے اپنا اور تمہارا ظل دیکھا)۔

(رسالہ ظل نبی، ص ۶)[1]

---

[1] (مضمون زیر نظر کی ترتیب کے دوران عزیز محترم حضرت مولانا العلام میاں فتح محمد صاحب الحنفی القادری جلالپوری سلمهم اللہ تعالیٰ نے حادی الارواح مصنفہ علامہ ابن قیم کی حدیث نقل کر کے بذریعہ ڈاک بھیج دی، جس پر میں اپنے فاضل ممدوح کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے حق میں علم و عمل کی ترقی کے لئے دعا کرتا ہوں، وہ پوری حدیث بمعہ ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے)۔

عن انس بن مالك رضی الله تعالیٰ عنه قال صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ذات یوم صلوٰة الصبح ثم مد یدہٗ ثم اخرها فلما سلم قیل له یا رسول الله لقد صنعت فی صلوٰتك شیئا لم تصنعه فی غیرها قال انی رأیت الجنة فرأیت فیها دانیة قطوفها دانیة حبها كالدباغ فاردت (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

علاوہ ازیں رسالہ "ظل نبی" میں قرآن مجید کی تین آیتوں سے بھی حضور

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) ان اتناول منها فاوحى الى ان استا خر فاستاخرت ثم رایت العار فیما بینی وبینکم حتی لقد رایت ظلی وظلکم فاومأت الیکم ان استاخروا فاوحى الى اقرهم فانك اسلمت واسلموا وهاجرت وهاجروا وجاهدت وجاهدوا فلم ارلى علیکم فضلاً الا بالنبوة انتهى۔

(حادی الارواح، مطبوعہ مصر، ص ۴۲)

ترجمہ۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک دن صبح کی نماز پڑھائی، پھر حضور نے اپنا مبارک ہاتھ بڑھایا پھر اسے پیچھے ہٹالیا، سلام پھیرنے کے بعد حضور سے عرض کیا گیا، یارسول اللہ ﷺ اپنی اس نماز میں آپ نے وہ کام کیا جو اس کے علاوہ کسی دوسری نماز میں آپ نے کبھی نہیں کیا تھا (یعنی ہاتھ بڑھا کر پیچھے ہٹانا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس میں انگور کی بیل کے خوشے دیکھے جو بہت قریب تھے، ان کے دانے کدو کی طرح (بڑے) تھے، میں نے ان سے لینا چاہا تو میری طرف وحی کی گئی کہ محبوب آپ آگے نہ بڑھیں، چنانچہ میں فوراً پیچھے ہٹ گیا، پھر میں نے اپنے اور تمہارے درمیان نار کو دیکھا یہاں تک کہ میں نے اپنے ظل اور تمہارے ظل کو ملاحظہ کیا، (آگ اس قدر قریب تھی کہ) پس میں نے تمہیں پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا، پھر میری طرف وحی کی گئی کہ (اے محمد ﷺ) آپ انہیں ان کی جگہ برقرار رہنے دیں، (آپ کی طرح ان کو بھی اس نار جہنم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی) کیونکہ آپ بھی اسلام (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ﷺ کا سایہ ثابت کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں!

ا۔ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ (الرعد:١٥)

"اور واسطے اللہ تعالیٰ کے سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں کے اور زمین کے بیچ ہے، خوشی اور ناخوشی سے اور سائے ان کے صبح کو اور شام کو"۔

(رسالہ ظل نبی، ص ٣)

٢۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ۔ (النحل:٤٨)

"کیا نہیں دیکھا انہوں نے مخلوق خدا میں سے کسی کو بھی کہ اس سائے دائیں بائیں جھک کر خدا کے سامنے سربسجود ہیں"۔

(رسالہ ظل نبی، ص ٤)

٣۔ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) لائے اور یہ بھی اسلام لائے، آپ نے بھی ہجرت کی اور انہوں نے بھی ہجرت کی، آپ نے بھی جہاد کیا اور انہوں نے بھی جہاد کیا، (لہٰذا جس طرح آپ اس نار جہنم کی لپیٹ میں نہیں آسکتے اسی طرح آپ کے طفیل یہ بھی اس کی لپیٹ میں نہیں آسکیں گے، صحابہ کرام سے) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں نے نبوت کے سوا تمہارے اوپر اپنے لئے اور کوئی فضیلت نہ دیکھی۔ (نبوت کے سوا کسی فضیلت کے نہ دیکھنے کا ارشاد محض تواضعًا ہے ورنہ فضیلت نبوت ایسی چیز ہے کہ تمام فضائل وکمالات اور جملہ محامد ومحاسن کو حاوی ہے۔ مترجم)

دَآبَّۃٍ وَّ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَ ھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ (النحل: ۴۹،۵۰)

"اور اللہ کے واسطے سجدہ کرتے ہیں جو کچھ بیچ آسمانوں کے اور جو کچھ بیچ زمین کے ہیں، چلنے والوں سے اور فرشتے اور وہ نہیں تکبر کرتے، ڈرتے ہیں پروردگار اپنے سے اوپر اپنے سے اور کرتے ہیں جو کچھ حکم کئے جاتے ہیں"۔

(رسالہ ظل نبی، ص ۵)

تین آیتیں اور تین حدیثیں مثبتین ظل نبی ﷺ کا مزعومہ سرمایہ ہے، مثبتین ظل نبی ﷺ کا "سرمایہ مزعومہ" یہی تین آیتیں اور تین حدیثیں ہیں، جنہیں ان کے دعوے' سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جن کا ایک لفظ بھی یہ نہیں بتاتا کہ حضور نبی اکرم نور مجسم ﷺ کے جسم اقدس کا سایہ تھا، جیسا کہ ان شاء اللہ العزیز عنقریب ہمارے ناظرین کرام پر واضح ہو جائے گا، اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ منکرین نورانیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استدلال کی عمارت اِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ سے بھی گئی گزری ہے۔

رہے وہ رکیک شبہات اور نفی ظل کی حدیث پر اعتراضات جو بحوالہ ماہنامہ "تجلی" دیوبند، جناب مرزا ریاض احمد صاحب حافظ آبادی کے مکتوب سے ہم نقل کر چکے ہیں، تو ان سب کا سہارا اور اصل، منکرین کی پیش کردہ آیات واحادیث کا وہی غلط مفہوم ہے جس کو ظل نبی ﷺ کے ثبوت میں پیش کیا گیا، جب ان آیات واحادیث کا مفہوم سامنے آجائے گا، تو وہ سہارا بھی باقی نہ رہے گا اور اہل انصاف بے ساختہ کہہ اُٹھیں گے کہ ؏

وہ شاخ ہی نہیں ہے اب جس پہ آشیانہ تھا

اب رہا منکرین و معترضین کا امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مجدد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی شان اقدس میں ناشائستہ کلمات کہنا اور حضرت ممدوح کے رسالۂ مبارکہ "نفی الفیء" پر پھبتیاں اڑانا، تو یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ لوگ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف جلیلہ پر اپنی لاعلمی کی وجہ سے ہمیشہ مذاق اڑاتے اور منہ کی کھاتے رہے، پچھلے دنوں ہمارے ناظرین کرام "الصدیق، ملتان" کا مضمون اعلیٰ حضرت کے خلاف اور اس کا دندان شکن جواب "السعید" کے صفحات میں پڑھ چکے ہوں گے، اور اس سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی جلالت علمی اور منکرین کی بے مائیگی و لاعلمی کا انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو جائے گی کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت علم کو پانا تو درکنار اس کا سمجھنا اور اندازہ لگانا بھی ان لوگوں کے لئے آسان نہیں۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

بیان مسئلہ اور منکرین کے استدلال پر کلام کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بعض لوگ کم علمی اور ناواقفیت کی وجہ سے ہر مسئلہ شرعیہ پر نصوص قطعیہ اور قرآن و حدیث سے دلائل صریحہ طلب کرتے ہیں اور کہہ دیا کرتے ہیں کہ مطلقاً باب عقائد میں بجز نص قطعی قرآن و حدیث کی صریح عبارت کے کوئی چیز قابل قبول نہیں، حالانکہ اِن کا یہ کہنا قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے، یاد رکھئے قطعی دلیل اور قرآن و حدیث کی صریح قطعی عبارتیں صرف ان عقائد کے لئے ضروری ہیں جو قطعی ہوں اور جن پر مدار ایمان ہو۔ باقی رہے عقائد ظنیہ تو ان کے لئے ظنی دلیلیں پیش کی جائیں گی، شرح عقائد نسفی میں "تفضیل رسل" پر کلام کرتے ہوئے شارح علامہ فرماتے ہیں

ولا خفاء فی ان ھذہ المسئلۃ ظنیّۃٌ یکتفی فیھا بالادلۃ الظنّیۃ ۔

(شرح عقائد نسفی، ص ۱۲۶)

"اس امر میں کوئی خفا نہیں کہ یہ مسئلہ ظنی ہے، جس میں ظنی دلائل پر اکتفا کرا
جاتا ہے"، اسی طرح "نبراس، شرح، شرح عقائد" میں ص ۲۴ پر عقائد کی د
قسمیں قطعی اور ظنی بیان فرمائیں اور اسی مضمون کو واضح فرمایا، نیز اسی نبراس شرح
عقائد کی شرح میں ص ۵۹۸ پر منقولہ بالا عبارت کے تحت بہت تفصیل کے ساتھ فرمایا

حاصل الجواب ان المسائل الاعتقادیة قسمان احدھما مایکون المطلوب فیه الیقین کوحدة الواجب وصدق النبی صلی الله علیه وآله وسلم وثانیھما مایکتفی فیھا بالظن کھذه المسئلة والاکتفاء بالدلیل الظنی انما لا یجوز فی الاول بخلاف الثانی الخ۔

ترجمہ۔ شارح کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ مسائل اعتقادیہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں یقین مطلوب ہو، جیسے واجب تعالیٰ کی وحدت اور نبی کریم ﷺ کا صدق، دوسری وہ جس میں ظن پر اکتفا کرلیا جائے، جیسے (تفضیل رسل کا) یہی مسئلہ، دلیل ظنی پر جن مسائل میں اکتفا نا جائز ہے وہ صرف پہلی قسم کے مسائل ہیں جن میں یقین مطلوب ہوتا ہے، بخلاف دوسری قسم کے جن میں صرف ظن مطلوب ہو، کہ ان میں دلیل ظنی پر بلا شبہ اکتفا جائز ہے، احکام کا بھی یہی حال ہے کہ حکم جتنا قوی ہوگا اس کی دلیل اتنی ہی قوی ہوگی۔

عقائد واحکام کے بعد فضائل ومناقب کی طرف آئیے تو اس سے بھی تنزل اختیار کرنا پڑے گا، یعنی ضعیف حدیثیں بھی اس باب میں معتبر ہوں گی، جیسا کہ خود محدثین کرام نے جابجا اس کی تصریح فرمائی ہے اور ائمہ فقہاء نے فضائل اعمال میں ضعیف ترین احادیث کو معمول بہا قرار دیا ہے، دیکھئے مسح رقبہ (وضو میں گردن پر مسح

کرنے) کی حدیث ایسی ضعیف شدید ہے کہ بعض محدثین نے اسے موضوع تک کہہ دیا، لیکن ائمہ وفقہاء نے اسے بھی معمول بہا مانا اور آج تک اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

فضائل ومناقب میں ضعاف کا معتبر ہونا متفق علیہ ہے، ابن حجر، ملا علی قاری، شاہ عبدالحق دہلوی وغیرہ ہم علماء کی تصریحات خصوصاً محدثین وفقہاء احناف نے صاف صاف ارقام فرمایا، جس سے کوئی اہل علم بے خبر نہیں، دیکھئے افضل القریٰ، ص ۱۱۴، مقدمہ مشکوٰۃ، ص ۹، موضوعات کبیر، ص ۶۳، ۶۴ قفو الاثر، ص ۲۹، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ حدیث کا مضمون قوی حدیث کے مضمون سے مؤید ہو، لازماً اس حدیث ضعیف کو فضائل ومناقب میں قابل احتجاج سمجھا جائے گا۔

عقائد واعمال سے متعلق ہمارے بے شمار ایسے مسائل ہیں جنہیں ہم جزم و یقین کے مرتبہ میں شمار نہیں کرتے، بلکہ محض فضیلت ومنقبت کے درجہ میں مانتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی نیک دل طالب حق محض دلیل نہ ملنے کی وجہ سے ہمارے اس مسئلہ کو تسلیم نہ کرے، تو ہم اسے بدعقیدہ نہیں کہتے، نہ اس کے حق میں برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں، بشرطیکہ اس کا انکار رسول اللہ ﷺ کی عداوت اور بغض وکینہ کی وجہ سے نہ ہو۔

رہا یہ امر کہ اس نیک نیتی اور بغض وعداوت کا امتیاز کیسے ہوگا، تو میں عرض کروں گا کہ یہ امتیاز اس طرح ہوگا کہ جس نے نہ خود کبھی حضور ﷺ کی توہین کی اور نہ کبھی توہین رسول کرنے والے کو جان بوجھ کر اچھا مانا، نہ اس کے قول وفعل یا حال سے اس کی بدعقیدگی ثابت ہوئی، تو ایسے شخص کے متعلق سمجھا جائے گا کہ یہ شخص نیک دل ہے اور اس کا انکار محض اس وجہ سے ہے کہ ہمارے مسئلہ کی کوئی دلیل اس نے نہیں پائی یا اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اور جن لوگوں نے شان رسالت میں گستاخیاں کیں، یا گستاخوں کی گستاخی پر مطلع ہو کر انہیں اچھا جانا اور اپنا مقتدا مانا، یا ان کے کسی قول،

فعل یا حال سے بارگاہ نبوت میں بداعتقادی ظاہر ہوئی، تو ایسے لوگ جب کسی فضیلت ومنقبت کا انکار کریں گے، تو ان کی بداعتقادی و گستاخی اور گستاخ نوازی اس امر کی روشن دلیل ہوگی کہ ان کا یہ انکار معاذ اللہ محض عداوت اور بغضِ رسول ﷺ کی وجہ سے ہے، پہلا انکار تو ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن دوسرا یقیناً ایسا خوفناک ہے کہ جس کے تصور سے قلبِ مومن لرز اُٹھتا ہے۔

الحاصل نبی کریم ﷺ کے جسم اقدس کا سایہ نہ ہونا بھی بابِ فضائل ومناقب سے ہے، جس پر کفر و ایمان کا مدار نہیں، لیکن منکرین کے دل کا بغض وعناد اس بات سے خوب ظاہر ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی ایک فضیلتِ ثابتہ کی نفی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، حتیٰ کہ بزعم خود تین حدیثیں معاذ اللہ جسم اقدس کا تاریک سایہ ثابت کرنے کے لئے تلاش بسیار کے بعد نکال لیں، جن سے استدلال مذکور کا تصور آج تک کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا، فضائل وکمالات نبوت کو مٹانے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سا شرمناک اقدام ہوسکتا ہے۔

منکرین نے تلاشِ بسیار کے بعد جو تین حدیثیں پیش کی ہیں ان کی صحت وحقانیت سے ہمیں بحث نہیں، لیکن ان کے استدلال کی گفتگو جب ہمارے کان سنتے ہیں تو ہمیں نبی اکرم نور مجسم ﷺ کی وہ مبارک حدیث یاد آجاتی ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا تھا:

سیکون فی اٰخر اُمتی اناس یحد ثو نکم بما لم تسمعوا انتم ولا اٰباؤ کم فایاکم وایاھم وفی روایۃٍ یاتو نکم من الاحادیث بما لم تسمعوا انتم ولا اٰباؤ کم فایا کم وایاھم لایضلو نکم ولا یفتنو نکم، رواہ مسلم۔

(مسلم، جلد اوّل، ص ۹۔ مشکوٰۃ، جلد اوّل، ص ۲۸)

"حضور سیّد عالم ﷺ نے فرمایا! اخیر زمانہ میں میرے اُمتی (کہلانے والے) تمہیں ایسی حدیثیں (باتیں) سنائیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے، خبردار! ان سے دُور رہنا، کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور کہیں وہ تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں"۔

الفاظ حدیث پڑھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ چودہ سو برس پہلے نگاہِ رسالت سے مخفی نہ تھا، پھر قابلِ غور یہ امر ہے کہ ابتداءِ اسلام میں ایک دور گزرا جبکہ جاہل ابناء اور ان کے مشرک آباء کا جاہلانہ وجدان شرک وجاہلیت کا معیار ہونے کی وجہ سے انتہائی نفرت وحقارت اور شدید ترین مذمت کے قابل تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وغیرہ آیات میں ان کا مقولہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے بیان فرمایا، لیکن اسلام اور بانی اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی برکت ملاحظہ فرمائیے کہ اخیر زمانہ کے سچے مسلمانوں اور ان کے آباء مسلمین کے وجدان وسماعت کو حق وصداقت کا معیار بلکہ ہدایت کا وہ چمکتا ہوا مینار بنادیا گیا کہ جو بات ان کے کانوں نے کبھی نہیں سنی وہ کسی مسلمان کے لئے سننے کے قابل ہی نہیں۔

اَب اس بات کا فیصلہ ناظرین خود کریں گے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کا معاذ اللہ تاریک سایہ ثابت کرنے کی بات آپ نے یا آپ کے باپ دادا نے سنی تھی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ ایسی بات ہے جو آپ کے سننے کے قابل نہیں بلکہ اپنے آقا و مولیٰ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے بموجب آپ پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے آپ بچیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی باتوں میں آکر آپ گمراہی کے گڑھے میں جا پڑیں یا خدانخواستہ کسی اور فتنہ میں مبتلا ہو جائیں، معاذ اللہ ثم

معاذاللہ۔

مخالفین کی پیش کردہ آیات واحادیث پر کلام کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں محل نزاع متعین کردیا جائے تاکہ نفی واثبات کے دونوں پہلو ناظرین کرام پر اچھی طرح واضح ہوجائیں۔ فاقول وباللہ التوفیق۔

اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بشری جسم اقدس کو ایسا لطیف ونظیف اور پاکیزہ ومطہر کردیا تھا کہ اس میں کسی قسم کی عنصری اور مادی کثافت باقی نہ رہی تھی، اس لئے چاند، سورج، چراغ وغیرہ کی روشنی میں جب حضور ﷺ تشریف فرما ہوتے تو جسم اقدس اس روشنی کے لئے حائل نہ ہوتا تھا اور دیگر اجسام کثیفہ کی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم پاک کا کوئی تاریک سایہ نہ پڑتا تھا، کیونکہ سایہ اس جگہ کی تاریکی کو کہتے ہیں جہاں جسم کثیف کے حائل وحاجب ہوجانے کی وجہ سے چاند سورج وغیرہ کی روشنی نہ پہنچ سکے، جسم مبارک میں جب کثافت ہی نہ تھی تو وہ نورانی جسم کسی روشن چیز کی روشنی کے لئے کیونکر حائل ہوسکتا تھا؟ اس لئے تاریک سایہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسم مبارک پاک تھا۔

رہا یہ امر کہ بشری جسم کا مادی اور عنصری کثافتوں سے اس طرح پاک ہونا محال ہے کہ وہ روشنی کے لئے حاجب نہ ہوسکے، تو یہ ایک دعویٰ بلا دلیل ہے، بلکہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا صریح انکار ہے، جب وہ قادر مطلق نور سے ظلمت اور ظلمت سے نور کو ظاہر کرسکتا ہے اور زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، عدم کو وجود اور وجود کو عدم سے بدل دینے پر قادر ہے تو اس کے لئے بشری جسم کو مادی کثافتوں سے پاک کردینا کون سی بڑی بات ہے؟

ہاں اگر آپ یہ سوال کریں کہ یہ امر محال تو نہیں لیکن اس کے وقوع کی کیا دلیل ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا حضور ﷺ کو سِرَاجًا

مُّنِیۡرًا (روشن کرنے والا چراغ) قرار دینا اور ان کے حق میں قَدۡ جَآءَ کُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ فرمانا اس وقوع کی چمکتی ہوئی دلیل ہے۔

کیونکہ جس ذات مقدسہ کو "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ" کہنے کا حکم دیا تھا اگر اس کے وجود مبارک سے بشری کثافتوں کو پوری طرح دُور نہ کر دیا ہوتا تو اس کے حق میں "مِنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ" اور "سِرَاجًا مُّنِیۡرًا" کبھی نہ فرماتا، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کو باوجود "بشر" فرمانے کے "نور و منیر" محض اس لئے فرمایا گیا کہ جسم اقدس سے ہر قسم کی بشری کثافتیں بالکلیہ دور کر دی گئی ہیں، اور جب کثافتیں دور ہو گئیں تو جسم اقدس کا تاریک سایہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا۔ وللہ الحمد۔

بعض حضرات "مِنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ" اور "سِرَاجًا مُّنِیۡرًا" کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ یہاں "نور" اور "منیر" سے صرف نور ہدایت مراد ہے، حسّی اور جسمانی نور ہرگز مراد نہیں، ان شاء اللہ العزیز ہم اس موضوع پر کسی وقت مستقلاً سیر حاصل بحث کریں گے سردست اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جب حضور ﷺ کے جسم اقدس کے لئے جسمانی اور حسّی نورانیت بھی احادیث کی روشنی میں ثابت ہے تو پھر آپ کو کیا حق ہے کہ اس کا انکار کریں، اور دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں کی خدمت میں مزید اتنی گزارش ہے کہ ہماری پیش کردہ اس دلیل کو آپ اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ہمارے قلم سے صادر ہوئی ہے، چلئے ہم سے آپ ناراض ہیں آپ کی مرضی! مگر مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سے تو کوئی ناراضگی نہیں، لیجئے ان ہی کے منوانے سے مان لیجئے، ہمیں تو آپ کو منوانا مقصود ہے، خواہ کسی طرح آپ مانیں، دیکھئے آپ کے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ارقام فرماتے ہیں :

"وازیں جا است کہ حق تعالیٰ در شان حبیب خود ﷺ فرمود کہ البتہ آمدہ نزد شما از طرف حق تعالیٰ نور و کتاب مبین و مراد از نور ذاتِ پاک

حبیب خدا ﷺ ہست ونیز او تعالیٰ فرماید کہ اے نبی ﷺ ترا شاہد ومبشر ونذیر وداعی الی اللہ وسراج منیر فرستادہ ایم ومنیر روشن کنندہ ونور دہندہ را گویند پس اگر کسے را روشن کردن از انساناں محال بودے آں ذات پاک ﷺ را ہم ایں امر میسر نیامدے کہ آں ذات پاک ﷺ ہم از جملہ اولاد آدم علیہ السلام اند مگر آنحضرت ﷺ ذات خود را چناں مطہر فرمود کہ نور خالص گشتند وحق تعالیٰ آنجناب سلامہٗ علیہ را نور فرمود وبتواتر ثابت شد کہ آنحضرت عالی سایہ نداشتند وظاہر است کہ بجز نور ہمہ اجسام ظل مے دارند"۔ انتہی۔

(امداد السلوک، مطبوعہ بلالی دخانی پریس ساڈھورہ،

ص ۸۵، ۸۶، مصنفہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی)

ترجمہ۔ "اور اسی جگہ سے یہ بات ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی شان میں فرمایا کہ "تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور آیا اور کتاب مبین آئی" اور نور سے مراد حبیب خدا ﷺ کی ذات پاک ہے، نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو شاہد ومبشر اور نذیر اور داعی الی اللہ تعالیٰ اور سراج منیر بنا کر بھیجا ہے"، اور "منیر" روشن کرنے والے اور نور دینے والے کو کہتے ہیں، پس اگر انسانوں میں سے کسی کو روشن کرنا محال ہوتا تو آنحضرت ﷺ کی ذات پاک کے لئے یہ امر میسر نہ ہوتا، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک بھی جملہ اولاد آدم علیہ السلام سے ہے، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات پاک کو ایسا مطہر فرمالیا کہ نور خالص ہو گئے اور حق تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور فرمایا اور

تواتر سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ سایہ نہ رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ نور کے سوا تمام اجسام سایہ رکھتے ہیں"۔

مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی اس عبارت سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں۔

۱۔ آیت کریمہ قَدْ جَآءَ کُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْن (المائدۃ:۱۵) میں نور سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات پاک مراد ہے۔

۲۔ حضور ﷺ سراج منیر ہیں اور منیر روشن کرنے والے اور نور دینے والے کو کہتے ہیں۔

۳۔ بشری جسم سے عنصری اور مادی کثافتوں کا دُور ہو جانا محال نہیں بلکہ واقع ہے۔

۴۔ حضور ﷺ نے اپنی ذات پاک کو ایسا مطہر فرمایا کہ حضور ﷺ نور خالص ہو گئے اور اللہ تعالٰی نے حضور کو نور فرمایا۔

۵۔ بشریت اور نورانیت کا جمع ہونا ممکن ہے۔

۶۔ حضور ﷺ کے جسم پاک کا سایہ نہ تھا۔

۷۔ حضور ﷺ کے جسم اقدس کا سایہ نہ ہونا تواتر سے ثابت ہے۔

۸۔ نور کے سوا تمام اجسام سایہ رکھتے ہیں۔

۹۔ لفظ نور اور منیر سے حضور ﷺ کے لئے جو نورانیت مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے ثابت کی ہے وہ محض ہدایت کی نورانیت نہیں بلکہ حسّی اور جسمانی نورانیت ہے، کیونکہ حضور کی نورانیت کو مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے حضور کے سایہ نہ ہونے کی علت قرار دیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ حضور کا سایہ نہ تھا اور نور کے سوا ہر جسم کا سایہ ہوتا ہے تو جب تک حضور ﷺ کے لئے جسمانی

نورانیت ثابت نہ ہو جسم اقدس سے سایہ کی نفی نہیں ہوسکتی، لہٰذا آفتاب سے زیادہ روشن ہوگیا کہ قرآن کریم کی دونوں آیتیں قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا حضور ﷺ کے جسمانی اور حسّی نور ہونے کی دلیل ہیں، اور یہ دونوں آیتیں ببانگ دہل حضور ﷺ کے جسم اقدس سے تاریک سائے کی نفی کر رہی ہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے والے احناف اہل سنت ان دونوں آیتوں سے اپنے مسلک پر استدلال کرنے میں اگر معاذ اللہ گمراہ اور بے دین ہیں تو مولوی رشید احمد گنگوہی اس گمراہی اور بے دینی سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

منکرین پر سخت حیرت ہے کہ جس مسلک کو وہ کفر و ضلالت قرار دیتے ہیں اور اس کے قائلین کو جہنم تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیتے اگر وہی مسلک ان کے اکابر پیش کر دیں تو وہ ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے، محض اس لئے کہ وہ ان کے مقتدا اور پیشوا ہیں، میں نہایت اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ خدا کے خوف کو دل میں جگہ دے کر ذرا سوچیے کہ آپ کا یہ طرزِ عمل اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی عملی تفسیر نہیں تو اور کیا ہے؟

ماہنامہ تجلی دیوبند نے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا ایک فتویٰ فتاویٰ رشیدیہ سے نقل کیا ہے جس میں مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی حدیث سے لاعلمی کا اظہار فرمایا ہے، اس کی بابت عرض ہے کہ:

اگر آپ اس فتوے کو ہماری پیش کردہ عبارت کے معارض سمجھتے ہیں تو اس حیثیت سے کہ وہ آپ کے مقتدا ہیں، ان کے کلام میں رفعِ تناقض آپ ہی ذمہ ہے، جس طرح چاہیں اس تعارض کو دفع فرمائیں، اظہار لاعلمی کو سوءِ حافظہ پر مبنی قرار دیں یا لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا پر محمول کریں۔

لیکن اس حقیقت سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے اپنی کتاب "امداد السلوک" میں حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کو تواتر سے ثابت مانا ہے، اَب آپ کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کو مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے ہم پایہ مجرم قرار دیں یا مولانا احمد رضا خاں صاحب کو بھی کم از کم اس مسئلہ میں مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی طرح بے گناہ مان لیں ورنہ ظاہر ہے کہ آپ کی حق پسندی کا راز طشت از بام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس تمام بحث وتمحیص کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کو ایسا لطیف ونظیف اور نورانی مانتے ہیں کہ اس کا تاریک سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا، اس کے برخلاف منکرین کا مسلک یہ ہے کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک عام انسانوں کی طرح معاذ اللہ ایسا کثیف تھا کہ اس کا تاریک سایہ پڑتا تھا۔

محلِ نزاع کی تعیین کے بعد ہم چاہتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تائید میں ایک جامع بیان پیش کردیں تا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہوجائے کہ جس مسلک کو لوگ غلط اور فاسد کہہ رہے ہیں اس کے ساتھ اُمت مسلمہ کے کیسے کیسے جلیل القدر علماء محدثین وفقہائے کرام وابستہ ہیں۔ فاقول وباللہ التوفیق عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

اہل سنت کا مذہب ہے کہ حضور نبی اکرم نور مجسم ﷺ کا جسم اقدس اتنا لطیف ہے کہ اس میں کسی قسم کی جسمانی، عنصری اور مادی کثافت نہیں، حضور ﷺ نور ہیں جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا کے چمکتے ہوئے الفاظ وارد ہیں، ملاحظہ فرمائیے مسلم، جلد اوّل، ص ۲۶۱، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ۔

اس مقام پر یہ شبہ وارد نہیں ہوسکتا کہ اس دُعا سے پہلے حضور کی ذات پاک نور نہ تھی ورنہ دُعا کی حاجت نہ ہوتی کیونکہ دعا کرنے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ دُعا سے پہلے وہ صفت نہ ہو جس کے لئے دُعا کی گئی ہے، دیکھئے حضور ﷺ تمام عمر ہر نماز

میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا فرماتے رہے، تو کیا کسی مسلمان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ دُعا سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صراط مستقیم پر نہ تھے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! بلکہ اس مقام پر یوں کہنا پڑے گا کہ کسی نعمت کے لئے دُعا کرنا بسا اوقات اس کے ثابت و باقی رہنے کے لئے ہوتا ہے یا اس نعمت کی ترقی مقصود ہوتی ہے یا اعتراف عبدیت کے لئے دُعا کی جاتی ہے، اس کے ماسوئی دُعا کی حکمت تعلیم اُمت بھی ہو سکتی ہے، علاوہ ازیں جن الفاظ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دُعا فرمائی وہ ایسے بابرکت ہو گئے کہ اُمت جب ان الفاظ میں دُعا کرے گی تو وہ دُعا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بولے ہوئے الفاظ کی برکت کے طفیل اقرب الی الاجابت ہوگی اور اُمت کے حق میں وہ دُعا جس رنگ میں قبول ہو سکتی ہے ضرور قبول ہوگی کیونکہ اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے بولے ہوئے الفاظ ہیں، انہیں خالی واپس کرنا اللہ تعالیٰ کو گوارا نہ ہوگا۔

حاصل کلام یہ کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعا سے حضور کی ذات پاک کا نور ہونا ثابت ہو گیا تو جسم اقدس کا سایہ نہ ہونا بھی لازمی طور پر ثابت ہو گیا، کیونکہ سایہ نہ ہونا لوازم نور سے ہے اور قاعدہ ہے اِذَا ثَبَتَ الشَّیْءُ ثَبَتَ بِجَمِیْعِ لَوَازِمِهٖ، لہٰذا نورانیت محمدیہ ﷺ بھی اپنے لازم کے ساتھ ثابت ہوگی اور نورانیت کا لازم "سایہ نہ ہونا ہے" لہٰذا حضور ﷺ کا نور ہونا حضور کے سایہ نہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

جب بھی حضور ﷺ کی نورانیت کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو منکرین صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہاں علم و ہدایت کا نور مراد ہے، جسمانی نور سے کیا تعلق؟ پھر اِن آیات سے معارضہ کرتے ہیں جن میں علم و ہدایت، قرآن و تورات اور اسلام و ایمان کو نور کہا

گیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ علم وہدایت کی نورانیت توحسبِ مراتب ودرجات ہر اہل علم اور ہدایت یافتہ شخص کو حاصل ہے، حضور ﷺ کی شان اقدس تمام عالم سے بلند وبالا اور افضل واعلیٰ ہے، اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدسہ اور کمالات مبارکہ کو عوام کی ذات وصفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو صفت ملی ہے وہ دوسروں کی نسبت اکمل واتم ہے، اسی طرح عین کا قیاس معنی پر اور وصف کا قیاس ذات پر قیاس مع الفارق ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نور از قبیل معانی بھی ہوتا ہے اور از قبیل اعیان بھی۔

اوّل، جیسے قرآن، ایمان، علم، ہدایت وغیرہ امور جو از قبیل معانی ہیں۔

دوم، جیسے چاند، سورج وغیرہ کہ یہ از قبیل اعیان ہیں۔

جو چیزیں ذات اور عین نہیں بلکہ محض معنی اور صفت کے قبیل سے ہیں، ان کے لئے جب لفظ نور بولا جائے گا، تو اس کے معنی اس چیز کے حسب حال ہوں گے، یعنی وصفی اور معنوی نورانیت، اور جو چیزیں "عین اور معنی" ذات اور صفت سب کی جامع ہوں گی، ان کے لئے جب لفظ نور کا اطلاق ہوگا تو اس سے وہی نورانیت مراد ہو گی جو ان چیزوں کے حسب حال اور شایان شان ہے، یعنی عین اور معنی دونوں قسم کی جامع نورانیت، لہٰذا قرآن وتوراۃ، اسلام وایمان، علم وہدایت، ان سب چیزوں کے لئے جو لفظ نور قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے اس سے وصفی اور معنوی نورانیت کے معنی مراد ہوں گے، کیونکہ یہ سب چیزیں از قبیل اوصاف ومعانی ہیں، اور ظاہر ہے کہ معنی کا عین، اور وصف کا ذات ہونا محال ہے، ہاں! ایسی چیز جو "ذات ووصف" دونوں کی حامل اور "عین ومعنی" دونوں کی جامع ہو، اس کی نورانیت بھی ہر دو قسم کی نورانیت کی جامع ہوگی۔ (الا اذا قام الدلیل علی خلافہ)

چونکہ حضور نبی کریم ﷺ ذات اور وصف دونوں کے جامع ہیں، عین اور معنی دونوں چیزیں علیٰ وجہ الکمال حضور ﷺ کی ذات پاک میں پائی جاتی ہیں، اس لئے حضور ﷺ کے لئے جو لفظ قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے، اس سے مراد وہی نور ہوسکتا ہے جو عینی ومعنوی، ذاتی ووصفی ہر قسم کی نورانیت کا جامع ہو، جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضور ﷺ اسلام وایمان، ہدایت وقرآن، علم وعرفان تمام انوار معانی واوصاف کے حامل ہیں، اور اس کے علاوہ جملہ انوار اعیان یعنی ذات وعین کے قبیل سے جس قدر نور ہیں ان سب کے بھی حضور جامع ہیں، اس تفصیل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد ہر شخص سمجھ جائے گا کہ منکرین کا معارضہ قطعاً باطل ہے۔

یہ جامع نورانیت جو ہم نے حضور ﷺ کے لئے ثابت کی ہے اس کی تائید مزید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے اور اکابر علماء دین محدثین ومحققین کرام کی واضح عبارات بھی حضور ﷺ کے لئے اسی قسم کی جامع نورانیت کی مثبت ہیں جن میں حضور ﷺ کی جسمانی نورانیت کا روشن بیان ہے، اور یہ تصریح موجود ہے کہ حضور ﷺ نور تھے اس لئے آپ کا سایہ نہ تھا، علاوہ ازیں منکرین کے پیشواؤں اور مقتداؤں کی تحریریں بھی اس کی مثبت ومؤید ہیں، اس سے ہمیں بحث نہیں کہ ان کا اعتقاد کیا ہے؟ وہ حضور ﷺ کو اپنے جیسا بشر مانتے ہیں یا اس میں کچھ تبدیلی کرنے لگے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی واضح تحریریں ہمارے بیان کی زبردست تائید کرتی ہیں، جیسا کہ امداد السلوک ص ۸۵، ۸۶ سے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا بیان ہم نقل کر چکے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی نشر الطیب وغیرہ کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

پہلے ہم اِن احادیث کا ذکر کرتے ہیں جن سے حضور ﷺ کی حِسّی عینی اور جسمانی نورانیت ثابت ہوتی ہے۔

حدیث نمبر ۱۔ عن الحسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال سألت خالی ھند بن ابی ھالۃ (ربیب النبی ﷺ) وکان وصافاً عن حلیۃ النبی ﷺ وانا اشتھی ان یصف لی منھا شیئاً اتعلق بہ فقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فخماً مفخماً یتلالؤ وجھہٗ تلالؤ القمر لیلۃ البدر۔
(شمائل ترمذی، ص ۲)

ترجمہ۔ سیدنا امام حسن علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں (نبی ﷺ کے ربیب) ہند بن ابی ہالہ سے جو حضور ﷺ کے بہترین وصاف تھے، حضور ﷺ کا حلیہ مبارکہ دریافت کیا، میرا دل چاہتا تھا کہ وہ حلیہ مقدسہ سے کچھ بیان کریں اور میں اس سے پوری طرح متعارف ہو جاؤں، تو انہوں نے فرمایا حضور ﷺ عظیم اور معظم تھے، آپ کا چہرۂ انور ایسا چمکتا اور روشنی دیتا تھا جیسے چودھویں رات میں چاند چمکتا ہے، اسی حدیث میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔ لہٗ نورٌ یعلوہٗ۔ حضور کی بینی مبارک کا نور بینی مبارک پر یا آپ کی ذات مقدسہ کا نور ذات پاک پر غالب رہتا۔

اسی حدیث کی شرح میں علامہ شیخ ابراہیم بن محمد بیجوری شافعی مصری فرماتے ہیں:

ومعنی یتلالؤ یضیء ویشرق کاللؤلؤ وقولہ تلالؤ القمر لیلۃ البدر ای مثل تلالؤ القمر لیلۃ البدر (انتہٰی)
(شرح شمائل، مطبوعہ مصر، ص ۲۳)

ترجمہ۔ یتلالؤ کے معنی روشن ہونے اور چمکنے کے ہیں جیسے موتی

چمکتا ہے اور تلالؤ القمر لیلۃ البدر کے معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کا چہرۂ انور اس طرح چمکتا تھا جیسے چودھویں رات میں چاند چمکتا ہے۔

حدیث نمبر ۲۔ عن جابر بن سمرۃ قال رأیت رسول اللہ ﷺ فی لیلۃ اضحیان، وعلیہ حلۃ حمراء فجعلت انظر الیہ والی القمر فھو عندی احسن من القمر۔

(شمائل ترمذی، ص ۲)

ترجمہ۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ چاندنی رات میں حضور ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ پر سرخ رنگ کا (دھاری دار) حُلہ تھا، میں حضور ﷺ کو بھی دیکھتا اور چاند پر بھی نظر کرتا تو حضور ﷺ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔

علامہ شیخ ابراہیم بیجوری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

"وفی روایۃ فی عینی بدل عندی والتقیید بالعندیۃ فی الروایۃ الاولی لیس للتخصیص فان ذلک عند کل احدٍ راٰہ کذالک"۔

(المواھب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ، مطبوعہ مصر، ص ۳۰)

ترجمہ۔ ایک اور روایت میں "عندی" کی بجائے "فی عینی" آیا ہے اور روایتِ اولیٰ میں "عندی" کی قید تخصیص کے لئے نہیں ہے، یعنی یہ مطلب نہیں کہ میرے ہی نزدیک حضور چاند سے زیادہ حسین تھے بلکہ فی الواقع ہر دیکھنے والے کے نزدیک حضور ﷺ چاند سے

زیادہ حسین تھے۔

اس کے بعد علامہ بیجوری علیہ الرحمہ اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وانما كان ﷺ احسن لان ضوءهٗ يغلب على ضوء القمر، بل وعلى ضوء الشمس، ففي رواية لابن المبارك وابن الجوزي لم يكن له ظل، ولم يقم مع شمس قط الا غلب ضوءه على ضوء الشمس، ولم يقم مع سراج قط الا غلب ضوءه على ضوء السراج" - انتهٰى

ترجمہ۔ اور حضور ﷺ چاند سے زیادہ حسین اس لئے تھے کہ حضور ﷺ کی روشنی چاند کی روشنی بلکہ سورج کی روشنی پر غالب رہتی تھی، کیونکہ سیدنا ابن مبارک اور علامہ ابن جوزی محدث کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا، اور حضور ﷺ سورج کے سامنے کبھی کھڑے نہیں ہوئے مگر حضور کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی، اسی طرح چراغ کے سامنے بھی حضور کبھی کھڑے نہیں ہوئے مگر چراغ کی روشنی پر بھی حضور ﷺ کی روشنی غالب رہتی تھی۔

حدیث نمبر ۳۔ "عن ابي اسحاق قال سال رجل البراءَ بن عازب اكان وجه رسول الله ﷺ مثل السيف؟ قال: لا، بل مثل القمر"۔

(بخاری شریف، ج ا، ص ۵۰۲۔ شمائل ترمذی، ص ۳)

ترجمہ۔ ابواسحاق سے روایت ہے حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ حضور ﷺ کا چہرہ تلوار کی

طرح تھا؟ انہوں نے فرمایا نہیں بلکہ چاند کی طرح تھا۔

اس حدیث کے تحت حضرت شیخ ابراہیم بیجوری فرماتے ہیں:

"قوله (أكان وجه رسول الله ﷺ مثل السيف) أي: في الاستنارة والاستطالة، فالسؤال عنهما معًا۔ قوله: (قال: لا، بل مثل القمر) أي: ليس مثل السيف في الاستنارة والاستطالة، بل مثل القمر المستدير، الذي هو أنور من السيف"۔ (مواهب اللدنيه شرح شمائل المحمديه مطبوعه مصر، ص ۳۰)

ترجمہ۔ یعنی "کیا حضور ﷺ کا چہرۂ انور روشنی اور لمبائی میں تلوار کی طرح تھا؟" اس کلام میں روشنی اور لمبائی دونوں کے متعلق سوال ہے، حضرت براء بن عازب نے دونوں باتوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ چہرۂ انور روشنی اور لمبائی میں تلوار کی طرح نہ تھا بلکہ گول چاند کی طرح نورانی تھا جو تلوار سے کہیں زیادہ انور اور روشن ہے۔ انتہیٰ۔

حدیث نمبر ۴۔ "عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما قال كان رسول الله ﷺ افلج الثنيتين، اذا تكلم رأى كالنور يخرج من بين ثناياه"۔ (شمائل ترمذی، ص ۳)

ترجمہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ اپنے مبارک دانتوں کے درمیان کشادگی والے تھے، یعنی دندان مبارک کے درمیان جھریاں تھیں، جب حضور ﷺ کلام فرماتے تو دندان مبارک کے درمیان جھریوں سے نور یا نور کی مانند کوئی چمکدار چیز نکلتی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔ انتہیٰ

حضرت شیخ ابراہیم بن محمد بیجوری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

"أیْ رُأی شیء له صفاء، یلمع کالنور، یخرج من بین ثنایاه. ویحتمل أن یکون الکاف زائدة للتفخیم ویکون الخارج حینئذ نورًا حسیًا معجزة له ﷺ" (انتہٰی)

(مواهب اللدنیه شرح شمائل المحمدیة، ص ۳۴)

ترجمہ۔ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نور کی طرح صاف شفاف چیز چمکتی ہوئی دیکھی جاتی تھی جو حضور ﷺ کے نورانی دانتوں کے درمیان سے نکلتی تھی، اور یہاں یہ احتمال بھی ہے کہ "کالنور" میں کاف زائدہ ہو، تفخیم کے لئے بڑھا دیا گیا ہو، اس تقدیر پر نور حسّی تھا جو حضور ﷺ کے دندان مبارک کے درمیان سے بطور ظہور معجزہ چمکتا تھا۔ انتہٰی۔

حدیث نمبر ۵۔ "عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها انّ رسول الله ﷺ دخل علیها مسرورًا تبرق اساریر وجهه"۔

(بخاری شریف، ج، اوّل، ص ۵۰۲)

ترجمہ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ خوش اور مسرور ہو کر میرے پاس تشریف لائے درآنحالیکہ حضور ﷺ کی پیشانی اقدس کے خطوط چمک رہے تھے۔

حدیث نمبر ۶۔ "عن کعب بن مالك قال فلما سلمت علیٰ رسول الله ﷺ وهو یبرق وجهه من السرور وکان رسول الله ﷺ اذا سرّ استنار وجهه کأنّه قطعةُ من القمر"۔

(بخاری شریف، ج، اوّل، ص ۵۰۲)

ترجمہ۔ کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضور ﷺ پر سلام عرض کیا تو چہرۂ انور فرحت وسرور سے چمک رہا تھا، اور حضور ﷺ جب خوش ہوتے تھے تو چہرۂ انور ایسا چمکنے لگتا تھا گویا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔

فتح الباری وغیرہ شروح بخاری اُٹھا کر دیکھئے تمام شُراح کرام ان احادیث سے حضور نبی کریم ﷺ کے حقیقی حِسّی نور کو ثابت مان رہے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ایسی چمکتی ہوئی روشن حدیثوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا شخص جس کے دل میں نورِ ایمان کی ادنیٰ جھلک بھی موجود ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسمانیت مقدسہ کے لئے نورِ حِسّی کا انکار نہیں کر سکتا، اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اس نورانیت کا مقتضیٰ سایہ نہ ہونا ہے، اسی لئے محدثین کرام نے حضور ﷺ کے نور ہونے کو حضور کے سایہ نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔

لیجئے حضور کی نورانیت مقدسہ پر چند اور حدیثیں یاد آگئیں، جن کو سن کر مومنین کے دل انوارِ ایمان سے چمک اُٹھیں گے۔

مواھب اللدنیہ میں امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وقال ابو ھریرۃ واذا ضحک ﷺ یتلألأ فی الجدر۔ رواہ البزار والبیھقی، أی یضیء فی الجدر۔ بضم الجیم والدال، جمع جدارٍ وھو الحائط۔ أی یشرق نورہٗ علیھا اشراقا کاشراق الشمس علیھا" ۔انتھٰی۔

(مواھب اللدنیہ، جلد اوّل، ص ۲۷۱)

ترجمہ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا! حضور ﷺ جب ہنستے تھے تو حضور کا نور دیواروں پر چمکتا تھا، اس حدیث کو امام بزار

اور بیہقی نے روایت کیا، امام قسطلانی حدیث کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا نور دیواروں پر ایسا چمکتا اور روشن ہوتا تھا جیسے سورج کی روشنی دیواروں پر پڑتی ہے اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انتہی۔

خصائص کبریٰ میں ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں کپڑا سی رہی تھی، ہاتھ سے سوئی گر پڑی، چراغ گل ہونے کی وجہ سے اندھیرا تھا، اس لئے تلاش کرنے کے باوجود نہ ملی، اتنے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے، حضور کے چہرۂ انور سے ایسا نور نکلا کہ سوئی ظاہر ہوگئی۔

مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات میں علامہ ابن سبع سے منقول ہے "کان (النبی) ﷺ یضیء البیت المظلم من نورہٖ"۔

"تاریک گھر حضور ﷺ کے نور سے روشن ہوجاتا تھا"

(علامہ محمد مہدی الفاسی، مطالع المسرات، طبع مصر ۱۲۸۹ھ، ص ۳۴۵)۔ (راتا)

یہ حدیثیں کتب احادیث وسیر میں اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا احصاء ممکن نہیں، ان کے بعد بھی اگر کوئی شخص حضور کو نور حقیقی نہیں مانتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ نور ایمان سے بالکل خالی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

ان روایات میں حضور ﷺ کے لئے جو برق، تلالؤ، استنارہ اور نور وغیرہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں ان سے محض رنگ کی صفائی اور حسن وجمال کا بیان مقصود ہے، اسی طرح قطعةٌ من القمر یا مثل القمر سے بھی محض خوبصورتی کا اظہار مقصود ہے، حسی روشنی اور چمک کے معنی مراد نہیں، شعراء عرب بلکہ ہر زبان کے ادباء اپنے محبوبوں کے حسن وجمال کا تذکرہ اسی قسم کے الفاظ میں کیا کرتے ہیں اور ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ وہ الفاظ از قبیل استعارات مانے جاتے ہیں،

اسی قسم کے استعارات ان روایات واحادیث میں بھی وارد ہیں۔

جواباً عرض کروں گا کہ بدعقیدگی اور گمراہی کی اصل بنیاد یہی ہے کہ حضور ﷺ کو عامۃ الناس کے زمرہ میں شمار کرلیا جائے، معاذ اللہ حضور ﷺ کے کمال کی نفی کرنے کے لئے حضور کا قیاس اپنے اوپر کرلینا اہل سنت کے نزدیک بدترین جہالت ہے۔

معمولی سمجھ والا انسان بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ اگر صرف رَاَیْتُ اَسَدًا کہا جائے تو لفظ اسد رجلِ شجاع سے استعارہ ہو سکے گا، لیکن جب کوئی رَاَیْتُ اَسَدًا یَفْتَرِسُ کہے تو پھر "اسد" سے حیوانِ مفترس ہی مراد ہوگا اور اسے بہادر آدمی کے لئے استعارہ قرار دینا درست نہ ہوگا۔

ہماری پیش کردہ احادیث میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے معترض کا استعارہ صحیح نہیں ہوتا، دیکھئے:

(۱) دندان ہائے مبارک کے درمیان سے نور نکلتا ہوا دیکھا جانا۔

(۲) بنی اقدس کے نور کا بینیٔ مبارک پر غالب ہوتا ہوا معلوم ہونا۔

(۳) پیشانی کے خطوط کی چمک کا مشاہدہ۔

(۴) نور اقدس سے دیواروں کا روشن ہو جانا ایسے امور ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس چمک اور نور کے حسّی اور جسمانی ہونے کو اس وضاحت کے ساتھ متعین کررہے ہیں جس کے بعد معترض کے استعارہ کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔

پھر اجلہ شارحین حدیث مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، امام بدرالدین عینی، امام شہاب الدین قسطلانی، علامہ عبدالباقی زرقانی، شیخ ابراہیم بیجوری علیہم الرحمۃ والرضوان کا ان احادیث کی شرح میں یضیء، یشرق، یبرق، یلمع جیسے چمکتے ہوئے الفاظ ارقام فرمانا حقیقت کو اور واضح کررہا ہے، اس پر بھی آپ مطمئن نہ ہوں تو امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی خصائص کبریٰ دیکھ لیجئے، انہوں نے اس میں حضور

ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا ایک مستقل باب منعقد کیا اور فرمایا :

اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ ﷺ لم یکن یریٰ لہ ظلٌ فی شمسٍ ولا قمرٍ قال ابن سبع من خصائصہٖ ﷺ انّ ظلہٗ کان لا یقع علی الارض وانہٗ کان نورا فکان اذا مشیٰ فی الشمس او القمر لا ینظر لہٗ ظلٌ قال بعضھم ویشھد لہٗ حدیث قولہ ﷺ فی دُعائہٖ "واجعلنی نورًا۔ (خصائص کبریٰ، جلد ۱، ص ۶۸)

ترجمہ۔ حکیم ترمذی نے حضرت ذکوان سے اخراج کیا کہ سورج اور چاند کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ دیکھا جاتا تھا، ابن سبع (محدث) نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص سے یہ بات ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا، اور یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نور تھے، اس لئے جب حضور ﷺ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو حضور ﷺ کا سایہ نظر نہ آتا تھا، بعض علماء (محدثین) نے فرمایا کہ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی شہادت حضور کی یہ حدیث بھی دیتی ہے جس میں حضور ﷺ کی یہ دُعا وارد ہے کہ : "واجعلنی نورًا" یا اللہ مجھے نور کردے۔

دیکھئے محدثین نے حضور ﷺ کی حدیث "واجعلنی نورًا" سے حضور کے نور ہونے پر استدلال کیا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ایسی نورانیت ثابت کی جو حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی دلیل ہو، اور وہ حدیثِ ذکوان کے لئے شاہد قرار پائے۔

اسی طرح زرقانی شریف میں ہے

"(ولم یکن لہٗ ﷺ ظلٌ فی شمس ولا قمر) لانہٗ کان نورًا کما قال ابن سبع وقال رزین لغلبۃ انوارہٖ قیل وحکمۃ ذلك صیانتہٗ عن ان یطأ کافرٌ علیٰ ظلّہٖ"۔

ترجمہ۔ اور نہ تھا حضور ﷺ کے لئے سایہ سورج میں اور نہ چاند میں، اس لئے کہ حضور نور تھے جیسا کہ ابن سبع (محدّث) نے کہا اور امام رزین نے فرمایا کہ سایہ نہ ہونا حضور کے غلبہ انوار کی وجہ سے تھا، بعض علماء نے کہا کہ اس کی حکمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات سے بچانا ہے کہ کسی کافر کا پاؤں حضور ﷺ کے سایہ پر پڑے"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"(رواہ الترمذی الحکیم عن ذکوان) ابی صالح السمان الزیات المدنی اَوْ ابی عمرو المدنی مولیٰ عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہما وکل منہما ثقۃٌ من التابعین فھو مرسلٌ لکن روی ابن المبارك وابن الجوزی عن ابن عباس لم یکن للنبی ﷺ ظلٌ ولم یقم مع الشمس قط الا غلب ضوءہ ضوءَ الشمس ولم یقم مع سراج قط الا غلب ضوءہ ضوءَ السراج (وقال ابن سبع کان ﷺ نورًا فکان اذا مشیٰ فی الشمس او القمر لا یظھر لہٗ ظلٌ) لان النور لا ظل لہ (قال غیرہ ویشھد لہ قولہٗ ﷺ فی دعائہٖ) لما سَأل اللہ تعالیٰ ان یجعل فی جمیع اعضائہٖ وجھاتہٖ نورًا اختم بقولہٖ (واجعلنی نورًا) ای والنور لا ظل لہ وبہٖ یتم الاستشھاد"۔ انتھٰی

(زرقانی، مطبوعہ مصر، جلد ۴، ص ۲۲۰)

ترجمہ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ نہ ہونے کی اس حدیث کو ترمذی حکیم نے ذکوان سے روایت کیا، یہ ذکوان ابوصالح سمان روغن فروش مدنی ہیں یا ابوعمرو مدنی جو اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آزاد کردہ غلام ہیں (ان میں سے کوئی ہو بہر حال) یہ دونوں ثقہ ہیں تابعین سے، لہٰذا حدیث مرسل ہوگی (کیونکہ اس میں صحابی کا ذکر نہیں) لیکن حضرت ابن مبارک اور علامہ جوزی نے حضرت ابن عباس (صحابی) رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا، اور حضور ﷺ سورج کے سامنے کبھی نہ کھڑے ہوئے لیکن حضور کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی اور حضور ﷺ کبھی چراغ کے سامنے کھڑے نہ ہوتے مگر حضور کی روشنی چراغ کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی، اور ابن سبع (محدث) نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نور تھے اس لئے حضور جب سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو حضور کا سایہ ظاہر نہ ہوتا تھا، کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا، اور ان کے علاوہ دوسرے علماء محدثین نے فرمایا کہ گواہی دیتا ہے حضور کے سایہ نہ ہونے پر حضور کا وہ قول مبارک جو حضور کی دُعا میں ہے، جب حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام اعضاء میں اور جمیع جہات میں نور کر دے، تو حضور نے اپنی اس دُعا کو اس قول پر ختم فرمایا "وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا" یعنی مجھے بالکل نور کر دے، یہ جملہ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے پر اس لئے شہادت دیتا ہے کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا اور اسی کے ساتھ یہ استشہاد تمام اور پورا ہو جاتا ہے۔

بالکل یہی عبارت زرقانی، جلد ۵، ص ۲۴۹ پر ہے، اور اس میں اس مضمون کے بعد ابن سبع کی کتاب "شفاء الصدور" سے مزید اتنا کلام نقل کیا "فلم یکن فیه قمل لانهٗ نورًا" یعنی حضور ﷺ کے لباس مبارک میں جوں بھی اس لئے نہ پڑتی تھی کہ حضور نور تھے۔

حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا یہی مضمون امام قسطلانی شارح صحیح بخاری نے مواہب اللدنیہ میں بھی نہایت اہتمام کے ساتھ ارقام فرمایا، ملاحظہ فرمائیے مواہب اللدنیہ، جلد ا، ص ۲۸۰، اور مفردات امام راغب میں ہے:

"وَرَوِیٰ اَنَّ النبی ﷺ کان اذا مشیٰ لم یکن لهٗ ظلٌّ"۔

(مفروات امام راغب اصفہانی، مطبوعہ مصر، ص ۳۱۷)

ترجمہ۔ مروی ہے کہ جب حضور ﷺ چلتے تو حضور کا سایہ نہ ہوتا۔

حکیم ترمذی اور ان کی کتاب نوادر الاصول کے متعلق کشف الظنون میں مرقوم ہے:

"نوادر الاصول فی معرفة اخبار الرسول، لابی عبد الله بن محمد بن علی بن حسن بن بشیر المؤذن الحکیم الترمذی المتوفی شهیدا ۲۵۵ھ خمس وخمسین ومأتین... وهو الملقب بسلوة العارفین وبستان الموحدین"۔

(کشف الظنون، جلد ۲، ص ۶۱۵، مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ نوادر الاصول فی معرفۃ اخبار الرسول، ابو عبد اللہ بن محمد بن علی بن حسن بن بشیر موذن حکیم ترمذی کی کتاب ہے جو ۲۵۵ھ میں فوت ہوئے جن کا لقب سلوۃ العارفین اور بستان الموحدین ہے۔

امام المحدثین قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ شفاء شریف میں ارقام فرماتے ہیں:

"وَمَا ذُکِرَ مِنْ اِنَّهٗ لَاظِلَّ لِشَخْصِهٖ فِیْ شَمْسٍ وَّلَا قَمَرٍ لِاَنَّهٗ کَانَ نُوْرًا"

(الشفاء قاضی عیاض، جلد ا، ص ۲۴۲، ۲۴۳)

اس کی شرح میں علامہ شہاب الدین خفاجی، نسیم الریاض میں فرماتے ہیں:

"ومن دلائل نبوته ﷺ (ماذُكِرَ) بالبناء للمجهول والذی ذكره ابن سبع (من انهٗ) بیان موصولة (لاظل لشخصهٖ) أی لجسده الشريف اللطيف اذا كان (فی شمس ولا قمر) مما ترى فيه الظلال لحجب الأجسام ضوء النيرين ونحوهما، وعلل ذلك ابن سبع بقوله: (لأنه) ﷺ (كان نورًا) والأنوار شفافة لطيفة لا تحجب غيرها والانوار، لاظل لها كما هو مشاهد فی الانوار الحقيقة، وهذا رواه صاحب الوفاء عن ابن عباس، رضی الله تعالىٰ عنهما، قال: لم يكن لرسول الله ﷺ ظل ولم يقم مع شمس الا غلب ضوءه ضوءها، ولا مع سراج الا غلب ضوءه، وقد تقدم هذا والكلام عليه ورباعيتنا فيه وهى:

ماجر لظل أحمد اذيال
فی الارض كرامة كما قد قالوا
هذا عجب وكم به من عجب
والناس بظله جميعًا قالوا

وقالوا: هذا من القيلولة، وقد نطق القرآن بأنه النور المبين وكونه بشرًا لا ينافيه كما توهم، فان فهمت فهو

نور علی نور. فان النور ھو بنفسه المظھر لغیرہ. وتفصیله فی مشکاۃ الأنوار للغزالی"۔

(نسیم الریاض، جز ۳، ص ۳۱۹، مطبوعہ مصر)[1]

ترجمہ۔ اور حضور ﷺ کے دلائل نبوت سے جو کچھ ذکر کیا گیا یعنی محدّث ابن سبع نے ذکر کیا یہ ہے کہ جب حضور ﷺ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تھے تو حضور کے شخص کریم یعنی لطیف جسم مبارک کا سایہ نہ پڑتا تھا، ان سایوں میں سے جو روشنی میں اس وجہ سے دیکھے جاتے ہیں کہ اجسام (کثیفہ) چاند سورج وغیرہ کی روشنی کے لئے حاجب ہو جاتے ہیں اور ابن سبع محدّث نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی دلیل یہ بیان کی کہ حضور ﷺ نور تھے اور شفاف لطیف انوار اپنے غیر کے لئے حاجب نہیں ہوتے اور انوار کا سایہ نہیں ہوتا، جیسا کہ حِسّی حقیقی انوار میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور اس کو صاحبِ وفا نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا اور حضور سورج کی روشنی میں کھڑے نہ ہوتے تھے مگر حضور کی روشنی، سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی، نہ کبھی چراغ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے مگر اس کی روشنی پر بھی حضور ﷺ کی روشنی غالب ہو جاتی تھی، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اور اس پر کلام بھی گزر چکا اور ہماری یہ رباعی بھی مذکور ہو چکی کہ احمد مجتبیٰ ﷺ کے سایہ کے دامن حضور کی کرامت وفضیلت کی وجہ سے زمین پر نہ کھینچے گئے (یعنی حضور کا

---

[1] نسیم الریاض، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ، ج ۴، ص ۳۳۵، خلیل رانا

سایہ زمین پر واقع نہ ہوا) جیسا کہ محدثین نے فرمایا ہے، یہ بات تعجب کی ہے اور کس قدر تعجب کی ہے کہ زمین پر ان کا سایہ نہ ہونے کے باوجود سب لوگ ان کے سایہ میں پناہ لیتے اور آرام کرتے ہیں، رباعی کے آخری مصرعہ کا اخیری لفظ "قالوا" "قیلولہ" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دوپہر کو آرام کرنا۔

اور بے شک قرآن پاک ناطق ہے کہ حضور ﷺ "نور مبین" ہیں، اور حضور کا بشر ہونا آپ کے نور ہونے کے منافی نہیں جیسا کہ وہم کیا گیا، پس اگر تو سمجھے تو وہ ایسے نور ہیں جو سب نوروں پر غالب ہے، کیونکہ نور اسے کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو اور اپنے غیر کو ظاہر کرنے والا ہو، اس کی پوری تفصیل امام غزالی کی کتاب مشکوٰۃ الانوار میں ہے۔

اور سیرت حلبیہ میں ہے:

وانہٗ ﷺ اذا مشی فی الشمس او فی القمر لا یکون لہٗ ظلٌّ لِانہٗ کَانَ نورًا۔ انتہٰی (سیرۃ حلبیہ، مطبوعہ مصر، جلد ۲، ص ۴۲۲)

ترجمہ۔ بے شک! حضور ﷺ جب سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تھے تو حضور ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ انتہٰی

تفسیر مدارک میں ہے:

"وقال عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان اللہ ما اوقع ظلك علی الارض لئلا یقع انسانٌ قدمہٗ علی ذلك" -انتہٰی-
(تفسیر مدارک، مطبوعہ مصر، ج ۲، ص ۱۰۳)

ترجمہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا! حضور! اللہ تعالیٰ

نے آپ کا سایہ زمین پر نہ گرنے دیا تا کہ کوئی شخص اس پر اپنا پاؤں نہ رکھ دے۔ انتہیٰ۔

تفسیر عزیزی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وسایہ ایشاں برزمین نیفتد"۔ انتہیٰ۔

(تفسیر عزیزی، پ ۳۰، ص ۲۱۹)

"حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔ انتہیٰ"

حضرت شاہ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

"وعثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ گفت کہ سایہ شریف تو برزمین نمی افتد کہ مبادا برزمین نجس افتد"۔ انتہیٰ۔

(مدارج النبوۃ، جلد ۲، ص ۱۶۱)

ترجمہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (براءۃ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق) بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ حضور! آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا کہیں ایسا نہ ہو کہ ناپاک زمین پر واقع ہو جائے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے سایہ کی اس قدر حفاظت کی تو آپ کے حرم محترم کو ناشائستگی سے کیونکر ملوث ہونے دے گا؟۔ انتہیٰ۔

یہی شاہ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی مدارج النبوۃ میں دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"ونبود مر آنحضرت را ﷺ سایہ نہ در آفتاب ونہ در قمر رواہ الحکیم الترمذی عن ذکوان فی نوادر الاصول، وعجب است ازیں بزرگاں کہ

ذکر نہ کروند چراغ راونور یکے از اسمائے آنحضرت است ﷺ ونور را

سایہ نمی باشد"۔ انتہیٰ۔ (مدارج النبوۃ، جلد اوّل، ص)

ترجمہ۔ اور نہ تھا حضور ﷺ کا سایہ نہ سورج میں نہ چاند میں اس کو حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں حضرت ذکوان سے روایت کیا، اور ان بزرگوں سے تعجب ہے کہ (اس موقعہ پر) انہوں نے چراغ کا ذکر نہ کیا، اور نور حضور ﷺ کے اسمائے مبارکہ سے ہے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ "افضل القریٰ" میں فرماتے ہیں:

"ومما یؤید انہٗ ﷺ صار نورا انہ کان اذا مشیٰ فی الشمس والقمر لا یظھر لہٗ ظلٌّ لانہ لایظھر الا للکثیف وھو ﷺ قد خلصہُ اللہ من سائر الکثافات الجسمانیۃ وصیرہٗ نورا صرفا لایظھر لہٗ ظلٌّ اصلًا"۔ انتھیٰ۔

(افضل القریٰ، مطبوعہ مصر، ص ۷۲)[1]

ترجمہ۔ اور جو چیز اس بات کی تائید کرتی ہے کہ حضور ﷺ نور خالص ہو گئے یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تھے تو حضور ﷺ کا سایہ ظاہر نہ ہوتا تھا کیونکہ سایہ صرف جسم کثیف کا ظاہر ہوتا ہے، اور حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تمام جسمانی کثافتوں سے خالص کر کے ایسا نور محض بنالیا تھا جس کا سایہ اصلاً ظاہر نہ ہوتا تھا۔ انتہیٰ۔

---

[1] (المنح المکیہ فی شرح الھمزیہ، الموسوم افضل القریٰ، مطبوعہ دار المنہاج جدہ، ص ۸۷ (خلیل رانا)

مجمع بحار الانوار (مؤلفہ علامہ طاہر پٹنی) میں ہے :

"من اسمائہ ﷺ النور قیل من خصائصہ ﷺ انہ اذا مشیٰ فی الارض فی الشمس والقمر لا یظہر لہٗ ظل "۔ انتھٰی۔

(مجمع بحار الانوار، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، جلد سوم، ص ۴۰۲)

ترجمہ۔ حضور ﷺ کے اسمائے مبارکہ سے ایک اسم پاک "النور" ہے، کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے خصائص سے یہ بات تھی کہ حضور ﷺ جب سورج یا چاند کی روشنی میں زمین پر چلتے تھے تو حضور ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا۔ انتہیٰ۔

علامہ سلیمان جمل "فتوحات احمدیہ شرح ہمزیہ" میں فرماتے ہیں:

"لم یکن لہٗ ﷺ ظلٌ فی شمس ولا قمر "۔ انتھٰی۔

(فتوحات احمدیہ شرح ہمزیہ، مطبوعہ مصر ۱۳۰۳ھ، ص ۵)

"حضور ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا نہ سورج کی روشنی میں نہ چاند کی روشنی میں"۔ انتہیٰ

علامہ حسین بن محمد الدیار البکری کتاب "تاریخ الخمیس" میں فرماتے ہیں :

"لم یقع ظلہٗ علی الارض ولا رؤی لہٗ ظلٌ فی شمسٍ ولا قمرٍ "۔ انتھٰی۔

(تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس، ج ۱، النوع الرابع، مطبوعہ بیروت، ص ۲۱۸)

ترجمہ۔ حضور ﷺ کا سایہ نہ دھوپ میں پڑتا تھا نہ چاندنی میں۔

یہی عبارت "نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی الاطہار" میں ہے۔

عارف کامل حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ العزیز مثنوی شریف

دفترِ پنجم میں فرماتے ہیں:

چوں فناش از فقیر پیرایہ شود　　او محمد وار بے سایہ شود

در مصرع ثانی اشارہ بمعجزۂ آں سرور ﷺ است کہ آں سرور را سایہ نمی افتاد۔ انتہیٰ۔　　(شرح بحر العلوم)

ترجمہ۔ مصرعہ ثانی میں سرورِ عالم ﷺ کے معجزہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ پڑتا تھا۔ انتہیٰ۔

حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

"وبکشف صریح معلوم گشتہ است کہ خلقت آں سرور علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوٰۃ والتسلیمات ناشی ازیں امکان است کہ بصفات اضافیہ تعلق دارد، نہ امکانیکہ در سائر ممکنات عالم کائن است، ہر چند بدقت نظر صحیفۂ ممکنات عالم را مطالعہ نمودہ می آید، وجود آں سرور آنجا مشہود نمی گردد، بلکہ منشاء خلقت وامکان او علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوٰۃ والسلام در عالم ممکنات نباشد بلکہ فوق ایں عالم باشد ناچار اورا سایہ نبود، ونیز در عالم شہادت سایہ ہر شخص لطیف ترست وچوں لطیف ترازوی در عالم نباشد اورا سایہ چہ صورت دارد، علیہ وعلیٰ آلہٖ الصلوٰۃ والتسلیمات"۔ انتہیٰ۔

(مکتوباتِ امام ربانی، جلد سوم، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، ص ۱۸۷)

ترجمہ۔ اور کشف صریح سے معلوم ہوا کہ آں سرورِ عالم ﷺ کی خلقت اس امکان سے ناشی ہے جو صفاتِ اضافیہ سے تعلق رکھتا ہے، نہ اس امکان سے جو تمام عالم ممکنات میں ہے، جس قدر بھی دقتِ نظر سے صحیفۂ ممکناتِ عالم کا مطالعہ کیا جائے آں سرور ﷺ کا وجود مبارک وہاں (امکانِ ممکنات سے متصف ہوکر) ظاہر نہیں ہوتا

(حتیٰ کہ) حضور ﷺ کی خلقت وامکان کا منشأ عالم ممکنات میں بالکل نہیں پایا جاتا، بلکہ منشأ خلقت محمدی اس عالم امکان سے بالاتر ہے لہٰذا ناچار حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا۔

نیز عالم شہادت میں ہر شخص کا سایہ اس سے لطیف تر ہوتا ہے، جب حضور ﷺ سے لطیف تر عالم میں کوئی چیز ہو نہیں سکتی تو حضور ﷺ کا سایہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ انتہیٰ۔

اس کے بعد اسی مکتوبات جلد سوم کے مکتوب "صدوبست ودوم" کے آخر میں فرماتے ہیں:

ع ممکن چہ بود کہ ظل واجب باشد

واجب را تعالیٰ چرا ظل بود موہم تولید مثل است ومبنی بر شائبہ عدم کمال لطافت اصل! ہرگاہ محمد رسول اللہ ﷺ را از لطافت ظل نبود خدائے محمد را چگونہ ظل باشد"۔ انتہیٰ (مکتوبات امام ربانی، جلد سوم، ص ۲۳۷)

ترجمہ۔ کیسے ممکن ہے؟ کہ واجب کا سایہ ہو، واجب تعالیٰ کے لئے تو سایہ کا ہونا ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ سایہ تولید مثل کا وہم پیدا کرتا ہے اور عدم لطافت اصل کا مُظہر ہے، جب کمال لطافت کی وجہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ تھا تو خدائے محمد کا سایہ کیونکر ہو سکتا ہے؟۔ انتہیٰ۔

حضور سیّد عالم ﷺ کے لئے حسّی حقیقی نورانیت کے ثبوت میں ناظرین کرام ہمارے دلائل پڑھ چکے، اَب ایک چھوٹی سی عبارت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی بھی ملاحظہ فرمالی جائے، ان کے عقیدے سے ہمیں بحث نہیں سردست الزاماً علی الخصم "نشر الطیب" کی ایک عبارت ہدیہ ناظرین ہے۔

"جب آپ ہنستے تھے تو دیواروں پر چمک پڑتی تھی"۔

(نشر الطیب، مطبوعہ تاج کمپنی، ص ۱۶۰)

ناظرین کرام غور فرمائیں کہ یہ عبارت حضور ﷺ کے لئے حسی حقیقی نورانیت کی مثبت ہے یا نہیں؟

اگر گنجائش ہوئی تو دیوبند کا فتویٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ نہ ہونے کے بارہ میں فتاویٰ دیوبند سے نقل کیا جائے گا لیکن اہل انصاف کو اَب مزید کسی حوالہ کی ضرورت نہیں رہی الحمد للہ، حق آفتاب سے زیادہ روشن ہو گیا۔ ہم نے اس بیان میں جن علماء اُمت اور مصنفین کے اقوال و روایات پیش کئے ہیں اور جن کتابوں سے عبارات نقل کی ہیں ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

علماءِ مصنفین

(۱) حکیم ترمذی۔ (۲) حافظ رزین۔ (۳) ابن مبارک۔ (۴) محدث ابن سبع۔ (۵) علامہ ابراہیم بیجوری۔ (۶) قاضی عیاض۔ (۷) مولانا روم۔ (۸) علامہ حسین بن محمد دیار البکری۔ (۹) محدث ابن جوزی۔ (۱۰) صاحب سیرت شامی۔ (۱۱) صاحب سیرت حلبیہ۔ (۱۲) امام جلال الدین سیوطی۔ (۱۳) امام راغب اصفہانی۔ (۱۴) علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی۔ (۱۵) علامہ شہاب الدین خفاجی۔ (۱۶) امام قسطلانی۔ (۱۷) امام زرقانی مالکی۔ (۱۸) شیخ عبدالحق دہلوی۔ (۱۹) حضرت مجدد الف ثانی۔ (۲۰) علامہ بحر العلوم لکھنوی۔ (۲۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ (۲۲) امام نسفی۔ (۲۳) علامہ سلیمان جمل۔ (۲۴) علامہ ابن حجر مکی۔

ان کے علاوہ دو مولوی مخالفین کے جن میں ایک مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور دوسرے مولوی اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔

اور جن کتابوں سے ہم نے اپنے بیان کے دلائل کو اخذ کیا ہے ان کے نام

حسب ذیل ہیں۔

(۱) نوادر الاصول فی بیان اخبار الرسول۔ (۲) سیرۃ حلبیہ۔ (۳) خصائص کبریٰ۔ (۴) مفردات امام راغب۔ (۵) مجمع بحار الانوار۔ (۶) نسیم الریاض۔ (۷) شفاء قاضی عیاض۔ (۸) زرقانی۔ (۹) مدارج النبوۃ۔ (۱۰) مکتوبات امام ربانی۔ (۱۱) تفسیر عزیزی۔ (۱۲) تفسیر مدارک۔ (۱۳) مثنوی شریف۔ (۱۴) شرح بحر العلوم۔ (۱۵) افضل القریٰ۔ (۱۶) مواہب اللدنیہ۔ (۱۷) شمائل ترمذی انموذج اللبیب اور ان کے علاوہ دیگر کتب معتبرہ سے روشن دلائل اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔

لیجئے ایک نظر دیوبند کا فتویٰ بھی دیکھتے چلئے۔

آنحضرت ﷺ کا سایہ نہ تھا۔ سوال نمبر ۱۴۶۴

وہ حدیث کون سی ہے جس میں یہ ہے کہ رسول مقبول ﷺ کا سایہ زمین پر واقع نہیں ہوتا تھا؟

الجواب۔ امام سیوطی نے خصائص کبریٰ میں آنحضرت ﷺ کا سایہ زمین پر واقع نہ ہونے کے بارے میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے، اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ ﷺ لم یکن یری لہٗ ظل فی شمس ولا قمرٍ الخ اور تواریخ حبیب الٰہ میں مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آپ کا بدن نور تھا اسی وجہ سے آپ کا سایہ نہ تھا، مولوی جامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا سایہ نہ ہونے کا خوب نکتہ لکھا ہے اس قطعہ میں۔

پیغمبر ما نداشت سایہ
تا شک بدل یقیں نیفتد
یعنی ہر کس کہ پیرو اوست

پیدا ست کہ پا زمیں نیفتد

(عزیز الفتاویٰ، جلد ہشتم، ص ۲۰۲)

ایک شبہ کا جواب

فتاویٰ دیوبند سے فتویٰ منقولہ بالا نقل کرتے وقت ایک دوست نے شبہ وارد کیا کہ میں نے دیوبند ہی کے کسی مجموعہ فتاویٰ میں اس فتوے کے خلاف فتویٰ دیکھا ہے، فقیر نے جواباً عرض کیا کہ ان حضرات کے فتووں کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں، نہ ہمیں اس سے کوئی بحث ہے، ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے محض اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کیا وہ اعلیٰ حضرت پر افتراء کرتے ہیں دراصل ان کے مقتداء بھی ایسے فتوے دیتے چلے آئے اور انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ واقعی حضور ﷺ کا بدن مبارک نور تھا، جس کی وجہ سے حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا اور عارف جامی جیسے حضرات کا بھی یہ مسلک ان کے نزدیک مسلّم ہے، اَب اگر وہ اس کے خلاف لکھیں تو موردِ الزام وہ خود بنتے ہیں، جس کا جواب ان کے اپنے ذمہ ہے کہ جس بات کو وہ اہلِ حق کا مسلک مان چکے ہیں اس کا انکار کیوں کرتے ہیں؟

ایک اور اعتراض کا جواب

اس مقام پر ایک یہ اعتراض بھی ہوسکتا ہے کہ اگر واقعی حضور ﷺ کا جسم مبارک نور تھا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے کہ نبی کریم ﷺ میرے حجرۂ مبارکہ میں رات کی نماز پڑھتے تھے چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا ہوتا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سجدہ میں جاتے تو میرے پاؤں کو اپنے مبارک ہاتھ سے دبا دیتے اور میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تب حضور ﷺ سجدہ فرماتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے یا اس قسم کی بعض دیگر روایات سے نورِ اقدس کے وجود کی نفی ہرگز ثابت نہیں ہوتی، بلکہ غایت مافی الباب نورِ مبارک کے ظہور کی نفی ہوگی اور نفیٔ ظہور، نفیٔ وجود کو مستلزم نہیں، ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ نور دو قسم کا ہے حسّی اور معنوی، دیکھئے علم وادراک نورِ معنوی ہے لیکن جب عدم التفات کا حال طاری ہوتا ہے تو اس وقت نورِ علم کا ظہور نہیں ہوتا، مگر اس کے وجود کی نفی آپ نہیں کر سکتے، کیونکہ تصدیق اور ایمان بھی علم ہے، جب مومن مصدق پر نیند، بے ہوشی یا اس کے علاوہ کسی قسم کے عدم التفات از قبیل ذہول وغیرہ کا غلبہ ہوتا ہے تو ظہورِ علم کی نفی ہوگی، وجود کی نفی نہیں ہوسکتی ورنہ علم کی نفی سے تصدیق کی نفی ہوجائے گی، کیونکہ وہ تصدیق کا منقسم ہے اور تصدیق ہی عین ایمان ہے، تو معاذ اللہ ان سب حالتوں میں مومن کے ایمان کی نفی ہوگی حالانکہ یہ قطعاً باطل ہے، پس جس طرح نورِ معنوی بعض احوال میں ظاہر نہیں ہوتا مگر موجود ہوتا ہے اسی طرح بمقتضائے حکمت ایزدی کسی وقت نورِ حسّی بھی ظاہر نہ ہو تو اس کا وجود منتفی نہ ہوگا، دیکھئے اسی حدیث میں نورِ اقدس کے عدمِ ظہور سے دین کے کئی مسئلے پیدا ہو گئے، مثلاً اگر نمازی پوری طرح مطمئن ہے تو اندھیرے میں نماز کا جواز ثابت ہوا، پھر یہ کہ نمازی کے سامنے عورت کا جانب قبلہ میں معترض ہونا مفسد صلوٰۃ نہ رہا، تیسرے یہ کہ نمازی اگر بحالت نماز عورت کے جسم کو ہاتھ لگادے تو وضو اور نماز دونوں صحیح ہیں، اگر اس وقت حضور کا نور بالقوہ نہ ہوجاتا تو یہ مسائل کیسے مدوّن ہوتے؟ یاد رکھئے حضور کی ادائیں دین ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

الغرض بربنائے حکمت جیسے نورِ معنوی کا عدمِ ظہور جائز ہے اسی طرح حکمت کے پیش نظر نورِ حسّی کا عدمِ ظہور بھی یقیناً جائز اور ممکن ہے مگر اس سے عدمِ وجود پر استدلال کرنا بے نوری کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟

حرف آخر

الحمد للہ! ہم نے نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا کہ حضور ﷺ کا جسم پاک ایسا نورانی اور لطیف تھا کہ اس کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا، نفی سایہ کے بیان سے ہم فارغ ہو گئے البتہ حدیث ذکوان کے متعلق ابھی کچھ عرض کرنا باقی ہے۔

فاقول وباللہ التوفیق۔

اس میں شک نہیں کہ حدیث ذکوان ضعیف ہے، لیکن ایسی نہیں کہ بالکل ساقط الاعتبار ہو، چہ جائیکہ اسے موضوع کہا جائے، اس لئے کہ اگر یہ حدیث بالکل ساقط الاعتبار یا موضوع ہوتی تو وہ جلیل القدر ائمہ حدیث جن کی عبارات ہم اپنے بیان میں نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ نقل کر آئے ہیں ہرگز اس روایت کو حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی تائید میں پیش نہ کرتے۔

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ جن احادیثِ ضعیفہ کو محدثین نے مجروح کر کے چھوڑ دیا اور کسی معتبر محدّث نے ان سے کوئی استدلال نہیں کیا نہ کسی مسئلہ کی تائید میں انہیں پیش کیا ان سے استدلال کرنا ضرور محلِ نظر ہے، لیکن جن احادیث ضعیفہ سے اہل علم نے استدلال کیا یا انہیں کسی مسئلہ کی تائید میں پیش کیا، انہیں علی الاطلاق ساقط الاعتبار قرار دینا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسی صورت میں وہ تمام محدثین اور علمائے اعلام مورد طعن قرار پائیں گے جنہوں نے ان احادیث کو کسی مسئلہ شرعیہ کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے اور اگر اس بارے میں کوئی شخص ان تمام اجلۂ محدثین کے خلاف اپنے خیال کو صحیح سمجھتا ہے تو یہ اس کی جرأت عظیمہ ہے جو اہل انصاف کے نزدیک کسی طرح مقبول اور پسندیدہ نہیں ہوسکتی۔

علاوہ ازیں ابواب فضائل و مناقب میں ضعاف کا معتبر ہونا ایک حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار محض تعصب و اعتساف ہے۔

اس کے بعد یہ بھی عرض کر دوں کہ رسول اللہ ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی اصل دلیل ہمارے نزدیک وہ آیات قرآنیہ مرقومہ بالا ہیں جن میں حضور ﷺ کو نور فرمایا گیا ہے، نیز وہ احادیث مذکورۃ الصدر ہیں جن سے حضور ﷺ کے لئے ہم کامل نورانیت ثابت کر چکے ہیں اور سایہ نہ ہونے کی روایات ان آیات واحادیث کے مضمون کی مؤید ہیں، ایسی صورت میں ان کا ضعف کسی حال میں بھی ہمارے لئے مضر نہیں۔

اگر آپ اعتراض کریں کہ جب حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا سایہ نہ ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے تو اس کا منکر تمہارے نزدیک خارج از اسلام ہونا چاہئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری پیش کردہ نصوص چونکہ دوسرے معنی کی بھی محتمل ہیں اس لئے ان کا یہ حکم قطعی نہیں لہٰذا منکر کو ہم خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ دوسرا احتمال چونکہ ضعیف ہے اس لئے وہ ہمارے استدلال سے مانع نہیں ہو سکتا، لہٰذا باب مناقب میں ان سے ہمارا دعویٰ بھی ثابت ہو جائے گا اور عدم قطعیت کی وجہ سے اس کا منکر کافر بھی نہ ہوگا۔

پھر یہ کہ فقہاء اور اہل علم جس حدیث ضعیف سے کسی مسئلہ پر استدلال کریں یا اسے کسی مسئلہ شرعیہ کا مؤید قرار دیں تو اس میں فی الجملہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کما لا یخفی علی الذکی۔

چونکہ اس حدیث کو بھی علماء محدثین نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے اس لئے اس میں ایسی قوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے اسے بالکلیہ ساقط الاعتبار کہنا درست نہیں۔

علاوہ ازیں یہ حدیث صرف ذکوان سے نہیں بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے جیسا کہ زرقانی علی المواہب میں ہے:

"فھو مرسلٌ لکن روی ابن المبارك وابن الجوزی عن ابن عباس لم یکن للنبی ﷺ ظل۔" الحدیث

(زرقانی، جلد رابع، مطبوعہ مصر، ص ۲۲۰)

اور زرقانی علی المواہب کے متعلق آپ کے علامہ شبلی نعمانی "سیرۃ النبی" میں ارقام فرماتے ہیں :

"زرقانی علی المواہب، یہ مواہب اللدنیہ کی شرح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی (روض الانف) کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے"۔ (سیرۃ النبی، مؤلفہ شبلی نعمانی، جلد اوّل، طبع پنجم، ص ۳۷)

لہٰذا اس حدیث کو مرسل کہہ کر پیچھا چھڑانا ممکن نہیں، ہاں! بعض رواۃ کی جہت سے اس کا ضعف مسلّم ہے، لیکن یاد رہے کہ اس حدیث کی صرف ایک روایت نہیں بلکہ ایک سے زائد روایتوں سے یہ حدیث مروی ہے جیسا کہ زرقانی کی منقولہ عبارت سے ثابت ہے لیکن تائید مزید کے لئے آپ کے علامہ شبلی نعمانی کی ایک عبارت بھی پیش کئے دیتا ہوں، دیکھئے وہ لکھتے ہیں:

"ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلعم کا سایہ نہ تھا، یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا، لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور نا قابل اعتبار ہیں"۔

(سیرۃ النبی، مؤلفہ شبلی نعمانی، جلد دوم، ص ۱۹۸)

شبلی صاحب نے اس عبارت میں دو جگہ "ضعیف روایتوں" اور "یہ روایتیں" لکھ کر اس بات کو تسلیم کر لیا کہ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا مضمون ایک سے زیادہ کئی روایتوں میں آیا ہے، مانا کہ وہ سب ضعیف ہیں لیکن بہر حال وہ ایک روایت نہیں

بلکہ کئی روایتیں ہیں، اس کے باوجود بھی انہیں نا قابل اعتبار کہنا ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے؟ فن حدیث سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ ضعیف روایت طرق متعددہ سے مروی ہو تو اسے علی الاطلاق نا قابل اعتبار نہیں کہہ سکتے، اور علمائے محدثین کی عبارات تو ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے ناظرین کرام کو محدثین کا مسلک معلوم ہو گیا ہو گا۔

ایک معمہ

عبارت منقولہ بالا میں شبلی صاحب نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی روایتوں کی سند کا وجود تو مان لیا، یہ اور بات ہے کہ صحت کی نفی اور ضعف کا اثبات کیا لیکن بہر نوع سند کو ضرور تسلیم کیا کیونکہ صحیح یا ضعیف ہونا دراصل سند ہی کی صفت ہے اگر سند کا وجود نہ ہو تو صحت وضعف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہی شبلی صاحب اس سے پہلے ص ۱۹۷ میں ارقام فرما چکے ہیں :

"عام طور سے مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا لیکن اس کی کوئی سند نہیں"۔ (سیرۃ النبی، مؤلفہ شبلی نعمانی، جلد دوم، ص ۱۹۷)

اَب یہ معمہ شبلی صاحب یا ان کے مقلدین ہی حل فرمائیں گے کہ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی جب کوئی سند ہی نہیں تو آپ کس چیز کو صحت سے خالی اور ضعیف قرار دے رہے ہیں۔

جن مودودیت زدہ لوگوں نے ازراہ تعصب! حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی حدیث کو مرسل اور ضعیف کہہ کر بالکل ساقط الاعتبار قرار دیدیا، نہ تعدد روایات کا لحاظ رکھا نہ اجلۂ فضلائے اُمت کے مسلک کو دیکھا، گویا جلیل القدر محدثین کے مسلک کو قرآن وحدیث کے خلاف سمجھا، ان کی خدمت میں نہایت اخلاص کے ساتھ گزارش ہے کہ اس مقام پر ذرا مودودی صاحب کے ارشادات ہی ملاحظہ فرمالئے

ہوتے، آپ کے مودودی صاحب نے ایک مرسل اور ضعیف حدیث سے پردہ کے بارہ میں (باب احکام میں) استدلال کیا مگر استاذ ناصر الدین نے جب ان کی گرفت کی تو مودودی صاحب نے ان کو وہی جوابات دیئے جو ایک زمانہ سے ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے چلے آئے ہیں، خدارا عناد کو چھوڑ کر ذرا انصاف کیجئے شرعی مسائل میں یہ جانب داری اچھی نہیں، وہاں تو احکام کا معاملہ ہے اور یہاں محض مناقب کا مسئلہ ہے اگر اَب بھی آپ اپنی ضد پر اڑے رہے تو یہ حق پسندی نہ ہوگی، مودودی صاحب کے بیان سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں انہیں غور سے پڑھ لیجئے، ماننا نہ ماننا آپ کی مرضی پر موقوف ہے، وہ ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں:

"اوّلاً یہ بات اصحاب علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور فاضل استاذ سے بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ ایک ضعیف حدیث اگر کسی مضمون کے بیان کرنے میں منفرد ہو تو اس کے ضعف سند کی وجہ سے اس کا حکم بھی ضعیف ہو جاتا ہے، لیکن اگر متعدد ضعیف احادیث ایک مضمون کے بیان کرنے میں متفق ہوں تو چاہے ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً بلحاظ اسناد کتنی ہی ضعیف ہو ان کا مشترک مضمون قوی ہو جاتا ہے، استاذ محترم نے میری نقل کردہ ایک حدیث کے ضعف پر کلام کیا ہے مگر اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ ان ضعیف احادیث کی مجموعی شہادت سے ان کے مشترک مضمون کو قوت حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔ ثانیاً حدیث ضعیف کے معنی لازماً یہی نہیں ہے کہ وہ جھوٹ اور موضوع ہے، اس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، کذب کا احتمال یہ تقاضا ضرور کرتا ہے کہ اس حکم کے معاملہ میں احتیاط برتی جائے جو اس میں بیان کیا گیا ہو پھر جب کہ اسی حکم کا ذکر

متعدد دوسری ضعیف احادیث میں بھی ہو تو اس کے احتمالِ صدق کا پہلو زیادہ راجح ہو جاتا ہے، ہم چاہے یہ نہ کہہ سکیں کہ ان احادیث سے فلاں فعل کا واجب یا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فعل شرع پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ، اور فلاں فعل کرنا چاہئے یا نہ کرنا چاہئے کم از کم اس سے شریعت کے رجحان کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

ثالثاً یہ بات بھی فاضل استاذ سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ فقہاء کی تلقی بالقبول احادیث کے ضعف میں نہیں بلکہ اس کی قوت میں اضافہ کرتی ہے"۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۲۴)

اس کے بعد ص ۲۵ پر فرماتے ہیں :

"فاضل استاذ درست کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہے اس لئے ضعیف ہے لیکن صرف مرسل اور ضعیف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خبر بالکل جھوٹی اور ساقط الاعتبار ہی ہو"۔

اس کے بعد ص ۲۶ پر فرماتے ہیں :

"جہاں تک قرآن اور سنت صحیحہ کے خلاف دعویٰ ہے اس کے متعلق تو میں بعد میں کچھ عرض کروں گا، لیکن یہاں اتنی بات عرض کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ ابن جریر اور قتادہ نہ تو قرآن سے اس قدر ناواقف ہیں کہ ایک چیز اس کے خلاف ہو مگر انہیں اس کا احساس نہ ہو اور نہ وہ ایسے جری ہیں کہ جان بوجھ کر ایک مخالف قرآنی بات نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیں، ایسا دعویٰ کرنے سے پہلے استاذ ناصر الدین کو

اپنی جگہ اچھی طرح غور کر لینا چاہئے تھا کہ وہ کیا فرما رہے ہیں"۔

آگے چل کر ص ۳۳ پر فرماتے ہیں کہ:

"اس کے متعلق استاذ موصوف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے یعنی نبی ﷺ کا قول و فعل نہیں بلکہ ایک صحابیہ کا فعل ہے، اگر استاذ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آثار صحابہ نا قابل احتجاج ہیں اور ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی، یا ان کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے معاملہ میں شریعت کا منشاء معلوم کرنے کے لئے اُمہات المومنین کا عمل کوئی معتبر ذریعہ نہیں"۔

مودودی صاحب کے اس بیان کی روشنی میں حسب ذیل امور واضح ہو گئے:

۱۔ حدیث ذکوان جس میں حضور ﷺ کے جسمانی سایہ کی نفی ہے، باوجود مرسل اور ضعیف ہونے کے فی الجملہ قوت رکھتی ہے اس لئے کہ دیگر روایات اس کے مضمون کی مؤید ہیں، جیسا کہ ہم بالتفصیل عرض کر چکے ہیں۔

۲۔ محض ضعف کی وجہ سے اس حدیث کو جھوٹا اور موضوع کہنا جائز نہیں، اس کی روشنی میں کم از کم شریعت کا یہ رجحان تو ظاہر ہو گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ نہ تھا۔

۳۔ محدثین کا اس حدیث کو حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کے ثبوت یا اس کی تائید میں پیش کرنا اس کے ساقط الاعتبار ہونے کی تردید کرتا ہے۔

مخلصانہ گزارش

اپنے مخالفین کی خدمت میں ایک دفعہ پھر گزارش کروں گا اور مخلصانہ عرض کروں گا کہ حضور سیّد عالم ﷺ کو نور مان کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم اقدس

سے سایہ کی نفی کرنے میں حسب ذیل اعلام اُمت ہمارے مقتداء ہیں جن کی چمکتی ہوئی عبارات کتب معتبرہ سے ہم نقل کر چکے ہیں اور بنظر سہولت اکثر کتابوں کے صفحات بھی تحریر کر دیئے ہیں۔

(۱) حکیم ترمذی۔ (۲) حافظ رزین۔ (۳) ابن مبارک۔ (۴) ابن جوزی۔ (۵) محدث ابن سبع۔ (۶) قاضی عیاض۔ (۷) جلال الدین سیوطی۔ (۸) علامہ حسین بن محمد دیار بکری۔ (۹) صاحب سیرت حلبیہ علامہ برہان الدین حلبی۔ (۱۰) عارف رومی۔ (۱۱) شہاب الدین خفاجی۔ (۱۲) امام قسطلانی۔ (۱۳) علامہ زرقانی۔ (۱۴) امام راغب اصفہانی۔ (۱۵) امام نسفی۔ (۱۶) مجدد الف ثانی۔ (۱۷) علامہ ابراہیم بیجوری۔ (۱۸) علامہ بحر العلوم عبدالعلی لکھنوی۔ (۱۹) امام محمد بن یوسف صالحی صاحب سیرت شامی۔ (۲۰) علامہ سلیمان جمل۔ (۲۱) علامہ ابن حجر مکی۔ (۲۲) علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی۔ (۲۳) شاہ عبدالحق محدث دہلوی۔ (۲۴) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ علیہم الرحمۃ والرضوان۔

اگر ہمارے خلاف حضور ﷺ کی نورانیت کی نفی اور جسمانی سایہ کے ثبوت میں ایسے ہی محققین اعلام اُمت کے صریح اور واضح اقوال آپ کے پاس ہیں تو ازراہ کرم قائلین کے اسماء گرامی کے ساتھ اسی طرح دکھائیں جیسے ہم نے مسلم بزرگان دین کے ارشادات اور ان کے اسماء گرامی کی فہرست آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

اُولٰئِكَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ورنہ برائے کرم غور فرمائیے کہ کیا ان اعلام اُمت نے معاذ اللہ! قرآن وحدیث کے خلاف اپنی طرف سے ایک جھوٹی بات حضور ﷺ کی طرف منسوب کر دی؟ آپ کے خیال میں یہ حضرات قرآن وحدیث سے ایسے ہی ناواقف تھے کہ

ایک خلاف واقعہ امر کو انہوں نے حضور ﷺ کی طرف نہایت شدومد کے ساتھ منسوب کر دیا، اور انہیں اس کا احساس تک نہ ہوا۔

مجدد الف ثانی

پھر سب سے زیادہ عجیب یہ بات ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حضور سیدِ عالم ﷺ کو نور مان کر حضور کے جسم اقدس سے سایہ کی بار بار نفی فرمائی اور نہایت لطیف و نفیس اندازِ بیان میں اس نورانی مضمون کو ادا فرمایا۔

حضرت مجدد الف ثانی کو تمام دیوبندی اور خصوصاً مودودی قسم کے لوگ بھی مجدد مانتے ہیں اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مجدد کا کام یہ ہے کہ دین میں لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کا ازالہ کرے، مسلمانوں کے غلط اور فاسد خیالات کی تردید اور عقائد حقہ کی ترویج و تائید مجدد کے فرائض تجدید کا جزو لا ینفک ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے ناظرین کرام نے دیکھ لیا کہ مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم نورِ مجسم ﷺ کی نورانیت کا عقیدہ ظاہر فرمایا اور جسم اقدس کے سایہ کی نفی فرمائی، جو اس امر کی روشن دلیل ہے کہ حضور ﷺ کے نور ہونے کا اعتقاد اور جسم اقدس کے سایہ کی نفی کا مسلک ہی حق ہے اور اس کا انکار کرنا شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً غلط اور فاسد ہے۔

الحمدللہ! حدیث ذکوان پر کلام ختم ہوا اور مسئلہ ظل نبی ﷺ کی نفی کے پہلو کا مکمل جائزہ ناظرین کرام کے سامنے آ گیا، اَب دلائل اثبات پر کلام شروع کرتا ہوں، علیہ توکلت وبہ استعین۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ ہونے کی پہلی دلیل

ایک عامۃ الورود واقعہ میں تمام صحابہ کا سکوت دلیل ہے کہ حضور کا سایہ تھا۔
(ملخص از مکتوب میرزا ریاض احمد صاحب لاہوری، بحوالہ تجلی دیوبند)

جائزہ

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کی دلیل قرآن وحدیث کی وہ نصوص ہیں جن سے حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال نورانیت اور لطافت ثابت ہوتی ہے، ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمانی نور سے دیواریں روشن ہو جاتی تھیں، تو جب ان آیتوں کی تلاوت شب و روز صحابہ کرام کرتے تھے اور ان حدیثوں کو روایت کرنے والے بھی صحابہ کرام ہی ہیں تو اَب ان کا سکوت کہاں رہا؟ ذرا غور فرمائیے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حسّی حقیقی نورانیت کے قائل ہیں اور حسّی حقیقی نورانیت کے لئے سایہ نہ ہونا لازم ہے تو جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نورِ حسّی حقیقی کہا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس سے سایہ کی نفی کی، یاد رکھئے لوازم بیّنہ محتاجِ بیان نہیں ہوا کرتے، ملزوم کا ذکر ہی لازم کا ذکر ہوتا ہے، اگر میں کہوں کہ سورج نکل آیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے وجودِ نہار سے سکوت اختیار کیا یا میں نے کسی کو بنی آدم کہا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں کہ میں اس کے انسان ہونے سے ساکت ہوں، کسی کو صالح کہنا اس کے مومن ہونے سے سکوت اختیار کرنا نہیں بلکہ اس کے ایمان کا اقرار ہے، دیکھئے قرآن وحدیث میں کہیں نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے نہ کسی صحابی نے اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود کہا، اَب اگر کوئی سادہ لوح یہ کہہ دے کہ قرآن وحدیث اور تمام صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود

ہونے سے ساکت ہیں تو یہ اس کی نادانی ہوگی کیونکہ جب قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کو سبحان کہا گیا اور تمام صحابہ اللہ تعالیٰ کی سبحانیت کے قائل ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا اقرار کر رہے ہیں کیونکہ سبحان کے لئے واجب الوجود ہونا لازم ہے، بس اسی طرح حضور ﷺ کے نور حقیقی ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ کے لئے سایہ نہ ہونا لازم ہے، اور ملزوم کا اقرار لازم کا اقرار ہوتا ہے، اس لئے صحابہ کرام کو اس مسئلہ میں ساکت کہنا صحیح نہیں۔

رہا یہ امر کہ حضور ﷺ کو بے سایہ دیکھ کر کافر ایمان کیوں نہ لائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لانے والے نہ تھے وہ اس سے بھی بڑے عظیم وجلیل معجزات دیکھ کر ایمان نہیں لائے، کسی کے ایمان نہ لانے سے حضور ﷺ کے کسی کمال یا معجزہ کی نفی نہیں ہو سکتی۔

لوگوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ نہ ہونے پر تعجب ہے اور میں عرض کروں گا کہ حضور ﷺ کی نورانیت ثابت ہو جانے کے بعد حضور کا سایہ تعجب کی بات ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ کثیف چیز کا سایہ ہرگز تعجب کا باعث نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی لطیف نورانی چیز کا سایہ پڑنے لگے تو ہر شخص کو تعجب ہوگا، جب حضور نبی کریم ﷺ کی نورانیت ولطافت اظہر من الشمس تھی تو اَب سایہ نہ ہونے پر کیا تعجب رہا؟

اس کے بعد اتنی بات اور عرض کر دوں کہ ہمارے پیش کردہ بیس سے زیادہ ائمہ اعلام نے جب حضور ﷺ کے جسم اقدس سے سایہ کی نفی کر دی تو اس کے بعد تمام علمائے اُمت کا سکوت اس امر کی روشن دلیل ہے کہ یہ مسلک حق ہے اور جو استشہاد اس بارے میں کیا گیا ہے صحیح ہے ورنہ ایک غلط استدلال اور باطل عقیدہ کے سامنے آجانے کے بعد کسی اہل حق کے لئے سکوت جائز نہیں ہو سکتا۔

ثبوتِ ظل کی احادیث

اَب ان احادیث پر کلام کرتا ہوں جنہیں مخالفین نے حضور ﷺ کے جسمانی سایہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے، وہ تین حدیثیں ہیں جو ناظرین کرام اس مضمون کے شروع میں پڑھ چکے ہیں، ان میں ایک حدیث مسند امام احمد کی ہے اور دوسری مجمع الزوائد کی، یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ کے بیان میں وارد ہیں، وہ واقعہ ناظرین کرام کے سامنے آچکا ہے جو اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت اثناء سفر میں اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اونٹ بیمار ہوگیا، اُم المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ضرورت سے زائد اونٹ تھا، حضور ﷺ نے حضرت زینب سے فرمایا کہ تم ایک اونٹ صفیہ کو دے دو، انہوں نے کہا حضور! اس یہودیہ کو میں اپنا اونٹ دے دوں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بات پر حضرت زینب سے ناراض ہو گئے اور ان سے بات چیت چھوڑ دی، یہ واقعہ حجۃ الوداع سے واپسی کے موقعہ پر سفر میں ذی الحجہ کے آخری دنوں میں پیش آیا تھا وہ باقی ایام سب اسی حالت میں گزرے حتیٰ کہ ماہ محرم اور ماہ صفر اور اس کے بعد ربیع الاوّل شریف کے چند دن بھی اسی ناراضگی کے حال میں بسر ہوئے، حضرت زینب فرماتی ہیں میں نے سمجھا کہ حضور ﷺ کو اَب میری کوئی حاجت نہیں رہی، اس لئے میں نے اپنا بستر اور چارپائی وغیرہ سامان اُٹھا دیا، اسی اثناء میں میں ایک دن بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ٹھیک نصف النہار کے وقت مَیں نے حضور ﷺ کے ظل مبارک کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

مخالفین کے مبلغ علم پر حیرت ہوتی ہے کہ انہیں جہاں لفظ ظل نظر آیا فوراً اس کے معنی جسم کے تاریک سایہ کے سمجھ لئے، ایسی ذہنیت والوں سے تعجب نہیں کہ وہ حدیث مبارک سبعة يظلهم الله بظله (سات آدمی ایسے ہوں گے جن پر

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنا سایہ ڈالے گا) اور اسی طرح دوسری حدیث یوم لا ظل الاظلہ (قیامت کے دن اللہ کے سایہ کے سوا کسی کا سایہ نہ ہوگا) پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے لئے بھی جسمانی تاریک سایہ ثابت کردیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

سابقاً عرض کرچکا ہوں کہ مسند امام احمد اور مجمع الزوائد کی دونوں کتابوں میں یہی ایک واقعہ مروی ہے، حادی الارواح کی حدیث کا جواب ان شاء اللہ آخر میں پیش کروں گا، پہلے اسی واقعہ کی دونوں حدیثوں کا جواب عرض کرتا ہوں جس کے چار مقدمے ہیں، ان شاء اللہ ترتیب وار ہر مقدمہ کے دلائل لکھوں گا، جنہیں پڑھ کر ناظرین کرام پر واضح ہو جائے گا کہ مخالفین کا استدلال اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ سے بھی گیا گزرا ہے۔

امر اوّل

"ظل" کے معنی کا بیان اور اس بات کا ثبوت کہ لفظ "ظل" لغتِ عرب میں "شخص" اور "جسم" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

امر دوم

ظل اور فئی کے معنی میں فرق ہے۔

امر سوم

جس دن حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ٹھیک نصف النہار (دوپہر) کے وقت حضور ﷺ کے ظل کریم کو دیکھا تھا وہ دن گرمی کے موسم میں تھا۔

امر چہارم

موسم گرما میں نصف النہار کے وقت ظل اور فئی کا وجود نہیں ہوتا۔

امر اوّل

ظل کے معنی کا بیان اور "ظل" بمعنی شخص اور جسم کا ثبوت

۱۔ منتہی الارب لفظ ظل کے تحت فرماتے ہیں:

(۱) راحت (۲) ونعمت وخیال کہ از دیو و پری وجز آں پیدا شد۔ (۳) واسپ مسلمہ بن عبدالملک (۴) وارجمندی (۵) واستواری، (۶) وریشہ (۷) وپرزۂ جامہ (۸) وشب (۹) یا بہرہ از شب، (۱۰) وکالبد (۱۱) وشخص ہر چیزے (۱۲) یا پوشش آں، (۱۳) واوّل جوانی۔ (منتہی الارب، جلد ۳، ص ۷۸)

۲۔ اسی طرح تاج اللغت میں لفظ ظل کے معنی بیان کرتے ہوئے ارقام فرمایا

ونیز خیالے کہ (۱) دیدہ میشود از جن وجز آں، و (۲) نام اسپ مسلمہ بن عبدالملک و (۳) عزت و (۴) غلبہ و (۵) ریشہ و (۶) تار جامہ کہ از دوختن دو طرف جامہ ظاہر شود زمخشری گوید ھذا ثوبٌ مالہٗ ظل۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ظل کل شئ (۷) شخص آں چیز یا (۸) پردۂ آں۔ انتہیٰ۔ (تاج اللغة، فصل الزاء)

۳۔ القاموس المحیط میں ہے:

الظل، بالكسر: نقيض الضح، أو الفيء، أو بالغداة، والفيء بالعشي، جمع ظلال وظلول وأظلال، والجنة۔ ومنه: (وَلَا الظِلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ)، والخيال من الجن وغيره يرىٰ، وفرس مسلمة بن عبد الملك، والعز والمنعة، والزئبرُ، والليل او جنحه، ومن كل شيء، شخصه، او كنه، ومن الشباب اوله، ومن القيظ شدته، ومن السحاب ما وراى الشمس منه، أوسواده، ومن النهار لونه اذا غلبته الشمس، وهو في ظله: كنفه۔ انتهى۔

(القاموس المحیط، جلد رابع، ص ۲، فصل الزاء، مطبوعہ فتح الکریم بمبئی)[۱]

ترجمہ۔ ظل بالکسر روشنی کی نقیض ہے یا ظل بمعنی فئ (سایہ) ہے یا ظل صبح کو ہوتا ہے اور فئ شام کو ہوتا ہے، جمع ظلال، ظلول اور اظلال ہے اور ظلِ جنت کو بھی ظل کہتے ہیں اور اسی سے ہے وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ اور ظل جن وغیرہ کے خیال کو بھی کہتے ہیں اور مسلمہ بن عبدالملک کے گھوڑے کو بھی ظل کہتے ہیں، ظل کے معنی عزت بھی ہیں اور ظل کے معنی قوت اور غلبہ کے بھی ہیں اور ظل کپڑے کے تاگے کو بھی کہتے ہیں جو سینے کی وجہ سے دونوں طرف نظر آتا ہے، ظل کے معنی رات بھی ہیں اور ظل رات کی تاریکی کو بھی کہتے ہیں اور ہر چیز کے شخص اور بدن کو بھی ظل کہا جاتا ہے، یا کسی شئے کے پردے اور لباس کو بھی ظل کہتے ہیں، اوّل جوانی کو بھی ظل کہا جاتا ہے اور گرمی کی شدت کو بھی ظل کہتے ہیں اور بادل کے اس حصے کو بھی ظل کہتے ہیں جو سورج کو ڈھانک لے، اور بادل کی سیاہی کو بھی ظل کہا جاتا ہے اور دن کے رنگ کو بھی ظل کہتے ہیں جب سورج اس پر غالب ہو جائے، عرب کا محاورہ ہے وھو فی ظلہ اِس کے معنی ہیں فی کنفہ یعنی وہ فلاں شخص کے ظل میں ہے، اس کی پناہ اور حفاظت میں ہے۔ انتہیٰ۔

۴۔ اسی طرح اقرب الموارد میں بھی تمام معانی مرقومہ بالا لکھے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے ومن کل شیءٍ شخصہ ہر چیز کے شخص اور بدن کو بھی ظل کہتے ہیں۔ (اقرب الموارد، جلد دوم، ص ۷۳۱)

۵۔ مجمع بحار الانوار میں علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ ص ۳۳۳ پر ظل

---

[۱] (طبع موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۲۸)

کے معنی جسم لکھ کر اس کے آگے ص ۳۳۴ پر فرماتے ہیں وظلالھم شخوصھم یعنی ان کے ظلال سے ان کے اشخاص یعنی اجسام مراد ہیں۔

(مجمع بحار الانوار، جلد ۲، ص ۳۳۳، ۳۳۴، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ)

ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا کہ کتب لغت میں ظل بمعنی سایہ ہی نہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے معنی ہیں اور ان معانی میں ظل بمعنی شخص بھی وارد ہے، یعنی شخص اور جسم کو بھی لغت عرب میں ظل کہا جاتا ہے اور ان معنی کی تائید میں بعض مفسرین کی عبارات بھی ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں، دیکھئے تفسیر مظہری میں ہے۔

"ویمکن ان یقال المراد بمن فی السمٰوات والارض حقائق من فیہا وارواح الملئکۃ والمؤمنین وبظلا لھم اشخاصھم وقوالبھم کما عبر رسول اللہ ﷺ فی دعائہ الظاھر بالسواد والباطن بالخیال حیث قال فی سجودہٖ سجد لك سوادی وخیالی وھذا التاویل اولیٰ مما سبق لان الظلال التی یری فی ضح الشمس عبارۃ عن سواد موضع لم یصل الیہ ضوء الشمس لحجاب جثۃ الشئ وذٰلك امر عدمی لا وجود لھا فکیف یسند الیہ السجود"۔

(تفسیر مظہری، جلد ۵، پارہ ۱۳، سورہ رعد، ص ۱۷)[1]

ترجمہ۔ اور ممکن ہے کہ کہا جائے کہ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے وہ حقائق مراد ہیں جو آسمانوں اور زمینوں میں پائے جاتے ہیں اور فرشتوں اور مومنین کی روحیں، اور ان کے ظلال سے ان کے

[1] (تفسیر مظہری، جلد ۵، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ص ۲۲۷ (خلیل رانا)

اشخاص اور قوالب مراد ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دُعا میں ظاہر کو سواد اور باطن کو خیال سے تعبیر فرمایا، چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سجدے میں یہ الفاظ فرمائے سجد لك سوادی وخیالی (اے اللہ تیرے لئے میرے سواد اور خیال (ظاہر و باطن) نے سجدہ کیا) اور یہ تاویل یعنی ظلال سے اشخاص اور قوالب مراد لینا پہلی تاویل سے اولیٰ ہے، اس لئے کہ وہ سائے جو سورج کی روشنی میں نظر آتے ہیں وہ عبارت ہیں اس جگہ کی سیاہی سے جہاں کسی جسم کثیف کے حاجب ہونے کی وجہ سے سورج کی روشنی نہیں پہنچتی اور ظاہر ہے کہ یہ سیاہی جسے ہم ظل کہہ رہے ہیں محض ایک امر عدمی ہے جس کے لئے کوئی وجود نہیں، تو ایسی صورت میں اس کی طرف سجدے کی اسناد کیونکر صحیح ہوگی۔ انتہیٰ۔ (تفسیر مظہری)

دیکھئے صاحبِ تفسیر مظہری نے صاف اور واضح لفظوں میں ظل کے معنی شخص اور قالب کے بیان کئے ہیں۔

اسی طرح تفسیر معالم التنزیل میں ہے:

۲۔ وقیل ظلالهم ای اشخاصهم یعنی آیت قرآنیہ یتفیّؤا ظلالہ میں ان کے اجسام مراد ہیں، اور یہاں ظل بمعنی سایہ نہیں بلکہ بمعنی شخص اور بدن ہے۔ انتہیٰ۔

(تفسیر معالم التنزیل، پ ۲۳، ص ۱۱)

یہی مضمون تفسیر روح المعانی میں ہے، صاحبِ تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں:

۳۔ ومن الناس من فسر الظلال فی قراءة العامة

بالاشخاص لتکون علیٰ نحو قراءۃ عیسیٰ وانشدوا
لاستعمال الظلال فی ذٰلك قول عبدۃ

اذا نزلنا نصبنا ظل اخبیة
ونار للقوم باللحم المراجیل

فانه انما تنصب الاخبیة لا الظل الذی هو الفیء وقول
الاخر، یتبع افیاء الظلال عشیة فانه ارادافیاء
الاشخاص۔انتہیٰ۔

ترجمہ۔ اور عامہ قراء کی قرأت میں جو لفظ ظلال آیا ہے بعض لوگوں نے اس کی تفسیر اشخاص کے ساتھ کی ہے تاکہ یہ قرأت عیسیٰ کی قرأت کے موافق ہوجائے، اور انہوں نے ظلال بمعنی اشخاص کی تائید میں عبدۃ کا یہ قول پیش کیا ہے۔

جب ہم اُترے تو ہم نے خیموں کے ظل یعنی خیموں کے اشخاص واجسام کو نصب کیا، اور قوم کے لئے گوشت کی ہانڈیاں پکنے لگیں۔

وجہ استشہاد یہ ہے کہ جو چیز نصب کی جاتی ہے وہ خیمے ہوتے ہیں، ان کا ظل جسے سایہ کہتے ہیں نصب نہیں کیا جاتا، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہاں ظل بمعنی شخص پر انہوں نے استدلال کیا اور وہ قول یہ ہے۔ وہ پیچھے آتا ہے افیاء ظلال کے شام کے وقت، افیاء فیٔ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سایہ، اَب اگر ظلال کے معنی بھی سایہ ہوں تو سایہ سائے کی طرف مضاف ہوجائے گا جو درست نہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہاں ظلال بمعنی اشخاص ہے اور مصرعہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ شام کے وقت اشخاص واجسام کے سایوں کے پیچھے آتا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ آیت کریمہ میں ظلال بمعنی اشخاص ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

صاحب روح المعانی نے اس مقام پر امام راغب اصفہانی کا تعاقب نقل کیا ہے لہٰذا یہ استدلال مجروح ہے۔

جواباً عرض کروں گا کہ نظر صحیح سے کام لیا جائے تو امام راغب اصفہانی کا تعاقب صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے رَفَعْنَا ظِلَّ اَخبیۃٍ کے معنی کئے ہیں رفعنا الاخبیۃ فرفعنا بہ ظلھا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ ظل حشوِ محض ہے اور بالکل بے فائدہ ہو کر رہ جاتا ہے، جو تاویل فسادِ کلام کا موجب ہو وہ خود فاسد ہے اس لئے یہ تعاقب درست نہیں، علیٰ ہذا القیاس دوسرے قول میں وہ خاص کی اضافت عام کی طرف بتا رہے ہیں، اہل علم سے مخفی نہیں کہ اضافت کا فائدہ تخصیص وتعریف مضاف ہے یا تخفیف لفظی، اس اضافت میں تخفیف لفظی تو متصور ہی نہیں، رہی تخصیص تو وہ تحصیل حاصل ہوگی اس لئے کہ مضاف اضافت سے پہلے ہی خاص ہے لہٰذا اضافت بے فائدہ رہی اور یہ بھی فساد کلام ہے، معلوم ہوا کہ امام راغب اصفہانی کا تعاقب صحیح نہیں اور دونوں قولوں میں ظل بمعنی شخص ہی مستعمل ہے جس کی تائید تفسیر مظہری، تفسیر معالم التنزیل، مجمع بحار الانوار اور لغت کی معتبر کتابوں سے ہوتی ہے، جن کی روشن اور واضح عبارات ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

امر دوم ظل اور فئ کے معنی میں فرق ہے

مصباح المنیر میں ہے:

(الظل) قال ابن قتیبه یذهب الناس الی ان الظل والفیء بمعنی واحد ولیس کذلك بل الظل یکون غدوة وعشیة والفیء لا یکون الا بعد الزوال فلا یقال لما قبل الزوال

فئ وانما سمی بعد الزوال فیئًا لا نہ ظل فاء من جانب المغرب الیٰ جانب المشرق والفیء الرجوع وقال ابن السکیت الظل من الطلوع الی الزوال والفیء من الزوال الی الغروب وقال ثعلب الظل للشجرۃ وغیرھا بالغداۃ والفیء بالعشی وقال رؤبۃ بن العجاج کل ما کانت علیہ الشمس فزالت عنہ فھو ظل وفیء ومالم یکن علیہ الشمس فھو ظل، ومن ھنا قیل الشمس تنسخ الظل والفیء ینسخ الشمس، وجمع الظل ظلال واظلۃٌ وظللٌ۔

(مصباح المنیر، مطبوعہ مصر، جلد دوم، ص ۳۶۳)

ترجمہ۔ ابن قتیبہ نے کہا کہ بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ظل اور فئ ایک معنی میں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ظل صبح اور شام دونوں وقت ہوتا ہے اور فئ صرف بعد الزوال ہوتا ہے، لہٰذا قبل الزوال سایہ کو فئ نہیں کہا جاتا اور سایہ بعد الزوال کو اس لئے فئ کہا جاتا ہے کہ فئ کے معنی رجوع کے ہیں اور وہ سایہ (جسے فئ کہا جاتا ہے) وہ مشرق سے مغرب کی جانب ہوتا ہے، ابن سکیت کا قول ہے کہ طلوع سے زوال تک جو سایہ ہوتا ہے اسے ظل کہا جاتا ہے اور زوال کے بعد سے غروب تک فئ ہوتا ہے۔ اور ثعلب نے کہا کہ ظل درخت وغیرہ کے اس سایہ کو کہتے ہیں جو دوپہر سے پہلے ہوتا ہے اور فئ اسے کہتے ہیں جو دوپہر کے بعد ہوتا ہے اور رؤبہ بن عجاج نے کہا کہ ہر وہ سایہ جو سورج ڈھلنے کے بعد ہو وہ ظل اور فئ ہے اور جو سورج ڈھلنے سے پہلے ہو وہ ظل ہے اور یہی مبنیٰ ہے اس قول کا کہ سورج ظل

کو منسوخ کر دیتا ہے اور فیٔ سورج کو یعنی اسے خطِ استواء سے زائل

کر دیتا ہے اور ظل کی جمع ظلال اور اظلّہ اور ظلل ہے۔ انتہی۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سایہ قبل الزوال "ظل" ہے اور بعد الزوال "فیء" ہے اور بعض کا قول ہے کہ قبل الزوال "ظل" ہے اور بعد الزوال "ظل" اور "فیٔ" ہے، اور پہلے قول پر "ظل" اور "فیٔ" متبائن ہیں اور دوسرے قول پر "ظل" عام اور "فیٔ" خاص! تباین کا قول اکثر علماء نے کیا ہے، چنانچہ تفسیر خازن ومعالم جلد ۴، ص ۷۷ اور کتاب التعریفات للسید الشریف الجرجانی، مطبوعہ مصر، ص ۷۳ اور جمہرۃ اللغۃ، مطبوعہ دائرۃ المعارف، جلد اوّل حیدر آباد دکن کی عبارات سے واضح ہے۔

امر سوم موسم گرما

ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور ﷺ کی شکر رنجی کا واقعہ حجۃ الوداع سے واپسی کے موقعہ پر اثناء سفر میں پیش آیا تھا، چنانچہ مسند امام احمد میں عفان راوی کا قول جزم کے ساتھ موجود ہے کہ ولا اظنہ الا قال فی حجۃ الوداع۔ (مسند امام احمد، جلد ۶، ص ۱۳۲) اور یہ شکر رنجی ذی الحجہ کے آخری ایام سے لے کر ربیع الاوّل شریف کے چند دنوں تک رہی، جیسا کہ مسند امام احمد اور مجمع الزوائد کی حدیثوں میں اس کی تصریح موجود ہے اور مجمع الزوائد میں بغیر کسی شک کے ایاما من شھر ربیع الاوّل کے الفاظ وارد ہیں، دیکھئے مجمع الزوائد، جلد چہارم، طبع قاہرہ، ص ۳۲۳ (ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور، شمارہ ۸ جنوری، ۱۹۶۰ء ص ۴) از مکتوب مولانا ابوداؤد محمد صادق صاحب گوجرانوالہ۔

بالآخر ایک دن حضرت زینب نے نصف النہار کے وقت حضور ﷺ کے ظل کریم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو یہ دن یقیناً ربیع الاوّل ہی کے دنوں میں

سے ہے اور کسی پڑھے لکھے مسلمان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں ہوا، اور ۱۱ھ میں ۱۲ ربیع الاوّل شریف مطابق ۱۱ جون کو حضور ﷺ کی وفات ہوئی، دیکھئے رحمۃ للعلمین مؤلفہ قاضی سلیمان منصور پوری، جلد ۲، ص ۷۲ اور تاریخ اسلام مؤلفہ شوق امرتسری، ص ۳۲۱۔

"حضور ﷺ کی وفات حسرت آیات ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ بروز دو شنبہ مطابق ۱۱ جون ۶۳۲ء بوقت چاشت واقع ہوئی، اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس اور پانچ یوم کی تھی"۔

(تاریخ اسلام، ص ۳۲۱۔ رحمۃ للعلمین جلد ۲، ص ۷۲)

اس حساب سے ثابت ہوگیا کہ جس دن حضرت زینب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظل کریم کو دیکھنے کا واقعہ بیان فرمارہی ہیں وہ جون کے مہینہ کا دن تھا جو خاص گرمی کا موسم ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر اس مقام پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ علامہ شبلی نعمانی کے بیان سے حضور ﷺ کی تاریخ وصال یکم ربیع الاوّل مطابق ۳۱ مئی ظاہر ہوتی ہے تو میں جواباً عرض کروں گا کہ اوّل تو ۳۱ مئی بھی گرمی کا زمانہ ہے دوسرے یہ کہ اس قول پر مخالفین کی پیش کردہ دونوں حدیثیں ساقط الاعتبار ہو جائیں گی کیونکہ جب یکم ربیع الاوّل کو حضور ﷺ کا وصال ہوگیا تو اسی ماہ ربیع الاوّل کے چند دنوں تک شکر رنجی باقی رہنا اور اس کے بعد ایک دن حضرت زینب کا ظل رسول کو دیکھنا سب کچھ غلط ہو جائے گا، لہٰذا علامہ شبلی کا قول کسی طرح پیش کردہ حدیثوں کے مطابق نہیں ہوسکتا، اگر شبلی کے قول کو مانا جائے تو حدیثوں کو چھوڑنا پڑے گا اور حدیثوں کو تسلیم کیا جائے تو شبلی صاحب کے قول سے کنارہ کشی کرنا ہوگی۔

امر چہارم

موسم گرما میں دوپہر کو سایہ نہیں ہوتا

گرمی کے زمانہ میں دوپہر کے وقت کسی جانب کو انسان کا جھکا ہوا سایہ نہ ہونا ایسا روشن اور ظاہر امر ہے جس پر کسی دلیل کی حاجت نہیں لیکن اس کے باوجود آخری اتمام حجت کے لئے ہم اپنے اس بیّن دعویٰ پر بھی دلیل قائم کئے دیتے ہیں تاکہ منکرین کے لئے کوئی عذر باردباقی نہ رہے، دیکھئے منجد میں ہے :

۱۔ ومشیت علی ظلی او انتعلت فی ظلی ای مشیت وقد انتصف النهار فلم یکن لی ظل۔

(المنجد، طبع قاہرہ، ص۴۹۹)

ترجمہ۔ "مشیت علیٰ ظلی" اور "انتعلت فی ظلی" کے معنی ہیں کہ میں چلا اس حال میں کہ نصف النہار کا وقت ہو گیا تھا، اس لئے میرا سایہ نہیں تھا۔

۲۔ مصباح اللغات میں ہے :

"ومشیت علی ظلی او انتعلت ظلی"

(مصباح اللغات، ص۵۰۱)

ترجمہ۔ میں چلا اس حال میں کہ دوپہر ہو چکی تھی اس لئے میرا سایہ نہ تھا۔

۳۔ اقرب الموارد میں ہے:

"(مشیت علی ظلی وانتعلت ظلی) اذا مشیت وقد انتصف النهار فی القیظ فلم یکن لی ظل"

(اقرب الموارد، جلد ۲، ص ۱۳۱۷، طبع قاہرہ)

ترجمہ۔ "مشیت علی ظلی" اور "انتعلت فی ظلی" اس وقت

کہا جاتا ہے جب کوئی شخص موسم گرما میں دوپہر کے وقت چلے تو کہتا ہے کہ چونکہ میں دوپہر کے وقت چلا اس لئے میرا سایہ نہ تھا۔ انتہیٰ

۴۔ کرمانی شرح بخاری میں ہے :

"قائم الظهيرة اى نصف النهار وهو استواء حالة الشمس وسمى قائما لان الظل لا يظهر حينئذٍ فكانّهٗ قائم واقف"۔

(کرمانی حاشیہ ۱۲ بخاری، جلد اوّل، ص ۳۱۰، مطبوعہ اصح المطابع)

ترجمہ۔ قائم الظہیرہ نصف النہار کو کہتے ہیں اور وہ سورج کے خطِ استواء پر ہونے کی حالت ہے دوپہر کو قائم اس لئے کہتے ہیں کہ اس وقت سایہ ظاہر نہیں ہوتا، تو گویا وہ ایک جگہ کھڑا اور ٹھہرا ہوا ہے۔ انتہیٰ۔

ناظرین کرام بیان سابق میں پڑھ چکے ہیں کہ سایہ دو قسم کا ہے، ایک ظل اور دوسرا فئ، ظل وہ سایہ ہے جو اوّل نہار میں قبل الزوال ہوتا ہے اور فئ وہ سایہ ہے جو بعد الزوال غروب تک رہتا ہے۔

نصف النہار کا وقت چونکہ درمیان میں ہوتا ہے اس لئے اس وقت نہ ظل ہوتا ہے نہ فئ بلکہ چلنے والے کا سایہ اس وقت اس کے پاؤں میں ہوتا ہے، جسے وہ پامال کرتا ہوا چلتا ہے اور گرمی کے دنوں میں کسی جانب جھکے ہوئے سائے کا وجود نہیں ہوتا، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی آنے والے کے جسم سے پہلے اس کا سایہ نظر آجائے۔

ایسی صورت میں ماہنامہ تجلی، دیوبند کا یہ لکھنا کہ اُم المومنین فرماتی ہیں:

"پس ایک دن دوپہر کے وقت دفعۃً رسول اللہ تشریف لے آئے اور میں نے پہلے ان کا سایہ ہی دیکھا"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، شمارہ بابت فروری، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۸، کالم ۲ کے نیچے)

ازمکتوب میرزا ریاض احمد صاحب حافظ آبادی۔

قطعاً غلط اور باطل محض ہے، بلکہ اس واقعہ کی دونوں روایتوں میں لفظ ظل بمعنی شخص ہے جیسا کہ ہم کتب لغت وتفاسیر سے ابھی وہ عبارات نقل کر چکے ہیں، اور اُم المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس قول کے معنی یہ ہیں کہ "میں ایک دن دوپہر کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ ناگہاں میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مقدسہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا"۔

الحمد للہ! مسند امام احمد اور مجمع الزوائد کی دونوں حدیثوں پر کلام ختم ہوا اور دلائل کی روشنی میں حق واضح ہو گیا، اہل علم منصف مزاج حضرات سے اُمید ہے کہ وہ ہماری اس تحقیق اور محنت کی قدر کریں گے، اور جن کے دلوں میں زیغ ہے ان سے انصاف کی کوئی اُمید نہیں، حق واضح کر دینا ہمارا فرض تھا جس سے ہم سبکدوش ہو گئے۔

وللہ الحجۃ السامیہ۔

تیسری حدیث "ظلی وظلکم"

اس کے بعد تیسری حدیث پر کلام کرتا ہوں جو علامہ ابن قیم کی حادی الارواح سے مخالفین نے حضور ﷺ کا تاریک سایہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے، حدیث اور اس کا ترجمہ ابتدائے بیان میں ہم واضح طور پر لکھ چکے ہیں، اعادہ کی حاجت نہیں۔

علامہ ابن قیم نے یہ حدیث حضور ﷺ کا سایہ ثابت کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ دوزخ وجنت کا وجود ثابت کرنے کے لئے ارقام فرمائی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ دوزخ وجنت پیدا ہو چکی ہیں جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی اس دیوار پر جو قبلہ کی جانب واقع ہوئی ہے فجر کی نماز میں

جنت اور دوزخ دونوں کو دیکھا، صرف یہی نہیں بلکہ ان کی اشیاء اور جنتیوں اور دوزخیوں کو بھی ملاحظہ فرمایا، طبرانی میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا!

"مارأيتم من شيء في الدنيا له لون ولا نبئتم به في الجنة ولا في النار الا لقد صور لي من قبل هذا الجدار منذ صليت لكم صلوتي هذه فنظرت اليه مصورا في جدار المسجد" ۔انتہی۔

(کنز العمال، جلد ۴، ص ۱۷۸)

ترجمہ۔ تم نے دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس کا کوئی رنگ ہو اور نہ تمہیں جنت و دوزخ میں کسی چیز کے ہونے کی خبر دی گئی لیکن وہ سب چیزیں اور تمام دوزخی اور جنتی سب اس دیوار قبلہ کی سمت میں ظاہر کر دیئے گئے جس وقت سے میں نے تمہیں اپنی یہ نماز پڑھائی ہے تو میں نے ہر چیز کی صورت دیوارِ مسجد میں دیکھ لی۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ و جنت کی ہر چیز کو دیکھ لیا تو اپنے آپ کو اور صحابہ کرام کو بھی یقیناً دیکھا، کیونکہ حضور اور آپ کے صحابہ کرام بھی تو جنتی ہیں، معلوم ہوا کہ یہاں بھی ظل کے معنی جسم کے تاریک سایہ کے نہیں بلکہ وہی "شخص" اور جسم کے معنی ہیں جو ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں، اور رأیت ظلی وظلکم کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو اور تم سب کو دیکھا اور یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ دنیا میں ہوتے ہوئے جنت میں کیسے موجود تھے؟ دیکھئے شب معراج جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے آسمان پر پہنچے اور آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان کے دائیں بائیں ان کی نیک اور بد اولاد کو دیکھا تو نیکوں میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے

آپ کو بھی دیکھا، امام شعرانی فرماتے ہیں :

"ورأی رسول الله ﷺ صورته هناك فی اشخاص السعداء فشکر الله تعالیٰ وعلم عند ذلك کیف یکون الانسان فی مکانین"۔

(الیواقیت والجواہر، جلد ۲، ص ۳۴، مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ حضور ﷺ نے نیکوں کی ذاتوں میں اپنی صورت مبارکہ بھی دیکھی اور اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا اور اس وقت حضور ﷺ نے عین الیقین کے ساتھ جان لیا کہ ایک انسان کس طرح دو جگہوں میں ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان اوّل پر اشخاص سعداء سے باہر بھی تھے اور ان کے اندر بھی اپنے آپ کو ملاحظہ فرمارہے تھے، اسی طرح اس موقعہ پر بھی حضور اور آپ کے صحابہ جنت سے باہر بھی تھے اور جنت میں بھی حضور اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو دیکھ رہے تھے۔

معلوم ہوا کہ "ظلی وظلکم" سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام کا جسمانی سایہ مراد نہیں بلکہ ذوات قدسیہ مراد ہیں اور حدیث کے معنی وہی ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ میں نے جنت میں اپنے آپ کو بھی دیکھا اور تمہیں بھی دیکھا۔

مخالفین کی بے بصری پر حیرت

کمالاتِ رسالت کے منکرین کی بے بصری موجب حیرت ہے، ان لوگوں نے ظلی وظلکم کی حدیث سے حضور ﷺ کا جسمانی سایہ ثابت کرتے وقت اتنی بات بھی نہ سوچی کہ اگر اس حدیث سے حضور کا سایہ ثابت ہوا تو یا مسجد نبوی میں ہوگا یا دوزخ میں یا جنت میں، کیونکہ یہ واقعہ عین نماز فجر کا ہے جس وقت حضور اور صحابہ کرام

مسجد نبوی میں تھے، ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ تینوں جگہوں میں سے ایک جگہ پر بھی اس وقت سایہ کا وجود ممکن نہ تھا، کیونکہ نماز فجر کا وقت آخر شب کی ہلکی سیاہی کا وقت ہوتا ہے، اس وقت کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا، اور جنت میں بھی کسی جنتی کا سایہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ جنت میں ہر وقت ایسا سایہ رہتا ہے جیسے طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت میں سایہ ہوتا ہے اور سایہ میں کسی کا سایہ نظر نہیں آتا، اس لئے جنت میں بھی سایہ دیکھنا متصور نہیں۔ اَب تیسری جگہ دوزخ ہے، تو مجھے اُمید نہیں کہ مخالفین دوزخ میں حضور کا سایہ مانتے ہوں اور اگر خلاف اُمید ان کا مسلک فی الواقع یہی ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سایہ ہمیشہ روشنی میں ہوتا ہے اور دوزخ کی آگ دنیاوی آگ کی طرح روشن نہیں بلکہ وہ سیاہ اور تاریک ہے، دیکھئے ترمذی، جلد ۲، ص ۸۳، مشکوٰۃ، جلد ۲، ص ۵۰۳۔

اور ظاہر ہے کہ سیاہی اور تاریکی میں سایہ نہیں ہوتا، اَب مخالفین بتائیں کہ حتی رأیت ظلی وظلکم کے معنی جو آپ کرتے ہیں کہ "میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا" یہ معنی کیسے درست ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ میرا یہ بیان محتاج دلیل نہیں لیکن ہر قسم کا تردّد زائل کرنے کے لئے دلائل پیش کرتا ہوں، اور ساتھ ہی بعض شکوک وشبہات کے جوابات بھی عرض کروں گا تاکہ اتمام حجت کا حق ادا ہو جائے۔

دنیا والوں کے عرف میں سایہ اِسے کہتے ہیں جو سورج کی گرمی اور تکلیف سے بچائے لیکن جنت کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے

لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا۔ (الدھر)

نہ اس میں سورج کی گرمی معلوم ہو گی نہ زمہریر کی سردی۔

جب وہاں سورج کی گرمی اور اس کی تکلیف واذیت نہیں تو اس سے بچنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جس کے لئے سایہ کی ضرورت ہو۔

ہاں! البتہ اس میں ایسا سایہ ضرور ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے، جس میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ نظر نہیں آتا، دیکھئے سورۂ واقعہ میں "وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ" یعنی جنتی جنت میں ایسے سایہ میں ہوں گے جو ہر طرف پھیلا ہوا، دائم اور غیر منقطع ہوگا،، تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت ہے :

(وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) ممتد منبسط کظل مابین طلوع الفجر وطلوع الشمس۔ انتہیٰ۔

(تفسیر مدارک، جلد ۴، ص ۱۶۳، مطبوعہ مصر)

یعنی جنتی جنت کے ایسے سایہ میں ہوں گے جو لمبا اور ہر طرف پھیلا ہوا ہوگا، جیسے صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت میں طویل، ہلکا اور چاروں طرف پھیلا ہوا خوشگوار سایہ ہوتا ہے۔

تفسیر نیشاپوری میں ہے:

"(وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) ای ممتد منبسط کظل الطلوع والغروب لا یتقلص ویحتمل ان یراد انہ دائم باق لا یزول ولا تنسخہ الشمس والعرب تقول لکل شیء طویل لا ینقطع انہ ممدود"۔ انتہیٰ۔

(تفسیر نیشاپوری، پ ۲۷، ص ۸۹، مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ اور ظِل مَمدُود سے مراد یہ ہے کہ جنت کا سایہ دراز اور ہر طرف پھیلا ہوا ہوگا جیسے طلوع اور غروب کے وقت ہر طرف پھیلا ہوا ہلکا، دراز اور خوشگوار سایہ ہوتا ہے، وہ سایہ ایسا ہوگا کہ نہ سمٹے گا نہ سکڑے گا اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ "ظِل مَمدُود" سے یہ مراد

لیا جائے کہ جنت کا سایہ ایسا دائم و باقی ہے جو کبھی زائل نہ ہو، اور سورج بھی اسے منسوخ نہ کرے گا (کیونکہ وہاں سورج کا وجود ہی نہ ہوگا) اور اہل عرب ہر ایسی طویل چیز کو ممدود کہتے ہیں جو کبھی منقطع نہ ہو۔ انتہیٰ۔

قرآن کریم کی ان دونوں آیتوں اور مفسرین کی تصریحات کی روشنی میں ثابت ہوگیا کہ جنت میں ہر طرف طویل و دائم اور غیر منقطع سایہ پھیلا ہوا ہے اور سایہ کی جگہ میں کسی کا سایہ نظر نہیں آتا، لہٰذا اچھی طرح واضح ہوگیا کہ "رأیت ظلی وظلکم" کے یہ معنی ہرگز درست نہیں ہوسکتے کہ "میں نے (جنت میں) اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا"۔

ایک اشکال اور اس کا حل

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب نہایت ضروری ہے، وہ یہ کہ قرآن وحدیث میں کئی جگہ جنت کے درختوں کا سایہ مذکور ہے اگر سایہ کی جگہ کسی چیز کا سایہ نہیں ہوسکتا تو جنت میں وہاں کے درختوں کا سایہ کیسے ہوگا؟

اس کا جواب امام فخر الدین رازی، علامہ ابوسعود اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے دیا ہے جو ان ہی کی عبارات میں ہم نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں آیۂ مبارکہ "وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا" کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

"(السوال الثانی) الظل انما یوجد حیث توجد الشمس فان کان لا شمس فی الجنة فکیف یحصل الظل هناك (والجواب) المراد ان اشجار الجنة تکون بحیث لو کان هناك شمس لکانت تلك الاشجار مظللة منها" ۔انتہیٰ

(تفسیر کبیر، جلد ۸، ص ۳۹۶، مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ آیت میں دوسرا سوال یہ ہے کہ سایہ وہیں پایا جاتا ہے جہاں سورج ہو، جنت میں جب سورج نہیں تو درختوں کا سایہ کیسے ہوگا؟ (الجواب) مراد یہ ہے کہ جنت کے درخت اس حیثیت سے ہوں گے کہ اگر وہاں سورج ہو تو وہ اس کی وجہ سے سایہ دار ہوجائیں۔انتہیٰ۔

۲۔ علامہ ابو سعود اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

"علی معنی انه لو کان هناك شمس موذیة لکانت اشجارها مظللة علیهم مع انه لا شمس ثمة ولا قمر"۔انتہیٰ۔

(تفسیر ابو سعود بہامش کبیر، جلد ۸، ص ۳۹۶، مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ ("جنت کے درختوں کے سائے جنتیوں پر جھکے ہوں گے") یہ کلام اس معنی پر محمول ہے کہ اگر وہاں دھوپ کی تکلیف ہوتو وہ درخت جنتیوں پر اپنے سائے ڈالنے لگیں باوجود اس کے کہ وہاں نہ سورج ہے نہ چاند (جس کی وجہ سے سایہ ہو)۔انتہیٰ۔

۳۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری میں فرماتے ہیں:

"(فی ظلها) ای فی نعیمها وراحتها ومنه قولهم "عیش ظلیل" وقیل معنی ظلها ناحیتها واشار بذلك الی امتدادها ومنه قولهم انا فی ظلك ای ناحیتك قال القرطبی والمحوج الی هذا التاویل ان الظل فی عرف اهل الدنیا ما یقی من حر الشمس واذاها ولیس فی الجنة شمس ولا اذی"۔انتہیٰ۔

ترجمہ۔ (حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، جنت میں ایک درخت ہے جس کے ظل میں کوئی شخص سوار ہو کر سو برس تک چلتا رہے تو اسے قطع نہ کر سکے، اس حدیث میں) "فی ظلھا" کے معنی ہیں فی نعیمھا وراحتھا (یعنی اس کی نعمتوں اور راحتوں میں) اور اسی معنی سے اہل عرب کا یہ قول ماخوذ ہے "عیش ظلیل" (نعمت وراحت کی زندگانی) اور بعض نے کہا کہ یہاں "ظل" بمعنی "ناحیہ" ہے (یعنی گردونواح) حضور ﷺ نے اس کے ساتھ اس درخت کی درازی کی طرف اشارہ فرمایا یعنی وہ درخت اتنا بڑا اور لمبا ہوگا کہ اس کے گردونواح کی مسافت سو برس تک بھی کسی سوار سے طے نہ ہو سکے گی، اور اسی معنی سے اہل عرب کا یہ قول ماخوذ ہے "انا فی ظلك" یعنی میں تیرے گردونواح (قرب وجوار، حفظ وامان) میں ہوں، قرطبی نے کہا اس تاویل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اہل دنیا کے عرف میں ظل وہ ہے جس کے ذریعہ سورج کی گرمی اور اس کی تکلیف سے بچاؤ حاصل کیا جائے، جنت میں نہ سورج ہوگا نہ اس کی تکلیف (اس لئے وہاں اس سے بچاؤ کے لئے کسی چیز کے سایہ کی ضرورت ہی نہیں)۔ انتہی

الحمدللہ! جنت میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ نہ ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہوگیا، اَب ہمارے اس بیان کو بیان سابق سے ملا کر نتیجہ ذہن نشین کر لیجئے کہ حضور ﷺ نے جو "حتیٰ رأیت ظلی وظلکم" فرمایا یہ اس واقعہ کا بیان ہے جو مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں عین نماز فجر کے درمیان پیش آیا تھا، جس میں حضور ﷺ کے سامنے حقیقی جنت ودوزخ کا پیش کیا جانا مذکور ہے، اس وقت حضور اور صحابہ مسجد نبوی میں

تھے اور دوزخ و جنت حضور کے پیش نظر تھے، ظاہر ہے کہ اس وقت حضور ﷺ نے جو چیز دیکھی وہ مسجد نبوی میں ہو گی یا دوزخ میں، یا جنت میں، اس کے علاوہ اور کسی جگہ کچھ دیکھنا متصور نہیں، اگر حضور نے اپنا اور صحابہ کا سایہ مسجد نبوی میں دیکھا تو یہ ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ فجر کا وقت تھا اس وقت کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ اس وقت سایہ ظاہر تھا تو اسے تمام حاضرین دیکھ رہے ہوں گے حالانکہ یہ دیکھنا حضور ﷺ کے لئے خاص تھا جیسا کہ الفاظ حدیث" حتیٰ رأیت ظلی وظلکم " (یہاں تک کہ میں نے اپنا اور تمہارا ظل دیکھا) میں لفظ حتیٰ (یہاں تک) سے ظاہر ہے، کیونکہ حتیٰ بیان غایت کے لئے آتا ہے اور یہ غایت جنت و دوزخ دیکھنے کی ہے جس طرح مُغیا (جنت و دوزخ) کا دیکھنا حضور کے ساتھ خاص ہے اسی طرح اس کی غایت (ظلی وظلکم) کا دیکھنا بھی حضور ﷺ کے ساتھ مختص ہوگا، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ نماز فجر کے وقت کسی کا سایہ نہ تھا اور حضور ﷺ نے اپنا اور صحابہ کا ظل مسجد نبوی میں ہر گز نہیں دیکھا۔

اس کے بعد دو چیزیں رہیں دوزخ اور جنت، بیان سابق میں ہم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ سایہ روشنی میں ظاہر ہوتا ہے اور جہنم سیاہ اور تاریک ہے اس لئے اس میں بھی سایہ ظاہر نہیں ہو سکتا، اَب رہی جنت تو اس کے متعلق بھی ہم نے آیات قرآنیہ و عبارات مفسرین سے ثابت کر دیا کہ جنت میں کسی سایہ دار چیز کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اَب بتائیے کہ اگر ظلی وظلکم میں لفظ ظل کے معنی سایہ ہیں تو وہ حضور ﷺ نے کہاں دیکھا؟ لہٰذا تسلیم کر لیجئے کہ یہاں سایہ کے معنی مراد نہیں بلکہ وہی "شخص" کے معنی مراد ہیں جو اس سے قبل دلائل و براہین کی روشنی میں ہم ثابت کر چکے ہیں اور حدیث کے واضح معنی یہ ہیں کہ میں نے دوزخ و جنت کو دیکھا یہاں تک کہ (جنت میں) اپنے اور تمہارے اشخاص کریمہ کو بھی دیکھا، غایت مافی الباب

یہ کہ جنت و دوزخ کو ان کے وجود مثالی پر محمول کر دیا جائے تب بھی "ظلی وظلکم" سے اشخاص مثالیہ مراد ہوں گے، جسمانی تاریک سایہ اس تقدیر پر بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ وللہ الحجۃ البالغہ

انصاف کیجئے

یہ تینوں حدیثیں جو مخالفین نے حضور سیّد عالم نور مجسم ﷺ کا جسمانی سایہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہیں اگر واقعی ان کے دعویٰ کی مثبت ہوتیں تو وہ جلیل القدر علماء محدثین ومفسرین جن کے اسماء گرامی ہم عرض کر چکے ہیں کس طرح حضور کے سایہ کی نفی کرتے، شاید آپ کہہ دیں کہ یہ حدیثیں ان سے مخفی رہیں، تو میں عرض کروں گا کہ یہ امر ہرگز قابل تسلیم نہیں کہ ایسے ماہرین حدیث ائمہ دین سے آپ کی پیش کردہ حدیثیں مخفی رہی ہوں، دیکھئے آپ کی پیش کردہ حدیث "حتی رأیت ظلی وظلکم" کو امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب خصائص کبریٰ میں لکھا، مگر اس کے باوجود اسی خصائص کبریٰ میں حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا باب منعقد کیا اور روایات وعبارات علماء سے اپنے دعویٰ کو ثابت ومؤید کیا اور حضور ﷺ کے جسمانی سایہ سے پاک ہونے کو آفتاب سے زیادہ روشن کر دکھایا۔

معلوم ہوا کہ مخالفین کی پیش کردہ احادیث سے یہ ائمہ حدیث بے خبر نہ تھے۔

پھر یہ کہ آج سے پہلے کسی نے ان حدیثوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ ثابت نہیں کیا، حتیٰ کہ علامہ ابن قیم کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی، حالانکہ ان سے پہلے اکابر محدثین متقدمین کے وہ تمام ارشادات ان کے سامنے موجود تھے، جن میں حضور ﷺ کے نور خالص ہونے کی وجہ سے حضور کے سایہ نہ ہونے پر استشہاد کیا گیا ہے، جیسے حکیم ترمذی (متوفی ۲۵۵ھ)، عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ)، امام راغب

اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ)، حافظ رزین محدث (متوفی ۵۲۰ھ)، علامہ ابن سبع (متوفی)، قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ)، علامہ ابن جوزی محدّث (متوفی ۵۹۷ھ)، مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۰ھ)، علامہ احمد نسفی صاحب تفسیر مدارک (متوفی ۷۰۱ھ)، یہ سب علماء اعلام علامہ ابن قیم (متوفی ۷۵۲ھ) سے متقدم ہیں اور ان سب نے حضور ﷺ کے جسمانی سایہ کی نفی فرمائی ہے لیکن علامہ ابن قیم نے حدیث "ظلی وظلکم" سے حضور ﷺ کا جسمانی سایہ ثابت کر کے ان حضرات کا ردّ نہیں کیا۔

علیٰ ہذا القیاس علامہ ابن قیم کے بعد ہونے والے اجلہ محدثین مثلاً امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، امام قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ)، علامہ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۹۶۶ھ)، امام ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ)، علامہ شہاب الدین خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ)، امام زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ)، علامہ سلیمان جمل، علامہ ابراہیم بیجوری، علامہ برہان الدین حلبی وغیرہم نے ابن قیم کی کتاب حادی الارواح میں حدیث "ظلی وظلکم" دیکھنے کے باوجود حضور ﷺ کے جسمانی سایہ کا قول نہیں کیا، اور بدستور حضور ﷺ کو نور اور بے سایہ مانتے رہے، اور اسی مسلک کا بیان اپنی تصانیف جلیلہ میں کرتے رہے جیسا کہ ہم ان کے بیانات سابقاً نقل کر چکے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ تینوں حدیثیں متقدمین ومتاخرین میں سے کسی کے نزدیک بھی حضور سیّد عالم ﷺ کے جسمانی سایہ کی دلیل نہیں۔ والحمد للہ علی احسانہ۔

اس کے بعد قرآن مجید کی ان تینوں آیات پر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے، جنہیں معترض نے حضور سیّد عالم ﷺ کے تاریک جسمانی سایہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

اِن میں سے تیسری آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ "سایہ" ہو،

اس آیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ "زمین و آسمان کی ہر چیز اور زمین پر چلنے والی تمام مخلوق اور کل ملائکہ اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں"۔

غور فرمائیے! دعویٰ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کا تاریک سایہ تھا اور دلیل یہ ہے کہ "تمام آسمانوں والے اور زمین پر چلنے والی سب چیزیں اور کل فرشتے اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں" جس کلام کا ایک لفظ بھی دعویٰ پر منطبق نہ ہو اُسے دلیل سمجھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

رہیں پہلی دو آیتیں، تو ان کا مفہوم یہ ہے کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں اور ان میں سایہ دار اجسام کے سائے اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔

(یہ معنی اس تقدیر پر ہیں کہ آیت کریمہ میں "ظلال" کے معنی "سائے" کے لئے جائیں اور اگر ظلال کا ترجمہ اشخاص کیا جائے جیسا کہ تفسیر مظہری، جلد ۵، ص ۱۷ سے ہم نقل کر چکے ہیں تو اس صورت میں یقیناً مخالفین کے استدلال کی اصل بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔)

دیکھئے تفسیر خازن میں ہے: (یتفیئو اظلالہ) یعنی من جسم قائم لہ ظل۔ (تفسیر خازن، جلد رابع، ص ۷۷)

اسی طرح تفسیر معالم التنزیل میں ہے:

(الیٰ ما خلق اللہ من شیء) من جسم قائم لہ ظل۔

(تفسیر معالم التنزیل، جلد رابع، ص ۷۷)

اگر حضور ﷺ کا سایہ ہوتا تو یقیناً اس کا سجدہ کرنا بھی ثابت ہو جاتا، لیکن جسم اقدس کے سایہ کے ثبوت سے آیہ کریمہ کا دُور کا تعلق بھی نہیں۔

اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ ان آیتوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم اقدس کا سایہ ثابت ہے تو پھر تمام بے سایہ چیزوں کا سایہ ثابت ہوگا،

ملائکہ، حورانِ بہشت، چاند، سورج اور تمام حسّی حقیقی انوار کا سایہ ماننا پڑے گا۔

جب یہ بداہۃً باطل ہے تو معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ کا ثبوت بھی اسی طرح باطل محض ہے۔

ہاں اگر یہاں ظل سے ایک عام معنی مراد لے لئے جائیں یعنی اجسام کثیفہ کا تاریک سایہ اور اجسام لطیفہ نورانیہ کی چمک اور شعائیں، تو یہ ہمارے مسلک کے منافی نہیں کیونکہ ہم اس سے قبل احادیث صحیحہ سے حضور سیّد عالم ﷺ کے جسم اقدس کی چمک سے دیواروں کا روشن ہو جانا ثابت کر چکے ہیں، لہٰذا ان آیات سے ہمارے مسلک کی تائید ہوگی، اور یہ آیات حضور ﷺ کے لئے تاریک سایہ کی بجائے روشنی اور نورانیت کی مؤید قرار پائیں گی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

بفضلہٖ تعالیٰ معترضین کے تمام شکوک وشبہات کا تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور ہونا اظہر من الشمس ہو گیا، اور امام اہل سنت، مجدد ملت حضور پر نور اعلیٰ حضرت بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رسالہ مبارکہ نفی الفیء عمن انار بنورہ کل شیء پر وارد کئے ہوئے جملہ اعتراضات ھباءً منثورًا ہو گئے، اور یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصانیف جلیلہ کی پھبتیاں اُڑانا اور ان پر اعتراض کرنا گویا سورج کو منہ چڑانا اور چاند پر تھوکنا ہے، جس کا انجام ذلت اور ندامت کے سوا کچھ نہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ ونور عرشہٖ سیّدنا ومولانا
محمد وآلہٖ وصحبہٖ وبارك وسلّم تسلیمًا کثیرا کثیرا

فقیر سیّد احمد سعید کاظمی غفرلہٗ

السعید کے ظل نمبر (عدم سایہ و حسی و حقیقی نورانیت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسئلہ) پر عامر عثمانی صاحب کے تعاقب کا جواب

نگاہ نور کی حامل نہ ہو تو کیا کہیئے
فروغ گیر کوئی دل نہ ہو تو کیا کہیئے
یہ زندگی، یہ حرارت، یہ معرفت، یہ نگاہ
کسی میں جوہر قابل نہ ہو تو کیا کہیئے

حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ کا مسئلہ ضروریات دین سے نہ تھا بلکہ مسائل ظنیہ میں بھی اس کی حیثیت فضائل و مناقب سے زیادہ نہ تھی، ایسے مسائل پر ہنگامہ آرائی اور طول نگاری ایک بے معنی سی بات تھی۔

لیکن ذاتِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے منکروں نے نامعلوم اسباب کی بناء پر حضور کی ذات مقدسہ کے لئے مادی ظلمت و کثافت اور جسمانی نجاست وغلاظت ثابت کرنے اور جسم اقدس کا تاریک سایہ زبردستی منوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اس موضوع پر متعدد رسائل وجرائد میں پے در پے مضامین آنے شروع ہو گئے۔

فقیر اس غوغہ آرائی سے بالکل بے خبر تھا، اچانک احباب کے کئی خطوط جن میں مخالفین اور منکرینِ کمالاتِ نبوت کے دلائل ومضامین کے چند مختصر نوٹ درج تھے، چونکہ جواب کے لئے شدید اصرار کیا گیا تھا، اس لئے وہی مختصر نوٹ سامنے رکھ کر جواب لکھا گیا، اور طویل ہوجانے کے باعث "السعید" کے دو پرچوں (بابت ماہ اپریل ومئی ۱۹۶۰ء) کا مجموعہ قرار دے کر اسے اواخر اپریل میں "ظل نمبر" کے نام

سے شائع کر دیا گیا، اور محض نیک نیتی کی بناء پر ان لوگوں کو خاص طور پر بھیجا گیا جنہوں نے حضور سیّد عالم نور مجسم ﷺ کی نورانیت کا انکار کر کے جسم اقدس کے لئے معاذ اللہ تاریک سایہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، میرا مقصد یہ تھا کہ نفی واثبات کے تمام دلائل اور اپنا جائزہ ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے تا کہ ان پر بھی حق واضح ہو جائے اور شاید وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آ کر حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور قائلین نورانیت حضور مزید روشنی قلب حاصل کریں، مگر بمصداق یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، منکرین کی ضلالت میں مزید تاریکی وظلمت پیدا ہوئی اور معتقدین کے قلوب روشن ومنور ہو گئے۔

دیو بند میں کوئی عامر صاحب ہیں، اس سے پہلے کبھی ان کا نام تک سننے میں نہ آیا تھا مگر اس وقت وہ اپنی مخصوص جارحانہ طرزِ نگارش کے آئینہ میں ہمارے سامنے بے حجاب ہو کر آ رہے ہیں، اور آہستہ آہستہ ناظرین کے سامنے بھی بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ نورانیت نبی اکرم ﷺ کے منکرین اور جسم اقدس کے لئے تاریک سایہ ماننے والوں کا کوئی رسالہ یا اخبار "رسالہ ظل نبی" کے سوا فقیر کی نظر سے نہیں گزرا بلکہ احباب کے خطوط میں ان کے بعض اقتباسات سامنے آئے جن کا جواب میں نے لکھا تھا اور آغازِ مضمون میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا، لیکن عامر صاحب نے بفحوائے "المرء یقیس علی نفسہٖ" اس اظہار حقیقت کو میری بددیانتی پر محمول کیا، چنانچہ میری عبارت نقل کر کے اس پر تعاقب کرتے ہوئے جون ۱۹۶۰ء کے پرچہ میں رقمطراز ہیں:

"سایہ نہ ہونے کے فتوے پر نقد فروری و مارچ ۱۹۵۹ء کے تجلی میں شائع ہوا تھا، گویا ایک سال سے بھی زیادہ گزرا، اس کے بعد اگر کبھی

تجلی میں اس موضوع کا ذکر آیا ہے تو محض ضمناً اور سرسری، اَب سوا سال بعد اپریل و مئی ۶۰ء میں کاظمی صاحب کا یہ ظاہر کرنا کہ احباب نے بس تقریباً ایک ہی مہینے سے توجہ دلائی اس قدر عجیب ہے کہ قیاس و درایت کا کلیجہ منہ کو آتا ہے، اس اظہار سے شاید یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ سایہ نہ ہونے کے بارے میں تجلی یا کسی اور نے جو دلائل سامنے رکھے ہیں ان کی کمزوری واضح کرنے میں ہمیں کسی طویل فکروتلاش کی احتیاج نہیں ہوئی بلکہ ہم تو اطلاع ملتے ہی انہیں اُدھیڑ کر پھینکے دے رہے ہیں اور اپنے عقیدہ و مسلک کے اثبات میں بے شمار دلائل قاطعہ کا انبار چشمِ زدن میں آگے رکھ رہے ہیں، یہ تاثر ہے شاندار معلوم نہیں فقہ اسے گناہ وثواب کے کس خانہ میں رکھے گی"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۵)

جواباً گزارش ہے کہ آپ نے محض سوءِ ظن کی بنا پر جس تاثر دینے کو میری طرف منسوب کیا ہے اور اس کے لئے فقہ کے گناہ وثواب کے خانے ٹٹولے ہیں بفضلہٖ تعالیٰ میرے ذہن کے کسی گوشہ میں اس کا تصور تک نہیں البتہ اس بدگمانی کی وجہ سے بمقتضائے "اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" کتاب اللہ نے آپ کے اس تاثر کو یقیناً گناہ کے خانے میں رکھ دیا ہے، اے کاش آپ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرتے تو آپ کا قیاس مع الفارق اور درایت بے بصیرت کا کلیجہ منہ کو نہ آتا، اس کے بعد آپ نے میرے ایک اور فقرے پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سب جانتے ہیں اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب بریلوی کو اپنا مقتدا ماننے والوں کی تعداد ہندوپاک میں آٹے میں نمک کے برابر

ہوگی، یا چلئے آٹے میں بھوسی کے برابر کہہ لیجئے" ۔الخ

(ماہنامہ تجلی، دیو بند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۵)

جی صحیح فرمایا، اعلیٰ حضرت کو اپنا مقتدیٰ ماننے والوں کی تعداد آٹے میں بھوسی کے برابر سہی، لیکن حضور ﷺ کے جسم اقدس کا تاریک سایہ ماننے والوں کی تعداد تو ساری دنیا میں زیادہ سے زیادہ آٹے میں گھُن کے برابر ہوگی یا چلئے آٹے میں چوہوں کی مینگنیوں کے برابر کہہ لیجئے، پھر آپ کی یہ تعلیاں کس بل بوتے پر؟

عامر صاحب خود ستائی نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"ہمارے نقد نے بفضلہٖ تعالیٰ ایک خلاف واقعہ عقیدے کی بیخ کنی اس مضبوطی کے ساتھ کی تھی کہ کسی غیر جانبدار اور انصاف پسند قاری کے لئے ریب وشک کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی" ۔الخ

(ماہنامہ تجلی، دیو بند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۳)

جس نقد میں کسی قاری کے لئے ریب وشک کی گنجائش نہ رہ گئی ہو اگر آپ اسے "لاریب فیہ" بھی کہہ دیں تو ہم اس کہنے سے بھی اس کو خود ستائی نہیں بلکہ تحدیث نعمت پر ہی محمول کر لیتے، لیکن سوال یہ ہے کہ "ریب وشک" کیفیات قلبیہ سے ہے اور قلبی کیفیات امور غیبیہ سے ہیں، یہ غیب دانی کا مال غنیمت آپ کو کہاں سے ہاتھ لگ گیا جس پر تحدیث نعمت فرمائی جارہی ہے، مگر نہیں، الفاظ کو چھوڑیئے آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم نے جو رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کے لئے مادی کثافتیں ثابت کیں اور حسّی نورانیت کی نفی کر کے حضور کا تاریک سایہ ثابت کیا، ہمارا یہ کارنامہ ایک نعمت ہے جس کا شکریہ ہم تحدیثِ نعمت کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔

اُف رے بیباکی اور دریدہ دہنی ان گستاخوں کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ "نعمت اللہ" خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی نورانیت لطافت اور پاکیزگی

درحقیقت ان کے معجزات، معالم نبوت اور دلائل رسالت ہیں جن کا انکار نعمت اللہ کو بدلنا اور الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللهِ كُفْرًا کا مصداق بننا ہے۔

عامر صاحب نے اپنی طویل تمہید میں طعن و تشنیع کی بھرمار کرتے ہوئے جس طنز و تمسخر کے ساتھ اپنی ذہنیت کا اظہار کیا ہے ہمیں اس کا شکوہ نہیں۔

دشنام اگر دہد...... چارہ نبود بجز شنیدن

ہمیں ان کے اندازِ نگارش سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ تکبر و تعلی، نخوت و غرور، سب و شتم، طعن و تشنیع ان کی طبیعت ثانیہ ہے۔ ع

"مقتضائے طبیعتش ایں است"

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی تمہید میں حقائق کو توہمات، ہدایت کو ضلالت، علم و عقل کو جہالت، استدلال کو تک بندی کہہ کر ایک حقیقت کو جھٹلانے کی مذموم کوشش کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کے ساتھ شدید تمسخر ہی نہیں بلکہ انتہائی بددیانتی کے ساتھ نہایت مکروہ صورت میں مسخ کر کے پیش کیا ہے اور حضور ﷺ کو جسم اقدس کے تاریک سایہ سے مبرا ماننے والوں کے حق میں نہایت نازیبا الفاظ لکھے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ حضور سیّد عالم ﷺ کی ذات مقدسہ کے لئے عوام کی طرح جسمانی ظلمتوں، نجاستوں اور غلاظتوں کو ثابت کرنے کے لئے پیشاب، پاخانہ، تھوک اور منی کا ذکر انتہائی بے حیائی، بے باکی اور دریدہ دہنی کے ساتھ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی نورانیت و لطافت اور تاریک سایہ سے جسم اقدس کے مبرا ہونے کے مسئلہ کو اسلامی اور مذہبی نظر سے نہیں بلکہ خالص مادہ پرستی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

انہوں نے ہمارے تعاقب میں بے راہ روی کے باعث ٹھوکریں بھی ایسی کھائی ہیں کہ انشاء اللہ عمر بھر کراہتے رہیں گے۔

ان ٹھوکروں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے قدرت نے جو طریقِ کار مقرر کیا ہے اس کی خلاف ورزی ہمیشہ ایسے ہی مہلک نتائج پر منتج ہوا کرتی ہے، برائی کی راہوں پر چل کر اچھائی نہیں ملا کرتی، شمال کی طرف رُخ کر کے چلنے والا کبھی مشرق نہیں پہنچ سکتا، اسلامی مسائل کو جاہلیت کے اصول پر نہیں پرکھا جا سکتا، حضور ﷺ کی بشریت مطہرہ کا مادی کثافتوں اور تاریک سایہ سے پاک ہونا خالص دینی اور مذہبی مسئلہ تھا، مگر عامر صاحب نے مذہبیات سے ہٹ کر لامذہبیات کی دنیا میں اس کا جائزہ لیا اور اسلامی مسئلہ کو خالص غیر اسلامی نظر سے دیکھا اس میدان میں ان کا اندازِ فکر قطعاً لادینی طرز کا ہے۔ ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں رہ کہ میروی بہ ترکستان است

عامر صاحب نے اکمل واحسنِ کائنات ﷺ کا قیاس دیگر ظلماتی مادیات پر کیا، اور اس فاسد بنیاد پر فساد کی عمارت کھڑی کردی، انہوں نے شرعیات واسلامیات سے منہ پھیر کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ نہ ہونے کے معجزے اور دلیل نبوت کو مادیات وطبعیات کی تاریکیوں میں تلاش کرنا شروع کر دیا، دیکھئے وہ لکھتے ہیں:

"ٹھوس اشیاء کا روشنی کے پھیلاؤ میں حائل ہو کر سایہ دینا طبعیات کا مسئلہ ہے، اس سے آیات الٰہیہ کا کوئی رابطہ نہیں"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ١٩٦٠ء، ص ٥٣)

دیکھا آپ نے! عامر صاحب کے چلتروں نے بیک جنبشِ قلم ایک شرعی مسئلہ کو طبعیاتی مسئلہ بنا دینے اور آیات الٰہیہ سے اس کا ربط توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کی کتنی بیباکانہ جسارت کی ہے، حالانکہ قرآن مجید کی کئی آیتوں سے یہی لوگ سایہ ہونے پر

دلیل لایا کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ وہ استدلال باطل ہے یا وہ قرآنی آیات معاذ اللہ آیات الٰہیہ نہیں، بالفرض اگر آپ کے نزدیک واقعی اس مسئلہ کو آیات الٰہیہ سے کوئی رابطہ نہیں تو پھر ہمارے تعاقب میں آپ کا پوری بائیس آیتیں لکھنا قرآن مجید کے ساتھ تمسخر نہیں تو کیا ہے؟ طبعیاتی مسائل کو سامنے رکھ کر آیات الٰہیہ سے کھیلنا خدا ورسول کے ساتھ مذاق کرنا ہے، کوئی شخص جس کے دل میں ادنیٰ درجہ کا خوف خدا ہو وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

شرعیات کو طبعیات والٰہیات اور اسی طرح ریاضیات کے سانچے میں ڈھالنا ہی وہ اندازِ فکر ہے جس کی بنا پر ملاحدہ نے وجودِ صانع، توحید باری، نبوت ورسالت، ملائکہ کرام، معجزات وخوارق انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا اور معاذ اللہ معظماتِ دینیہ کا مذاق اُڑایا۔

نیچریوں نے تمام معجزات وخوارق انبیاء علیہم السلام بالخصوص معراج جسمانی کا انکار ان طبعیات کے ظلمات میں کھوئے جانے کے باعث کیا، مادہ پرستوں نے قیامت، حشر ونشر، جزاوسزا، دوزخ وجنت وغیرہ حقائق غیبیہ پر ایمان رکھنے کو فرضی مزعومات، باطل وفاسد توہمات کہہ دیا، مرزائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اُٹھائے جانے اور اَب تک وہاں زندہ رہنے اور قرب قیامت میں نازل ہونے کے اعتقاد کو اسی طبعیات کی دلدل میں پھنس کر معاذ اللہ لغو اور بیہودہ تخیلات، اوہام پرستی، جہالت وحماقت قرار دے دیا۔

آج اسی طبعیات ومادیات کے سہارے پر بالکل وہی اندازِ فکر لے کر آپ بھی اُٹھے ہیں اور آپ نے اسی طرح مسائل شرعیہ اور کمالات نبویہ کے ساتھ تمسخر شروع کیا ہے جس طرح معتقداتِ اسلامیہ کے ساتھ آپ کے پیش رو جاہلیت اور مادہ پرستی کی تاریکیوں میں مبتلا رہنے کے باعث اَب تک تمسخر کرتے چلے آئے ہیں۔

جاہلی نظریات اور مادہ پرستی کی ظلمت ہی کا نتیجہ ہے کہ حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے پر قرآن و حدیث کے سورج سے زیادہ چمکتے ہوئے دلائل، ائمہ سلف کی واضح عبارات موجود ہوتے ہوئے ملاحدہ کی اتباع میں حضور ﷺ کی بشریت اور جسمانیت کو حضور ﷺ کے سایہ ہونے کی اٹل دلیل سمجھ لیا گیا، اور دلائل شرعیہ کو یہ کہہ کر پس پشت ڈال دیا گیا کہ "روشنی" میں ٹھوس مادی چیزوں کا سایہ ہونا طبعیاتی مسئلہ ہے آیاتِ الٰہیہ سے اس کا کوئی رابطہ نہیں۔

جو لوگ اپنے سینہ میں ایمان و ایقان کے جلوے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کی قدرت و حکمت پر ان کا ایمان ہے ان کے نزدیک قدرتِ خداوندی سے یہ امر ہرگز بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کی بشریت اور جسمانیت کو اتنا منور اور لطیف کر دے کہ جسمانی کثافتیں بالکل دُور ہو جائیں، حتیٰ کہ تاریک سایہ بھی باقی نہ رہے۔

افسوس ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ معاذ اللہ ظلم و کذب جیسے بدترین عیوب ونقائص کو اللہ تعالیٰ کے لئے ممکن مان کر ان کا تحتِ قدرت ہونا تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن جسمانیت و بشریتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کا سایہ سے پاک ہونا ان کے نزدیک ایسا امرِ محال ہے جس پر ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ قادر ہی نہیں، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔
عامر صاحب کی اخلاقی پستی اور کم حوصلگی قابل دید ہے کہ اپنے جس پرچہ میں ہمارے مضمون پر تعاقب کیا تھا، اس کی ایک کاپی تک ہمیں نہ بھیجی حالانکہ ہم نے "ظل نمبر" ان کے پاس دیوبند بھیج دیا تھا، انہوں نے جون کے پرچہ میں ظل نمبر پر تعاقب کیا تھا جس کا ہمیں کچھ علم نہ ہو سکا، حسن اتفاق سے ایک محترم دوست نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ السعید کے ظل نمبر پر تعاقب کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس خط میں یہ اصرار تھا کہ اس کا جواب السعید ہی کے صفحات پر آنا چاہئے، تعاقب کی اطلاع پانے کے بعد کئی دن

تک وہ پرچہ ہمیں نہ مل سکا بالآخر مرزا ریاض احمد صاحب حافظ آبادی نے لاہور سے وہ رسالہ ہمیں بھیجا۔

جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ عامر صاحب ہمارے تعاقب میں اتنے بے تحاشا دوڑے ہیں کہ ٹھوکریں کھانے، گرنے پڑنے کا بھی انہیں احساس نہ ہوا اور ہانپتے کانپتے ہماری پیش کردہ دو آیتوں میں سے صرف ایک آیت کے جواب میں پورے اٹھارہ صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں مگر جو لوگ محض طعن و تشنیع اور الفاظ کے اُتار چڑھاؤ سے مرعوب ہونے والے نہیں وہ ان کا مضمون پڑھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ عامر صاحب نے چند بے تکے سوقیانہ اور طنزیہ فقرے بول کر آفتاب سے زیادہ روشن اور پہاڑ سے زیادہ وزنی حقیقتوں کا منہ چڑایا ہے، جن لوگوں نے "ظل نمبر" میں میرے مضمون کو بغور پڑھا ہے وہ خوب سمجھتے کہ عامر صاحب کے تعاقب کا کوئی جز ایسا نہیں جس کا جواب دفع دخل مقدر کے طور پر میرے مضمون میں نہ آ گیا ہو اور اسی وجہ سے ان کا تعاقب قطعاً لائق التفات نہ تھا مگر صرف اس لئے اس کی طرف توجہ کی گئی کہ عامر صاحب یا ان کے حواری کہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ ہم نے ظلمت و کثافت کی جن بنیادوں پر حضور ﷺ کے لئے سایہ ثابت کیا تھا انہیں کوئی ہلا نہ سکا، اس لئے مجبوراً ہمیں کچھ لکھنا پڑا، اور ان شاء اللہ آگے چل کر ناظرین کرام دیکھ لیں گے کہ عامر صاحب کا تعاقب علم و استدلال کے سمندر کی موجوں میں خس و خاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔

اہم ترین مسائلِ دینیہ میں بحث و تمحیص کے لئے پختہ کاری اور مضبوط علمی قابلیت کی ضرورت ہے، اہل علم سے مخفی نہیں کہ عامر صاحب نے اپنے علم و استدلال اور قابلیت کے بڑے لمبے چوڑے دعوے کئے ہیں، آیئے! اصل مقصد سے پہلے لگے ہاتھوں ذرا ان کی علمی قابلیت کا تھوڑا سا جائزہ لیتے چلیں۔

عامر صاحب "السعید" سے میری ایک عبارت نقل کرنے کے بعد اس پر جرح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں :

" آپ معمولی سا دعویٰ کریں تو معمولی دلیل بھی چل سکتی ہے، لیکن بہت بڑا دعویٰ کرنے کی صورت میں بہت مضبوط دلیل دینی ہوگی، آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص پر میرا ایک روپیہ قرض ہے تو اس قول کو بہت معمولی سی دلیل پر بھی قبول کیا جاسکتا ہے، لیکن آپ کہیں کہ زید پر میرے بیس ہزار روپے قرض ہیں تو اس کے لئے معمولی شواہد اور دلائل کافی نہ ہوں گے بلکہ آپ کو صریح و محکم طور پر ثبوت لانا ہوگا اور اگر ذرا سی بھی شک کی گنجائش نکل آئی تو اس کا فائدہ مدعا علیہ کو پہنچے گا اور آپ کا دعویٰ منہ پر مار دیا جائے گا"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۸)

دعوے کے مطابق دلیل کا ہونا تو مسلمات میں سے ہے، آپ کی اس فضول اور اول جلول جرح سے آپ کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے نہ ہمارے مضبوط و مستحکم دلائل میں ضعف آسکتا ہے، میں نے اپنے مضمون میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کی وضاحت کر دی تھی، اگر کوئی شپرہ چشم نہ دیکھے تو ہمارا کیا گناہ؟ دعوے کے مطابق دلیل نہ ہونے کی جو مثال آپ نے لکھی ہے چشم بد دور! وہ آپ کی علمی قابلیت کا قابل دید شاہکار ہے۔

اس کی مثال میں اگر آپ کہہ دیتے کہ مثلاً ایک شخص ضب (گوہ) کی حرمتِ قطعیہ کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دلیل میں کوئی محتمل اور ظنی دلیل قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ دعویٰ قطعیت کا ہے اس کی دلیل بھی قطعی ہونی چاہئے، مگر آپ نے یہ مثال صرف اس لئے نہیں لکھی کہ میں نے اپنے مضمون میں یہ سب کچھ بیان کر دیا تھا،

اور یہ مثال بجائے آپ کے میرے حق میں مفید رہتی، لہٰذا آپ نے اس قسم کی مثال سے قصداً اعراض کیا اور اس کی بجائے ایک روپیہ اور بیس ہزار روپے کی مثال کے چکر میں پھنس کر لکھ ڈالا کہ:

"آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص پر میرا ایک روپیہ قرض ہے تو اس قول کو بہت معمولی سی دلیل پر بھی قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کہیں کہ زید پر میرے بیس ہزار روپے قرض ہیں تو اس کے لئے معمولی شواہد اور دلائل کافی نہ ہوں گے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۸)

عامر صاحب! سبحان اللہ کیا مہاجنی ذہنیت کا اظہار کیا ہے آپ نے اس مثال میں، غالباً آپ فاضل دیوبند تو ہوں گے؟ فقہ پڑھنے والا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حقوقِ مالیہ کے ثبوت میں جو شہادت شرعاً معتبر ہے وہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ہے، مال تھوڑا ہو یا بہت، ایک روپیہ ہو یا بیس ہزار، نصاب شہادت ہر صورت میں یہی رہے گا، ذرا دارالعلوم کے کتب خانہ سے ہدایہ جلد ثالث نکلوا کر سامنے رکھئے اور تصور شیخ کی نوعیت سے ہمارا تصور کر کے یہ صریح عبارت پڑھئے۔

"وما سوىٰ ذٰلك من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين او رجلٍ وامرأتين سواء كان الحق مالًا او غير مالٍ مثل النكاح والطلاق والوكالة والوصية ونحو ذٰلك" -انتہٰی

"اور اس کے سوا باقی حقوق میں دو مردوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی، برابر ہے کہ حق مال ہو یا غیر مال، جیسے نکاح، طلاق، وکالہ، وصیۃ"۔

پھر اسی ہدایہ جلد ثالث میں یہ عبارت بھی دیکھئے :

"ویقبل قوله فی القلیل و الکثیر لا بل ذلك مال فانه اسم لما یتمول به الا انه لا یصدق فی اقل من درهم لانه لا یعد مالًا عرفًا"۔ انتهی

"اس کا قول قلیل وکثیر میں مقبول ہوگا، اس لئے کہ یہ سب مال ہے تو جس چیز سے تمول کیا جائے وہی مال ہے، مگر ایک درہم سے کم پر وہ صادق نہ آئے گا، کیونکہ عرفاً وہ مال شمار نہیں کیا جاتا"۔

غور کیجئے، یہ عبارت اس مفہوم کو کس وضاحت کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ جو چیز مال ہو اس کا قلیل وکثیر ہونا شہادت واقرار کی قبولیت وعدم قبولیت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ عرفاً مال ہو جیسے ایک روپیہ اور بیس ہزار روپے، یہ دونوں عرفاً مال ہیں، کیا عامر صاحب کتاب وسنت کی روشنی میں مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سی معمولی دلیل ہے جس سے کسی پر ایک روپیہ کے قرضے کا دعویٰ ثابت ہو جائے اور بیس ہزار کا دعویٰ ثابت نہ ہو سکے، شرعیات اور مذہبیات کی روشنی میں تو انشاء اللہ وہ قیامت تک نہ بتا سکیں گے، البتہ موجودہ دور کے لادینی اور بھارت کے مہاجنی طور طریقوں کو پیش نظر رکھ کر ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ کہہ بھاگیں، جس پر کوئی مذہبی آدمی کان نہیں دھر سکتا نہ کوئی مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے اسے قبول کر سکتا ہے۔

عامر صاحب کی اس علمی مثال کے شاہکار کو دیکھ کر ناظرین کرام نے ان کی ٹھوس قابلیت اور علم واستدلال کا پوری طرح جائزہ لے لیا ہوگا اور اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ وہ دینی مسائل کو لادینی دلائل سے ثابت کرنے کی تلبیس میں کتنے ماہر ہیں، جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم اپنے ناظرین کرام کو متوجہ کر چکے ہیں۔

اَب اصل مقصد کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ عامر صاحب نے ہمارے تعاقب میں کیسے پاپڑ بیلے ہیں۔

حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونے کے عقیدہ کی شرعی حیثیت جو عامر صاحب کے نظریات کی روشنی میں ظاہر ہوئی ہے وہ ان کی حسب ذیل عبارت سے واضح ہے۔

"سایہ ہونا نہ ہونا بظاہر ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن عملی زندگی جن داخلی افکار وعقائد کے سہارے آگے بڑھتی ہے ان سے اس مسئلہ کا گہرا ربط ہے، بدعات وخرافات نے توحید ورسالت کے تصور کو جس قدر غبار آلود بنادیا ہے وہ ایک تاریخی ٹریجڈی ہے جس کی کسک ہر دردمند مومن بری طرح محسوس کرتا ہے، دیو مالائی انداز کے تصورات عامۃ المسلمین کے ذہنوں پر چھاگئے ہیں، واہی عقائد نے دل ودماغ کی بنیادیں کھوکھلی کر کے رکھ دی ہیں، اور گمراہی وبے دانشی کا ایسا نقشہ فضائے ایمان پر چھا گیا ہے کہ عملی زندگی اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا یارا ہی باقی نہیں رہ گیا، ایسے عالم میں کسی ایک بھی گمراہ کن عقیدہ کو اکھاڑ پھینکنا اور توحید ورسالت کے عارض سے جتنی بھی گرد ہوسکے جھاڑ دینا ہمارے نزدیک بہت مفید اور نتیجہ خیز ہے، پھر یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ سایہ نہ ہونے کے لئے بے بنیاد عقیدہ کی تصدیق آج کے دارالعلوم (دیوبند) نے کی ہے اور دارالعلوم (دیوبند) اپنی مرکزیت کے باعث بڑے دُوررس اثرات رکھتا ہے، جو گمراہی یہاں سے چلے گی وہ آندھی اور طوفان کی طرح پھیلے گی، اسی لئے ہم نے مفتی دارالعلوم کے فتوے پر پہلے ہی سخت گرفت کی تھی، اور اَب بھی ہماری طول

نگاری زیادہ تر اسی لئے ہے، آج کے دار العلوم کی حیثیت عوام الناس پر واضح ہو جائے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴)

اس کے بعد عامر صاحب اسی سایہ کی بحث کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"بہر حال سایہ کی بحث سے ہمیں ایک ضرر رساں عقیدہ کی تردید کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھانا مقصود ہے کہ آج کے مفتی دار العلوم علم و دیانت کے تقاضوں سے کس درجہ بے نیاز ہیں"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۵)

اِن عبارات سے یہ ترشح ہو رہا ہے کہ عامر صاحب معدومیت ظل النبی کی مخالفت کے پردہ میں صرف مفتی دار العلوم ہی کے نہیں بلکہ ایک اہتمام و انتظام و ارکانِ ادارہ کے اخراج و انقطاعِ اختیارات کے درپے ہیں، اور کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دار العلوم میں کوئی تازہ انقلاب لا کر اپنے اقتدار کا خواب دیکھ رہے ہیں، خیر ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں اس امر کی طرف توجہ کرنا ارکانِ دار العلوم کا کام ہے۔

چند سطور کے بعد اسی معدومیتِ سایہ کے عقیدہ کے متعلق گلفشانی کرتے ہیں:

"ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اَب بھی اعلانیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کا سایہ نہ ہونا ایک بے بنیاد طبع زاد عقیدہ ہے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۵)

اِن تینوں عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کا عقیدہ ان کے نزدیک بدعت، خرافات، تصور توحید و رسالت پر غبار، صریح گمراہی اور بے دانشی ہے، نہ صرف یہ بلکہ یہ عقیدہ نہایت ضرر رساں بے بنیاد اور طبع زاد ہے۔

اِس مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ دیکھئے کہ عامر صاحب نے رسول

اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کا عقیدہ رکھنے والوں کی شرعی حیثیت کیا بیان کی ہے، وہ رقمطراز ہیں :

"ہمیں پہلے بھی یقین تھا اور اب بھی یقین ہے کہ رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کی بے اساس بات صرف ایسے ذہنوں کو ہضم ہو سکتی ہے جو یا تو طبعاً وہم پرست، مبالغہ کیش اور عجائب پسند ہوں یا پھر جذباتی مغلوبیت نے ایک حادثے اور اُفتاد کے طور پر ان کے قدرتی سسٹم پر کوئی ایسا ہی اثر ڈالا ہو، جیسا بخار آدمی کے نظامِ کان و دہن پر ڈالا کرتا ہے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیو بند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۴)

نیز اسی عقیدہ رکھنے والوں کے متعلق آگے چل کر عامر صاحب وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں :

"جو فرد یا گروہ شعر کی زبان میں نہیں بلکہ حقیقی معنی میں اہل سنت ہوگا ......وہ قیامت تک ایسی بے سروپا اور فتنہ انگیز حرکت نہیں کرے گا کہ جس پیغمبر علیہ السلام کی بشریت کے اثبات میں اللہ جل شانہٗ متعدد صریح و محکم آیات نازل فرما رہے ہیں اور جس کی بشریت عین مشاہدہ اور تمام عالم کے نزدیک حقیقت ثابتہ ہے اسے حدودِ بشریت سے باہر لا کر مادی و طبعی اوصاف و لوازم سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش کرے وہ سایہ نہ ہونے کی بات سن کر جھومے گا نہیں کہ میرے نبی کی شان بڑھ رہی ہے، بلکہ خطرہ کی آہٹ پا کر چونک پڑے گا کہ یہ تو قصرِ نبوت میں وہی چور دروازہ کھولا جا رہا ہے جس کی راہ سے مسیح ابن مریم اللہ کے بیٹے بنائے گئے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۶)

ان دونوں عبارتوں کے خط کشیدہ الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ عامر صاحب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا عقیدہ رکھنے والے وہم پرست، مبالغہ کیش، عجائب پسند ہیں اور جذباتی مغلوبیت نے ان کے قدرتی سسٹم پر ایسا اثر ڈال دیا ہے، جیسا بخار آدمی کے تمام جسمانی نظام پر اثر ڈال دیتا ہے، نیز ایسا عقیدہ رکھنے والے ان کے نزدیک اہل سنت سے خارج ہیں، اور ان کا یہ عقیدہ فتنہ انگیز اور قرآن کریم کی صریح و محکم آیات کے خلاف ہے، نہ صرف یہ بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سایہ نہ ہونے کا عقیدہ قصرِ نبوت میں ایک ایسا چور دروازہ ہے جس کی راہ سے مسیح ابن مریم اللہ کے بیٹے بنائے گئے۔

تمام عباراتِ منقولۂ بالا کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ عامر صاحب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کا اعتقاد از قبیل بدعات و خرافات، ضلالت و گمراہی، عیسائیت و نصرانیت اور عقیدۂ توحید و رسالت کے منافی بلکہ قصرِ نبوت میں معاذ اللہ حضور کی الوہیت کا ایک چور دروازہ ہے۔

عامر صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے سایہ سے پاک ہونے کے عقیدہ کو بدعت، گمراہی اور عیسائیت و نصرانیت قرار دیا، حالانکہ اسلاف کرام اور ائمہ دین میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے، چونکہ عامر صاحب خود مَرے دل اور دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

> "ہزاروں ہزار علماء اور ائمہ میں شاید گنے چنے ایسے نکلیں جنہوں نے اپنے خاص احوال یا جذباتی مغلوبیت یا اپنی افتادِ طبع، یا کسی ہنگامی ترغیبِ ذہنی کے تحت رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کو واقعہ گمان کر لیا ہو"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۶)

عامر صاحب نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر یہ بے جا قیود حق گو ائمہ پر لگا ڈالیں مگر اس کے باوجود اس حقیقت کا انہیں اقرار کرنا ہی پڑا کہ علمائے اُمت وائمہ دین میں ایسے حضرات ضرور پائے جاتے ہیں جن کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونا امر واقع ہے، اسی بحث میں ایک اور جگہ رقمطراز ہیں :

"بجا کہ اسلاف میں بعض ایسے بزرگ بھی سایہ نہ ہونے کی بے اصل بات کے فریب میں آگئے ہیں جن کے علم وفضل پر اُنگلی مشکل ہی سے اُٹھائی جاسکتی ہے، جن کے ذہنوں کو فاسد وکاسد کہنا بے جا جسارت ہوگی اور جن کی عام قدر ومنزلت شبہ سے بالاتر ہے، لیکن شکر ہے کہ وہ انبیاء نہیں تھے، صحابی بھی نہیں تھے، تابعی بھی نہیں تھے، بلکہ ہمارے ہی جیسے اُمتی تھے جو زہد وعبادت کے ذریعہ امام وقطب اور شیخ ومرشد بن سکتے ہیں لیکن خطاونسیان سے بالاتر نہیں ہوسکتے"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۴)

اس عبارت میں بھی عامر صاحب نے مَرے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اسلاف کرام میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں جو حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کے معتقد تھے، جن کے علم وفضل پر اُنگلی اُٹھانا مشکل ہے اوران کے ذہنوں کو فاسد وکاسد کہنا جسارت بے جا ہے جن کی قدر ومنزلت شبہ سے بالاتر ہے، جو عابد وزاہد، امام وقطب، شیخ ومرشد کا مقام رکھتے تھے، البتہ وہ نبی، صحابی اور تابعی نہ تھے جو خطاونسیان سے بالاتر ہوں، (ماشاء اللہ کیا توجیہ متکلمانہ ہے)۔

عدمِ سایہ رسول اللہ ﷺ کے اعتقاد کو معاذ اللہ گمراہی بدعت اور عیسائیت قرار دینے والے عامر صاحب ذرا یہ تو بتائیں کہ اس گمراہی اور نصرانیت میں مبتلا ہونے والے لوگ! اسلاف، بزرگ، اہل علم ودانش، صاحبان فضل وکمال، صحیح الذہن،

شبہات سے بالاتر، امام، قطب اور شیخ و مرشد بھی بن سکتے ہیں، یاللعجب

آپ کے انقلابی ذہن کی داد نہیں دی جاسکتی، جو عقیدہ آپ کے نزدیک ضلالت و گمراہی، بدعت و جہالت، عیسائیت و نصرانیت کا حکم رکھتا تھا وہ بیک جنبش قلم خطاونسیان کی صورت میں تبدیل ہو کر رہ گیا، کیا کہنا آپ کی جرأت و جسارت کا، مذہبیات میں یہ تغیر و تبدل؟ دین کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر کیا سادگی سے فرماتے ہیں:

"لیکن شکر ہے کہ وہ انبیاء نہیں تھے، صحابی بھی نہیں تھے، تابعی بھی نہیں تھے بلکہ ہمارے ہی جیسے اُمتی تھے جو زہد و عبادت کے ذریعہ امام و قطب اور شیخ و مرشد تو بن سکتے ہیں لیکن خطاونسیان سے بالاتر نہیں ہوسکتے"۔

بولیے! آپ کی یہ عبارت پڑھنے والا کیا سمجھے گا؟ یہی نا کہ آپ نبی، صحابی، تابعی کو خطاونسیان سے بالاتر سمجھتے ہیں، پھر کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی آپ کا یہی اعتقاد ہے؟ اپنے اسی پرچہ میں وہ اقتباس ہی دیکھ لیا ہوتا جو صفحہ ۶۴ پر ترجمان القرآن سے آپ نے لیا ہے۔

"دراصل کوئی انسان خطا اور لغزش سے پاک نہیں"۔

کیوں جناب کیا انبیاء، صحابہ اور تابعین آپ کے نزدیک انسان نہیں ہوتے؟ جب وہ سب انسان ہیں اور کوئی انسان خطا سے پاک نہیں تو کیا اس شکلِ اوّل کا یہ منطقی نتیجہ نہیں نکلا کہ نبی، صحابی، تابعی کوئی خطا سے پاک نہیں، پھر یہ اسلاف اگر معاذ اللہ نبی بھی ہوتے تو کیونکر خطاونسیان سے بالاتر ہوسکتے تھے۔ کیا تلبیس اور مغالطے کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

عامر صاحب! آپ اس اوریجنل افسانہ نگاری کے وقت کس موڈ میں تھے

کہ آپ اپنے ابن تیمیہ صاحب کا ارشاد بھی بھول گئے، وہ فرماتے ہیں:

"وعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قل خطأ من علی رضی اللہ عنہ"

(منہاج السنۃ، جلد ٢، ص ١٥٤)

ترجمہ۔ حضرت عمر کی خطائیں حضرت علی سے کم ہیں۔

جب عمر و علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر حضرات صحابی ہو کر خطا سے نہ بچ سکے تو بیچارے اسلاف صحابی ہو کر کیونکر خطا سے بالاتر رہ سکتے تھے؟

ہاں آپ کو مودودی صاحب کا فرمان بھی شاید یاد نہیں رہا، وہ فرما گئے ہیں:

"نبی ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا"۔

(رسائل و مسائل، ص ٣١)

موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے بہت بڑا گناہ ہو سکتا ہے تو اسلاف کا خطا و نسیان سے بالاتر رہنا کیسے ممکن ہوگا؟ شاید آپ کہہ دیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا گناہ نبوت سے پہلے ہوا تھا اس لئے اعتراض کی بات نہیں، بحث یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بڑے گناہ سے نہ بچ سکے تو اسلاف نبی، صحابی یا تابعی ہو کر خطا سے بالاتر کیسے رہ سکتے ہیں؟ آخر موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ نبوت سے قبل صحابہ اور تابعین کے مرتبہ سے تو بہر حال اونچا تھا، جب صحابی اور تابعی سے اونچے درجہ والے کا یہ حال ہے تو اسلاف بیچارے صحابی یا تابعی ہو کر کس گنتی میں رہتے ہیں۔

رہا اصل مسئلہ تو حق واضح کرنے کے لئے مختصراً اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگرچہ متکلمین کا ایک گروہ قبل البعثۃ انبیاء سے صدور ذنب کا قائل ہے لیکن محققین اہل اللہ کا مسلک یہی ہے کہ نبوت سے پہلے اور بعد ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام عمداً تمام صغائر و کبائر سے پاک ہیں، علامہ بحر العلوم فرماتے ہیں:

"واما قبل النبوۃ فالتحقیق وعلیہ اھل اللہ من الصوفیۃ الکرام انھم معصومون ایضاً من الکبائر والصغائر عمداً" (ملتقط از حاشیہ نبراس، ص ۴۵۳)

اور شارح مواقف نے بھی اسی مسلک کی تائید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فعلِ قتل پر وارد کئے ہوئے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے "الجواب انه قبل النبوة" لکھ کر صاف ارقام فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا فعلِ قتل بلا قصد بھی ہو سکتا ہے اور انہوں نے اس فعل پر جو اقوال صادر فرمائے وہ سب (معصیت اور گناہ کی بجائے) تواضع اور کسر نفسی پر محمول ہو سکتے ہیں، شرح مواقف کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ کیجئے:

"وایضًا جاز ان یکون قتلہ خطاءً وما صدر عنه من اقوالہ محمولاً علی التواضع وھضم النفس" انتہیٰ (شرح مواقف، جلد ۸، ص ۲۷۱)

عامر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کے عقیدہ کو جو بزرگان دین وسلف صالحین کا عقیدہ رہا ہے، مسلمانوں کے ذہن میں بے وقعت اور خفیف کرنے کے لئے لکھ مارا کہ خاص احوال یا جذباتی مغلوبیت یا افتادِ طبع یا کسی ہنگامی ترغیب ذہنی کے تحت بزرگوں کا یہ عقیدہ رہا ہے، ان عقل کے دشمنوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی نیکی یا بدی جس سے سرزد ہوتی ہے وہ ان ہی چار اسباب ووجود کے تحت سرزد ہوتی ہے، کوئی شخص کسی نیکی یا بدی کو جن احوال میں ادا کرتا ہے یقیناً وہ خاص احوال ہوتے ہیں، اسی طرح کوئی اچھائی یا برائی نیکی اور بدی کے جذبے سے متاثر اور مغلوب ہوئے بغیر واقع نہیں ہو سکتی، نیز ہر شخص کی افتادِ طبع کو اس کے افعال واعمال، عقائد وخیالات میں پورا پورا دخل ہوتا ہے، اور یہ امر بھی واضح ہے کہ وقتی اور ہنگامی طور پر ذہنی ترغیبات

انسان کے افعال واعمال، خیالات ومعتقدات کے لئے ضرور مؤثر ثابت ہوتی ہیں اور ان وجوہ کے تحت کسی عقیدہ یا عمل کا صدور وظہور اس عقیدہ یا عمل کے بے وزن و بے وقعت اور خفیف ہونے کا موجب ہرگز نہیں ہوسکتا، ایسی صورت میں بزرگانِ دین کے اس عقیدہ کو ان وجوہ کے تحت لانے سے کیا فائدہ پہنچا، محض الفاظ کے ہیر پھیر سے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ اثر پیدا کرنا مقصود ہے کہ اسلاف کا یہ عقیدہ کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا کوئی وزن نہیں رکھتا، لیکن یاد رکھئے جس طرح پہاڑ کو تنکا کہہ دینے سے اس کا وزن کم نہیں ہوسکتا، اسی طرح بزرگانِ دین کے اس عقیدہ کو اس نوعیت سے لکھ دینا اس کو ہلکا اور بے وقعت نہیں بنا سکتا، سلف کے مقدس حضرات اور اپنے مقتداؤں کو جو لاریب منکرین ظل ہیں کہاں چھپا سکتے تھے، لیکن اس سلسلہ میں جو ہاتھ کی صفائی دکھائی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ اس کے سامنے اس فن کے بڑے بڑے فن کار بھی مات کھا گئے ہوں گے، عامر صاحب رقمطراز ہیں:

"ہزاروں ہزار علماء اور ائمہ میں شاید گنے چنے ایسے نکلیں جنہوں نے رسول اللہ (ﷺ) کا سایہ نہ ہونے کو واقعہ گمان کرلیا ہو"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۶)

واہ جناب آپ کی کارستانی قابل داد ہے، حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کے معتقد ہزاروں ہزار میں سے گنے چنے چند اور وہ بھی شاید، کیا کہنا ہے آپ کی فنکاری کا، مثل مشہور ہے کہ نکٹی ناک والے کو نکّو بتائے، آپ کی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ظلمت بھرا کالا سایہ ثابت کرنے والا تو ان ائمہ اعلام میں کیا ساری اُمت مسلمہ میں ڈھونڈے سے بھی کوئی نہ ملے گا، اور ہمارے ہم عقیدہ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تاریک سائے سے پاک ماننے والے علمائے اعلام وائمہ دین متقدمین ومتاخرین اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ آپ ان کی تفصیل پڑھ کر گھبرا جائیں گے، جن

حضرات نے "السعید" ملتان کا "ظل نمبر" نہیں پڑھا ان کی خصوصی رعایت ملحوظ رکھ کر ان حضرات کے اسمائے گرامی کی فہرست پہلے سے زیادہ مکمل کر کے پیش کی جا رہی ہے جو حضور ﷺ کو تاریک سایہ سے پاک مانتے تھے۔

(۱) سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، صحابی (متوفی ۳۵ھ)

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، صحابی (متوفی ٦٨ھ)

(۳) حضرت ذکوان، تابعی (متوفی ۱۰۱ھ)

(۴) حضرت ابن المبارک، تابعی (متوفی ۱۸۱ھ)

(۵) حکیم ترمذی، (متوفی ۲۵۵ھ)

(٦) حافظ رزین محدث (متوفی ۵۲۰ھ)

(۷) محدث ابن سبع (متوفی ......)

(۸) محدث ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ)

(۹) قاضی عیاض امام المحدثین (۵۴۴ھ)

(۱۰) امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ)

(۱۱) امام نسفی (متوفی ۷۰۱ھ)

(۱۲) امام قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ)

(۱۳) علامہ امام سبکی (متوفی ۷۵٦ھ)

(۱۴) علامہ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۹٦٦ھ)

(۱۵) امام زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ)

(۱٦) امام مناوی (متوفی ۸۹۱ھ)

(۱۷) امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)

(۱۸) صاحب سیرۃ شامی (امام محمد بن یوسف صالحی شامی، متوفی ۹۴۲ھ)

(۱۹) علامہ شہاب الدین خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ)

(۲۰) علامہ ابراہیم بیجوری (۱۲۷۷ھ)

(۲۱) علامہ ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ)

(۲۲) علامہ سلیمان جمل (متوفی ۱۲۰۴ھ)

(۲۳) علامہ ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ)

(۲۴) علامہ برہان الدین حلبی (متوفی ۱۰۴۴ھ)

(۲۵) علامہ شیخ محمد طاہر صاحب مجمع بحار الانوار (۹۸۶ھ)

(۲۶) علامہ جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۰ھ)

(۲۷) حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ)

(۲۸) مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (متوفی ۱۰۳۴ھ)

(۲۹) علامہ بحر العلوم لکھنوی (متوفی ۱۲۳۵ھ)

(۳۰) مولانا عبدالرحمن جامی (متوفی ۸۹۸ھ)

(۳۱) علامہ اسماعیل حقی صاحبِ روح البیان (متوفی ۱۱۳۷ھ)

(۳۲) مفتی عنایت احمد کاکوروی صاحبِ علم صیغہ (متوفی ۱۲۷۹ھ)

(۳۳) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ)

ان اسلاف کرام کے علاوہ عامر صاحب کے مقتدا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور ان کے بعد مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی کے اسماء بھی قابل ذکر ہیں۔

اَب تفصیل واران بزرگانِ سلف کے اس اعتقاد پر کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا تصریحات وعبارات وحوالہ جات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱ تا ۲) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] و امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ [2]

تفسیر مدارک التنزیل مؤلفہ امام نسفی، مطبوعہ مصر، جلد ۳، ص ۱۰۳ - 3 ½ 3

"وقال عثمان رضی الله تعالیٰ عنه ان الله ما اوقع ظلك على الارض لئلا يضع انسان قدمه على ذلك" - انتہیٰ

"امام نسفی فرماتے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا حضور اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ زمین پر نہ ڈالا تا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی آدمی اپنا پاؤں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ پر رکھ دے"۔

(۳ تا ۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس صحابی رضی اللہ عنہما، حضرت ذکوان تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حکیم ترمذی، ابن المبارک تابعی، ابن جوزی، ابن سبع، امام زرقانی، حافظ رزین محدث۔

امام زرقانی شرح مواہب، جلد ۴، ص ۲۲۰ پر فرماتے ہیں:

"(ولم يكن له ﷺ ظل فی شمس ولا قمر) لأنه كان نورًا، كما قال ابن سبع، وقال رزين: لغلبة أنواره. قيل وحكمة ذلك صيانته عن أن يطأ كافر على ظله"۔

"اور نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سایہ سورج میں نہ چاند میں اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور تھے جیسا کہ ابن سبع (محدث) نے کہا، اور امام رزین فرماتے ہیں کہ سایہ نہ ہونا حضور کے غلبہ انوار کی وجہ سے تھا، بعض علماء نے کہا کہ اس کی حکمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات سے بچانا ہے کہ کسی کافر کا پاؤں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ پر نہ پڑے"۔

آگے چل کر یہی امام زرقانی فرماتے ہیں:

"(رواه الترمذی الحكيم عن ذكوان) ابی صالح السمان، الزيات المدنی، أو أبی عمر والمدنی مولیٰ عائشة رضی الله

تعالیٰ عنها، وكل منهما ثقة من التابعين، فهو مرسل، لكن روى ابن المبارك، وابن جوزی، عن ابن عباس: لم يكن للنبی ﷺ ظل، ولم يقم مع الشمس قط، الا غلب ضوءه ضوء الشمس، ولم يقم مع سراج قط الا غلب ضوءه ضوء السراج (وقال ابن سبع: كان ﷺ نورا، فكان اذا مشى فى الشمس، أو القمر، لا يظهر له ظل) لأن النور، لا ظل له. (قال غيره: ويشهد له، قوله ﷺ فى دعائه) لما سأل الله تعالىٰ أن يجعل فى جميع اعضائه، وجهاته نورا ختم، بقوله: (واجعلنى نورا،) أى: والنور، لا ظل له، وبه يتم الاستشهاد۔ انتهى

"حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی اس حدیث کو ترمذی حکیم نے ذکوان سے روایت کیا، یہ ذکوان ابو صالح السمان (روغن فروش) مدنی ہیں، یا ابو عمرو مدنی جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام ہیں (ان میں سے کوئی بھی ہو بہر حال) یہ دونوں ثقہ ہیں تابعین سے، لہٰذا حدیث مرسل ہو گی (چونکہ اس میں صحابہ کا ذکر نہیں) لیکن حضرت ابن المبارک اور علامہ ابن جوزی نے حضرت ابن عباس (صحابی) رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا، اور حضور علیہ الصلوٰة والسلام سورج کے سامنے کبھی کھڑے نہ ہوئے لیکن حضور کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی اور حضور ﷺ کبھی چراغ کی روشنی کے سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے مگر حضور کی روشنی چراغ کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی، اور ابن سبع (محدّث) نے کہا کہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام نور ہیں اس لئے جب حضور ﷺ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو حضور کا سایہ ظاہر نہ ہوتا تھا کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا اور ان کے علاوہ دیگر علماء و محدثین نے فرمایا ہے کہ گواہی دیتا ہے حضور کا سایہ نہ ہونے پر حضور کا وہ قولِ مبارک جو حضور کی دُعا میں ہے، جب حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے جمیع اعضاء و جہات میں نور کردے تو آپ نے اپنی دُعا کو اس قول پر ختم فرمادیا (واجعلنی نورًا) یعنی نور کا سایہ نہیں ہوتا، اور اسی کے ساتھ یہ استشہاد تمام اور پورا ہو جاتا ہے"۔

(۱۱) ذکوان کی مذکورہ بالا روایت امام جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ، جلد ا، صفحہ ۶۸ میں نقل فرمائی۔

(۱۲) مواہب اللدنیہ، جلد ا، صفحہ ۲۸۰ پر امام قسطلانی نے یہی مضمون ارقام فرمایا۔

(۱۳) مفردات امام راغب صفحہ ۲۱۷ میں امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

"روی ان النبی ﷺ کان اذا مشیٰ لم یکن لہٗ ظلٌ"۔

"مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ چلتے تھے تو حضور ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا"۔

(۱۴) شفاء شریف، جلد ا، صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳ میں امام المحدثین قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وما ذکر من انہ لا ظل لشخصہ فی شمس ولا قمر لانہ کان نورًا"۔

"اور یہ بات جو مذکور ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اقدس کا سایہ نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے"۔

(۱۵) نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض، جلد ۳، صفحہ ۳۱۹ پر ہے :

"(لاظل شخصہ) ای جسدہ الشریف اللطیف الخ"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم شریف کا سایہ نہیں"۔

(۱۶) سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۴۲۲ پر علامہ برہان الدین حلبی فرماتے ہیں :

"وانہٗ صلی اللہ علیہ وسلم اذا مشیٰ فی الشمس اوفی القمر لا یکون لہٗ صلی اللہ علیہ وسلم ظلٌ لانہٗ کان نورًا" الخ

"بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہوتا تھا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے"۔

(۱۷) افضل القریٰ، صفحہ ۲۷ پر علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ومما یؤید انہٗ صلی اللہ علیہ وسلم صار نورًا انہٗ کان اذا مشیٰ فی الشمس والقمر لا یظہر لہٗ ظل لانہٗ لا یظہر الا للکثیف وھو صلی اللہ علیہ وسلم قد خلصہ اللہ من سائر الکثافات الجسمانیۃ وصیرہٗ نورًا صرفًا فلا یظہر لہٗ ظلٌ اصلًا" الخ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہو گئے، بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند سورج کی روشنی میں چلتے تھے تو آپ کا سایہ ظاہر نہیں ہوتا مگر کثیف کے لئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے تمام جسمانی کثافتوں سے پاک کر دیا تھا اور آپ کو نور خالص بنا دیا تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ بالکل ظاہر نہ

ہوتا تھا"۔

(۱۸) مجمع بحار الانوار، جلد ۳، صفحہ ۴۰۵ پر علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی فرماتے ہیں:

"لا یظھر لہٗ ظلٌ"

"حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا"

(۱۹) فتوحات احمدیہ شرح ہمزیہ، صفحہ ۵ پر علامہ سلیمان جمل فرماتے ہیں:

"لم یکن لہٗ ﷺ ظلٌ یظھر فی شمس ولا فی قمر"۔ انتہیٰ

"حضور ﷺ کا سایہ نہ سورج کی روشنی میں تھا نہ چاند کی روشنی میں"۔

(۲۰) کتاب تاریخ الخمیس میں علامہ حسین بن محمد دیار البکری فرماتے ہیں:

"لم یقع ظلہٗ علی الارض ولا رؤی لہٗ ظل فی شمس ولا قمرٍ"۔ الخ

"حضور ﷺ کا سایہ کبھی زمین پر نہیں پڑا نہ کبھی چاند سورج کی روشنی میں دیکھا گیا"۔

(۲۱) شرح شمائل للمناوی، مطبوعہ مصر، جلد ۱، صفحہ ۴۷ پر امام عبد الرؤف مناوی (متوفی ۸۹۱ھ) نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی طویل حدیث ارقام فرمائی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"لم یکن للنبی ﷺ ظلٌ"

"حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا"۔

(۲۲) سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۹۴ پر علامہ امام تقی الدین سبکی کا یہ شعر

منقول ہے:

لقد نزّہ الرحمن ظلك ان یریٰ

علی الارض ملقی فانطویٰ لمزیة

ترجمہ۔ "رحمٰن نے آپ کے سایہ کو زمین پر پڑا ہوا نظر آنے سے پاک کر دیا اور پائمالی سے محفوظ رکھنے کے لئے آپ کی عظمت وفضیلت کی بناء پر اسے لپیٹ دیا"۔

(۲۳) جمع الوسائل بشرح الشمائل، جلد ۱، صفحہ ۱۷۶، مطبوعہ مصر پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

"عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما لم یکن لہ ﷺ ظلٌ"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ کا سایہ نہ تھا"۔

(۲۴) سیرۃ شامی، (سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد)، مطبوعہ قاہرہ، صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴ پر ارقام فرماتے ہیں۔

لم یُرَ لرسول اللہ ﷺ ظلٌ فی شمس ولا قمر

رواہ الحکیم الترمذی، وقال معناہ لئلا یطأ علیه کافرٌ فیکون مذلةً لهٗ۔

وقال ابن سبع رحمه الله تعالیٰ: فی خصائصه: ان ظله ﷺ کان لا یقع علی الارض وانه کان نورا وکان اذا مشی فی الشمس أو القمر لا یظهر له ظل۔

(۲۵) تفسیر روح البیان، جلد ۶، صفحہ ۱۲۵ پر صاحب روح البیان، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث منقولہ امام نسفی سے ارقام فرماتے ہیں:

(۲۶) المواہب علی الشمائل، صفحہ ۳۰ پر علامہ ابراہیم بیجوری، علامہ ابن جوزی کی روایت لم یکن لہٗ ظلٌ نقل فرماتے ہیں۔

(۲۷) مثنوی شریف دفتر پنجم صفحہ ۱۹ طبع نول کشور، پر مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:

چون فنائش از فقر پیرایہ شود

او محمد وار بے سایہ شود

"جب اس کی فنا پیرایۂ فقر سے ہوگی تو وہ حضرت محمد ﷺ کی طرح بے سایہ ہوجائے گا"۔

(۲۸) شرح مثنوی شریف بحر العلوم میں علامہ بحر العلوم لکھنوی شعرِ سابق کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مصرع ثانی اشارۂ معجزہ آں سرور است کہ آں سرور سایہ نمی افتاد"

"دوسرے مصرع میں آں سرور علیہ السلام کے معجزہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ پڑتا تھا"۔

(۲۹) عزیز الفتاویٰ، جلد ہشتم، صفحہ ۲۰۲ پر مولانا عبدالرحمن جامی کے یہ شعر مرقوم ہیں:

پیغمبر ما نداشت سایہ

تا شک بدل یقیں نیفتد

یعنی ہر کس پیرو اوست

پیداست کہ پا زمین نیفتد

"ہمارے پیغمبر ﷺ سایہ نہ رکھتے تھے ہرگز یقیناً کہ دل میں شک نہ پڑے یعنی جو شخص بھی حضور ﷺ کے قدم بقدم ہے، ظاہر ہے کہ

اس کا قدم بھی زمین پر نہیں پڑتا"۔

(۳۰) "تاریخ حبیب اِلٰہ" صفحہ ۱۳۷ (۲۰۷) میں مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی صاحب "علم الصیغہ" تحریر فرماتے ہیں کہ:

"آپ کا بدن نور تھا، اسی وجہ سے آپ کا سایہ نہ تھا"۔

(۳۱) مدارج النبوۃ جلد ۱، صفحہ ۱۱۸ پر شاہ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

"چوں آنحضرت ﷺ عین نور باشد نور را سایہ نمی باشد"۔

"جب آنحضرت ﷺ عین نور ہیں تو نور کا سایہ نہیں ہوتا"۔

(۳۲) تفسیر عزیزی پارۂ عم، صفحہ ۲۱۹ پر شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"از خصوصیات کہ آنحضرت ﷺ را در بدن مبارکش دادہ بودند کہ سایہ ایشاں برزمین نمی افتاد"۔

"جو خصوصیتیں حضور ﷺ کے بدن مبارک میں عطا کی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا"۔

(۳۳) مکتوبات شریف، جلد سوم، صفحہ ۱۸۷، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ پر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ونیز در عالم شہادت سایہ شخص از شخص لطیف تر است چوں لطیف تر از وے در عالم نباشد او را سایہ چہ صورت دارد"۔

"نیز عالم شہادت میں ہر شخص کا سایہ اس کے جسم سے زیادہ لطیف ہوتا ہے، جب حضور ﷺ سے زیادہ لطیف چیز عالم میں نہیں ہے تو آپ کا سایہ کس صورت سے ہو سکتا ہے؟"۔

عامر صاحب! خدا لگتی کہنا، کیا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک مرقومہ بالا تمام صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، علماء متبحرین اور بزرگان دین کو معاذ اللہ بدعتی، گمراہ، توحید و رسالت کے مخالف عیسائی اور نصرانی سمجھتے ہیں۔

اچھا! ان سب کے بعد اپنے مقتداؤں کی طرف آئیے:

(۱) مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی "امداد السلوک"، صفحہ ۸۵، ۸۶ پر تحریر فرماتے ہیں :

"ازیں جا است کہ حق تعالیٰ در شان حبیب خود ﷺ فرمود کہ آمدہ نزدِ شما از طرف حق تعالیٰ نور و کتابِ مبین و مراد از نور ذات پاک حبیب خدا ﷺ است و نیز اُو تعالیٰ فرماید کہ اے نبی ﷺ ترا شاہد مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراجِ منیر فرستادہ ایم و منیر روشن کنندہ و نور دہندہ را گویند، پس اگر کسے را روشن کردن از انسانان محال بودے آں ذات پاک ﷺ را ہم ایں امر میسر نیامدے کہ آں ذات پاک ﷺ از جملہ اولادِ آدم علیہ السلام آند مگر آنحضرت ﷺ ذات خود را چناں مطہر فرمود کہ نور خالص گشتند و حق تعالیٰ آنجناب سلامہٗ علیہ را نور فرمود و بتواتر ثابت شد کہ آنحضرت عالی ﷺ سایہ نداشتند و ظاہر است کہ بجز نور ہمہ اجسام ظل میدارند"۔ انتہیٰ

ترجمہ۔ "اور اسی جگہ سے یہ ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی شان میں فرمایا، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا اور کتاب مبین آئی، اور نور سے مراد حبیب خدا ﷺ کی ذات پاک ہے، نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو شاہد

ومبشرو نذیر و داعی الی اللہ تعالیٰ، اور سراج منیر بنا کر بھیجا ہے، اور "منیر" روشن کرنے والے اور نور دینے والے کو کہتے ہیں، پس اگر انسانوں میں سے کسی کو روشن کرنا محال ہوتا تو آنحضرت ﷺ کی ذات پاک کے لئے یہ امر میسر نہ ہوتا کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک بھی جملہ اولاد آدم علیہ السلام سے ہے مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات کو ایسا مطہر فرمالیا کہ نور خالص ہو گئے اور حق تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور فرمایا اور تواتر سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ سایہ نہ رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ نور کے سوا تمام اجسام سایہ رکھتے ہیں"۔

(۲) نیز آپ کے مولوی اشرف علی صاحب تھانوی، میلاد النبی، جلد ۴، المریع فی الربیع، صفحہ ۲۷۵ پر رقمطراز ہیں:

"یہ جو مشہور ہے کہ سایہ نہ تھا حضور ﷺ کا تو یہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، گو وہ ضعیف ہیں مگر فضائل میں متمسک بہ ہو سکتی ہیں"۔

(۳) مقتداؤں سے فارغ ہو کر ذرا مفتی اعظم دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرماتے جائیے، بعد کو چاہے اس کی تردید کردیں لیکن سردست تو ایک نظر دیکھ ہی لیجئے، وہ عزیز الفتاویٰ، جلد ہشتم، صفحہ ۲۰۲ پر تحریر فرماتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کا سایہ نہ تھا

سوال ۱۴۶۴

"وہ کون سی حدیث ہے جس میں یہ ہے کہ رسول مقبول ﷺ کا سایہ زمین

پر واقع نہیں ہوتا تھا"۔

الجواب۔ "امام سیوطی نے خصائص کبریٰ میں آنحضرت ﷺ کا سایہ زمین پر واقع نہ ہونے کے بارے میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے، اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ ﷺ لم یکن یُریٰ لہٗ ظل فی الشمس والقمر الخ اور تواریخ حبیب الٰہ میں مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آپ کا بدن نور تھا اسی وجہ سے آپ کا سایہ نہ تھا۔ الخ.....

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ عزیز الرحمن عفی عنہ

کیوں عامر صاحب! کیا کہتے ہیں آپ؟ کیا ان سب کو وہم کی بیماری ہو گئی تھی؟ یا ان کا قدرتی سسٹم بگڑ گیا تھا، یا یہ سب لوگ شدت بخار میں بڑبڑا رہے ہیں۔

ہاں جناب! کچھ پتہ چلا آپ کو؟ آپ کے دونوں پیشواؤں گنگوہی وتھانوی صاحبان نے مل کر آپ کا بیڑا غرق فرمادیا۔

سایہ کے مسئلہ میں آپ نے اپنی بحث کی بنیادیں قائم کرنے کے لئے جو پاپڑ بیلے تھے وہ آپ کو یاد ہی ہوں گے، تو سنئے حضور! آپ کی وہ سب محنت اکارت ہوگئی، آپ کے ان دونوں بزرگوں نے انتہائی بے دردی کے ساتھ آپ کی مستحکم بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا، "ثبوت ظل" کی پوری عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، پریشانی میں شاید آپ کو یاد نہیں آرہا ہے، لیجئے میں عرض کرتا ہوں، سایہ کی بحث میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل چار بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا۔

(۱) بشری کثافتوں سے حضور ﷺ پاک نہ تھے۔

(۲) حضور ﷺ کا ایسا نورِ خالص ہونا جس کا سایہ نہ ہو، باطل ہے، اگر

آپ کے لئے کہیں لفظ نور آیا ہے تو وہ بطورِ استعارہ ہے۔

(۳) حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونا غلط افواہ ہے۔

(۴) سایہ نہ ہونے کی حدیثیں جھوٹی ہیں اور قابل تمسک نہیں۔

آپ کے ان اصول اربعہ کے ردّ وابطال میں جو کچھ ہم عرض کریں گے ان شاء اللہ وہ تو آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کر ہی لیں گے، سرِ دست اتنا دیکھتے چلئے کہ آپ کے پہلے تین بنیادی نکتوں کو تو گنگوہی صاحب نے اُڑا دیا اور چوتھے کا صفایا تھانوی صاحب کر گئے۔

گنگوہی صاحب کی منقولہ بالا عبارت میں ابھی آپ نے پڑھا کہ:

(۱) حضور ﷺ تمام کثافتوں سے مطہر ہو کر نورِ خالص ہو گئے۔

(۲) قرآن کریم میں قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ اور سِرَاجًا مُّنِیْرًا دونوں جگہ نور و منیر سے حضور ﷺ ہی مراد ہیں اور حضور ﷺ ایسے "نور و منیر" ہیں جس کا سایہ نہ ہو۔

(۳) حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونا غلط افواہ نہیں بلکہ تواتر سے ثابت ہے۔

آپ کے حضرت گنگوہی صاحب کے ان تینوں ارشادات نے آپ کے پہلے تینوں اصول کی پوری طرح بیخ کنی فرما دی اور حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کو تواتر سے ثابت شدہ کہنے کے بعد گنگوہی صاحب کا آخری جملہ "وظاہر است کہ بجز نور ہمہ اجسام ظل میدارند" (ظاہر ہے کہ نور کے سوا ہر جسم سایہ رکھتا ہے)۔

استعارہ کی بحث میں حرف آخر ہے، جس نے آپ کی استعارہ والی بحث کی تمام کدو کاوش کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

اَب آئیے تھانوی صاحب کی طرف، انہوں نے آپ کے چوتھے بنیادی اصول کا خاتمہ کر دیا، وہ فرماتے ہیں کہ:

"حضور کا سایہ نہ ہونا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، گو وہ ضعیف ہیں، مگر فضائل میں متمسک بہ ہوسکتی ہیں"۔

کہئے عامر صاحب! تھانوی صاحب نے آپ کا بیڑا غرق فرمانے میں کوئی کسر باقی رکھی، جن روایتوں کو جھوٹی کہتے کہتے آپ کی زبان سوکھ گئی، تھانوی صاحب ان کو متمسک بہ کہہ رہے ہیں۔

کیا فرماتے ہیں آپ؟ آپ سچے یا تھانوی صاحب؟

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

اَب عامر صاحب کو یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ سایہ کی اس پوری بحث میں جو انہوں نے ہم پر طعن و تشنیع کی بھرمار کی ہے اور بار بار "منکرینِ ظل" کہہ کر مذاق اُڑایا ہے، بلکہ بدعتی، گمراہ، یہودی، نصرانی تک کہنے سے نہیں چوکے، یہ سب کچھ انہوں نے ہمیں نہیں کہا، ہم تو محض ناقل ہیں، بلکہ ان اعلامِ اُمت کو کہا ہے جن کی طویل فہرست ہم ابھی پیش کر چکے ہیں، اور ان کے علاوہ اپنے مقتداؤں جناب گنگوہی و تھانوی صاحبان کی تواضع فرمائی ہے، جن کے ارشادات سایہ کے مسئلہ میں عامر صاحب کے خلاف ہم نے ابھی نقل کئے ہیں، آئندہ چل کر سب و شتم کے ہر مرحلہ پر عامر صاحب کو یہ امر پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ہاں عامر صاحب! آپ نے فرمایا تھا!

"ہزاروں ہزار علماء وائمہ میں شاید گنے چنے ایسے نکلیں جنہوں نے ......رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کو واقعہ گمان کر لیا ہو، باقی جملہ اکابرین کے عقیدہ ومسلک کی فہرست اس عقیدہ سے یکسر خالی ہے"۔

جن گنے چنے علماء وائمہ نے رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونا (بقول آپ کے) گمان کر لیا ہو، ہم نے تو ان کی طویل فہرست حوالجات کے ساتھ پیش کر دی، اَب

باقی جملہ اکابرین کی فہرست جو اس عقیدہ سے یکسر خالی ہے آپ پیش کردیں۔ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ۔

کتاب وسنت اور علم واستدلال کے الفاظ کو نمائشی طور پر استعمال کرنے والو! اگر اپنے دعوے میں اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہو تو ایک دلیل پیش کرکے دکھاؤ جس سے رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کا تاریک سایہ ثابت ہو جائے، یا اکابر اُمت سلف صالحین میں سے کسی ایک کا قول پیش کردو، تو ہم جانیں کہ واقعی تم اپنے زعم میں سچے ہو، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں ؎

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

شاید آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ زمین پر سایہ پڑنا کوئی تعجب کی بات نہیں، جسے روایت کیا جانا ضروری ہو، البتہ کسی انسان کا سایہ نہ پڑنا ضرور تعجب کی بات ہے، جس کا روایت کیا جانا ضروری ہے۔

لٰہذا حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونے کی روایت کا نہ ہونا سایہ نہ ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ سایہ نہ ہونے کی روایاتِ صحیحہ کا نہ ہونا سایہ ہونے کی دلیل ہے۔

میں عرض کروں گا کہ جب واقعہ میں کسی کے پاس دلیل نہ ہو تو پھر اُسے ایسی دلیلیں سوجھا کرتی ہیں۔

اِن عقل کے اندھوں کو اتنا نہیں سوجھتا کہ ٹوٹے پھوٹے طنزیہ فقروں سے چند حواریوں کو اُلو بنایا جاسکتا ہے مگر ساری دنیا اس طرح بے وقوف نہیں بن سکتی۔

میں پوچھتا ہوں کہ جس طرح "سایہ" جسمانی اوصاف سے ہے اسی طرح بیماری تندرستی، بھوک، پیاس، پسینہ، موئے مبارک، قدوقامت، حلیۂ اقدس وغیرہ امور بھی جسمانی لوازم سے ہیں یا نہیں؟ پھر یہ کہ جس طرح سایہ تعجب کا باعث نہیں، ایسے ہی تندرستی بیماری، پسینہ، موئے مبارک، قدوقامت وغیرہ بے شمار اوصاف بھی

تعجب کے پہلو سے خالی ہیں یا نہیں؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جسم اقدس کے باقی تمام اوصاف مروی ہوں اور سایہ مروی نہ ہو۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایسی صورت میں سایہ مروی نہ ہونے کو سایہ نہ ہونے کی دلیل مان لیا جائے تو بعید از قیاس نہ ہوگا، رہا یہ امر کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ نہ ہوتا تو اس کا نہ ہونا صحیح روایت کے ساتھ ضرور مروی ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ صحتِ روایت کی ذمہ داری سایہ نہ ہونے کے واقعہ پر تو کسی طرح عائد نہیں ہو سکتی، اس کا تعلق تو محض روایت سے ہے، ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صحتِ روایت کے بغیر سایہ نہ ہونے کا اعتقاد کیسے صحیح ہوگا؟ تو اس کا جواب بارہا عرض کر چکا ہوں، اور تھانوی صاحب بھی ارقام فرما گئے ہیں کہ باب فضائل میں ضعاف بھی متمسک بہ ہیں، لہٰذا صحت کی قید بے معنی ہے۔

مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کرتے ہوئے "اہل سنت" کا لفظ میں نے لکھ دیا تھا جس پر عامر صاحب بہت بگڑے ہیں اور اپنی عادت کے مطابق طعن و تشنیع کی بھر مار کر دی ہے، چنانچہ ہم لوگوں کو اہل بدعت اور اپنے آپ کو حقیقی اہل سنت کہا ہے اور ساتھ ہی اہل حق کا مذاق اُڑاتے ہوئے کئی پھبتیاں کسی ہیں۔

حقائق و معانی کی دنیا سے دُور، الفاظ کی دنیا میں رہنے والے طنز و تمسخر سے مرعوب اور برافروختہ ہو سکتے ہیں، لیکن مطالب و معارف سے سروکار رکھنے والے دل و دماغ ایسی اوچھی باتوں سے رعب میں نہیں آیا کرتے۔

عامر صاحب! جن بدعات مزعومہ کی بنا پر آپ ہمیں مطعون کر رہے ہیں، ذرا اپنے اکابر کی کتابیں اُٹھا کر دیکھیں وہ سب کی سب آپ کو وہاں نظر آئیں گی اور ان کے علاوہ ایسے امور بھی ملیں گے جو فی الواقع بدعات مزعومہ ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ اپنے حقیقی اہل سنت کے سرگروہ مولانا رشید احمد

صاحب گنگوہی اور اپنے حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے پیرو مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ﷫ کے ملفوظات یعنی شمائم امدادیہ مصدقہ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور فتاویٰ رشیدیہ کو سامنے رکھ لیجئے اور "چشم بددور دین مردہ پرستی کے ان شہ سواروں سے قبوری شریعت" کے مسائل جانئے، وہ فرماتے ہیں :

۱۔ بزرگوں کی نذر ونیاز جائز ہے۔(شمائم امدادیہ، صفحہ ۱۳۵)

۲۔ عرس کی تاریخ مقرر کرنا درست ہے۔(شمائم امدادیہ، صفحہ ۱۳۰)

۳۔ (زاغ معروفہ) مشہور کوا کھانا ثواب ہے۔

(فتاویٰ رشیدیہ، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰)

۴۔ صحیح بخاری کا ختم پڑھنا جائز ہے۔(فتاویٰ رشیدیہ، جلد اوّل، صفحہ ۸۴)

یہ تو عملیات کا ایک مختصر نمونہ ہے، اس کے بعد چمنِ اعتقادیات کی سیر کیجئے، اسی شمائم کے صفحہ ۷۱ پر مرقوم ہے :

"جب اس مراقبہ میں "ہمہ از اوست" سے اغماض نظر کر کے "ہمہ اوست" کو پیش نظر رکھے تو اس استغراق میں فیض باطنی وجذبہ غیبی مدد فرماتا ہے"۔

کہئے عامر صاحب! کیسی رہی ؟ یہ وہی "ہمہ اوست" ہے نہ جسے آپ کے مودودی صاحب "جاہلیت اور اسلام" کے ص ۲۴ پر مشرکانہ نظریہ لکھ چکے ہیں؟

غالباً اس عبارت میں کوئی بات عقیدۂ توحید ورسالت کے خلاف نہ ہوگی؟

اور لیجئے! آپ کے حضرت مولانا قاسم العلوم والخیرات صاحب "آب حیات" میں فرماتے ہیں:

"حیاتِ نبوی بوجہ ذاتیت قابلِ زوال نہیں"۔

(آب حیات، طبع مطبع قدیمی دہلی، ص ۱۰۷)

کیوں جناب؟ یہاں تو کوئی چور دروازہ آپ کو نظر نہ آیا ہوگا

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

عامر صاحب فرماتے ہیں:

"گنے چنے ائمہ وعلمائے دین کے سوا باقی جملہ اکابرین کے عقیدے ومسلک کی فہرست اس عقیدے سے یکسر خالی ہے"۔

گویا عامر صاحب نے تمام اکابر اُمت کے جملہ عقائد اور پورے مسلک کی مکمل فہرست مرتب کر کے ہمارے سامنے رکھ دی ہے اور بڑے فخریہ انداز سے کہہ رہے ہیں کہ دیکھئے اس فہرست میں جملہ اکابر کے تمام عقائد درج ہیں، لیکن حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا عقیدہ اس میں کہیں موجود نہیں۔

بجا فرمایا! توہمات کی تاریک وادیوں میں گھومنے والے اسی طرح بھٹکتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کی زبان میں تحکم اور ڈھٹائی کو علم واستدلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عامر صاحب! اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جن علماء نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا واضح بیان نہیں کیا وہ حضور ﷺ کے لئے تاریک سایہ مانتے ہیں تو ایسی سمجھ پر آپ کو اپنا سر پیٹ لینا چاہئے، کیونکہ آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی کے اوائل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تاریک سایہ سے پاک ہونے کا مسئلہ اکابر علماء محدثین وائمہ دین نے اپنی کتابوں میں لکھنا شروع کیا، جیسے حکیم ترمذی متوفی ۲۵۵ھ اور سند المحدثین علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ اور ان کے علاوہ ہر دَور میں اکابر اُمت حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کا عقیدہ اپنی مستند اور مشہور تصانیفِ جلیلہ میں برابر لکھتے چلے آئے ہیں، حتیٰ کہ ہماری اس چودھویں صدی میں اسی نقلِ مسلسل کے ساتھ یہ عقیدہ منقول ہو کر ہم تک پہنچا ہے، جیسا کہ پچھلے

صفحات میں عبارات وحوالجات اور مکمل دلائل کے ساتھ اکابر اُمت کی وہ طویل فہرست ہم اپنے ناظرین کرام کے سامنے پیش کر چکے ہیں، ایسی صورت میں کسی دشمنِ دین ودانش کا آنکھیں بند کر کے یہ کہہ دینا کہ رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کا عقیدہ بدعت وگمراہی، توحید ورسالت کے منافی ہے، بلکہ حضور کی الوہیت کے لئے (معاذ اللہ) چور دروازہ کھولنا ہے، کتنی بڑی جسارت اور دین ودیانت کے ساتھ عداوت وبغاوت ہے۔

بفرضِ محال اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ عقیدہ (معاذ اللہ) ایسا ہی ہے، جیسا کہ آپ نے بیان کیا تو پھر یہ فرمائیے کہ ایسے جاہلانہ اور مشرکانہ عقیدے کے لئے کسی مسلمان کے دل ودماغ کے کسی گوشہ میں جگہ مل سکتی ہے؟ جب نہیں مل سکتی تو ان تمام اکابرین دین وملت کے دل ودماغ میں یہ عقیدہ اسلامی ہونے کی حیثیت سے کیونکر قائم رہا؟ اگر ان کی غلطی پر محمول کیا جائے تو چودہ سو برس تک کسی کو اس غلطی کا احساس نہ ہوا؟ جن لوگوں کے عقائد کی فہرست عدمِ ظل کے عقیدہ سے یکسر خالی تھی کم از کم ان کا تو فرضِ اولین تھا کہ وہ اس گمراہ کن عقیدہ کو جڑ، بنیاد سے اُکھاڑ کر پھینک دیتے اور اسلام میں حضور ﷺ کی الوہیت کے اس چور دروازہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر جاتے بلکہ پوری قوت کے ساتھ اس عقیدہ کی تردید کر دیتے، جیسا کہ ہمیشہ عقائد باطلہ کا ردّ بلیغ کرتے رہے، اس چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں عامر صاحب کے سوا...... آج تک کسی نے حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کے اعتقاد کو ضلالت وگمراہی نہیں کہا نہ کسی نے اس عقیدے کا ابطال کیا، اس سے ثابت ہوا کہ سکوت اختیار کرنے والے حضرات بھی حضور کے سایہ نہ ہونے کے اعتقاد کو ضلالت وجہالت نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اسے حق سمجھ کر خاموش رہے ہیں ایسے موقعوں پر اہل حق کی خاموشی بھی دلیلِ رضا ہوتی ہے۔

شاید کوئی بول اُٹھے کہ جب حضور کا سایہ نہ ہونے کی روایتیں موضوع تھیں تو کسی کو بولنے کی ضرورت ہی نہ تھی، تو میں کہوں گا کہ وہ روایتیں جیسی پہلے تھیں آج بھی ویسی ہی ہیں تو عامر صاحب یا ان کے کسی ہم نوا کو اس غوغا آرائی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ اور اس بے وقت کی بے سُری راگنی سے کیا حاصل؟ رہا روایات کا موضوع یا ضعیف ہونا، تو اس کے متعلق تو آپ کے حکیم الامت تھانوی صاحب کا حتمی فیصلہ پہلے ہی نقل کیا جاچکا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ روایات موضوع نہیں، ہاں ضعیف ہیں، مگر باب فضائل میں ان سے استدلال کیا جاسکتا ہے، اگر آپ کو ایسی ہی ضد اور جسم اقدس کی نورانیت سے بغض وعناد ہے تو عثمانی ہو کر سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت کو رڈ کر دیجئے، حضرت عبداللہ ابن عباس، ذکوان، ابن مبارک، ابن جوزی رحمہم اللہ کی روایتوں کو پسِ پشت ڈال دیجئے۔

لیکن اتنا بتا دیجئے کہ دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک اُمت محمدیہ ﷺ نے حضور پر نور کے جسم اقدس کے سایہ نہ ہونے کے مسئلے کو مانا اور تسلیم کیا یا نہیں؟ اگر آپ انکار کریں تو منقولہ بالا فہرست آپ پر حجت ہوگی، اور اگر اقرار کریں تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ اکابر علما اُمت کی اہم جماعت نے آنحضرت ﷺ کو سایہ سے اعتقاداً اور قولاً پاک و مبرا مانا ہے اور دوسری جماعت جو خاموش رہی اس کی خاموشی دلیل رضا ہے، فثبت المدعا بالاتفاق۔

اَب اگر کسی میں کچھ ہمت ہے تو ایک دلیل ہی پیش کرے جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ فلاں موقع پر فلاں مسلمہ فریقین ہستی نے حضور کا سایہ نہ ماننے والوں پر انکار کیا یا خود حضور کے لئے سایہ کا قول کیا؟ جب ایسی کوئی ایک دلیل بھی نہیں پیش کی جاسکتی تو لازم ہے کہ حضور اکرم نور مجسم ﷺ کے جسم انور کا سایہ نہ ہونے کو اُمت محمدیہ کا اجماعی اور اتفاقی مسئلہ تسلیم کرلیں جیسا کہ آپ کے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

نے حضور کے سایہ نہ ہونے کو تواتر سے ثابت مانا ہے، ورنہ یاد رکھئے عامر صاحب کہ آپ اپنی کور باطنی اور تاریک خیالی کے ظلمت کدہ میں ٹکریں کھاتے رہیں گے اور اس دائرہ ضلالت سے باہر نکلنے کے لئے کوئی راہ اور روشنی آپ کو نہ مل سکے گی۔ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعَذَابِ۔

حضور نبی کریم ﷺ کے سایہ کے مسئلہ میں تمہید سے فارغ ہو کر عامر صاحب نے محلِ نزاع نقل کرتے ہوئے ارقام فرمایا :

سب سے پہلے "محلِ نزاع" کو کاظمی صاحب کے الفاظ میں دیکھ لیجئے:

"اہلسنت" (؟) کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بشری جسم اقدس کو ایسا لطیف ونظیف اور پاکیزہ ومطہر کر دیا تھا کہ اس میں کسی قسم کی عنصری اور مادی کثافت باقی نہ رہی تھی، اس لئے چاند، سورج، چراغ وغیرہ کی روشنی میں جب حضور ﷺ تشریف فرما ہوتے تھے تو جسم اقدس اس روشنی کے لئے حائل نہ ہوتا تھا، اور دیگر اجسام کثیفہ کی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم پاک کا کوئی تاریک سایہ نہ پڑتا تھا"۔

(ماہنامہ تجلی، دیوبند، بابت جون ۱۹۶۰ء، ص ۴۷)

اس کے بعد میری اسی منقولہ عبارت پر تعاقب کرتے ہوئے عامر صاحب رقمطراز ہیں کہ:

"سلیم الطبع اور عدل پسند حضرات کے لئے تو اس نام نہاد مسلک کی لغویت کسی لمبی گفتگو کی محتاج نہیں، اِن سالکین سے کوئی پوچھے، بول وبراز، منی، تھوک وغیرہ عنصری اور مادی کثافتیں ہیں یا نورانی

لطافتیں؟ کیا آپ یوں بھی کہیں گے کہ رسول اللہ ﷺ حوائج ضروریہ سے مبرا تھے؟ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے، پھر یہ کیابات ہوئی کہ:

"کسی قسم کی عنصری اور مادی کثافت باقی نہیں رہی تھی"۔

"سلیم الطبع" کی ترکیب میں اگر آپ نے لفظ "سلیم" "سلمته الحیة" سے اخذ فرمایا ہے یا بطور "تفاؤل بالسلامة" لکھا ہے تو بالکل صحیح ہے، یقیناً لدیغ الطبع لوگوں کے نزدیک اس نورانی، پاکیزہ اور مقدس مسلک کی لغویت کسی لمبی گفتگو کی محتاج نہیں، لیکن جو لوگ گمراہی اور بدعقیدگی کے سانپوں کے ڈسے ہوئے نہیں اور ان کے طبائع اس قسم کے ناپاک زہریلے اثرات سے پاک ہیں وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ حضور نبی اکرم نور مجسم ﷺ ہر قسم کی کثافتوں اور نجاستوں سے قطعاً پاک اور مبرا ہیں۔

عامر صاحب نے ہمارے مسلک کو صرف ایک بنیادی نقطہ پر لغو قرار دیا ہے، اور وہ یہ کہ حضور ﷺ مادی کثافتوں اور بشری نجاستوں سے پاک نہ تھے اور اس دعوے کو انہوں نے بول و براز، تھوک و منی وغیرہ سے ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے، اور جس طرح فقیر نے حضور ﷺ کی نورانیت ثابت کر کے سایہ نہ ہونے کو لوازمات سے قرار دیا تھا، اسی طرح عامر صاحب حضور ﷺ کی بشریت مطہرہ کو سامنے رکھ کر سایہ ہونے کو لوازم بشریت سے قرار دے رہے ہیں، لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ سایہ ہونا مطلق بشریت کے لوازم سے نہیں بلکہ کثیف بشریت کے لوازم سے ہے، عامر صاحب نے حضور ﷺ کی بشریت منورہ کو معاذ اللہ اپنی گندی، کثیف اور غلیظ بشریت پر قیاس کرلیا، حالانکہ حضور ﷺ کی ذات مقدسہ باوجود اتصاف بالبشریہ کے جمیع عیوب ونقائص بشریت اور تمام مادی کثافتوں اور غلاظتوں سے پاک ہے، تاریک سایہ کثافت کے بغیر نہیں ہوتا، جب حضور علیہ الصلوۃ والسلام

کثافت سے پاک ہیں تو تاریک سایہ سے بھی پاک ہیں، رہے حوائج بشریہ وفضلات مقدسہ تو یاد رکھئے حضور ﷺ کی ہر حاجت وضرورت کثافت سے پاک تھی، حتیٰ کہ فضلات شریفہ بھی طیب وطاہر، لطیف ونظیف تھے، اور بدن اقدس اپنی پاکی وطہارت، لطافت ونظافت میں بے مثل و بے نظیر تھا۔

حوائج بشریہ ضروریہ سے ہم حضور سیّد عالم ﷺ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتے، مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ حضور کی ذات مقدسہ میں عنصری اور مادی کثافتیں بھی موجود تھیں، ہر ایک کے حوائج وضروریات اس کے حسب حال ہوتے ہیں،، کثیف اور غلیظ موجودات کے حوائج وضروریات کثیف وغلیظ ہوں گے اور جس وجود اقدس کو اللہ تعالیٰ نے کثافت وغلاظت سے پاک کر کے لطیف ونظیف بنا دیا ہو اس کے حوائج ضروریہ بھی کثافت وغلاظت سے پاک اور لطیف ونظیف ہوں گے۔

خلقتِ محمدی بے نظیر ہے

چونکہ حضور سیّد عالم ﷺ کی خلقت تمام کائنات میں کسی سے مناسبت نہیں رکھتی اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوائج وضروریات کو بھی کسی کے حوائج وضروریات سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں، دیکھئے حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مکتوبات شریف، جلد سوم، مکتوب صد و دوم، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ص ۱۸۷ میں فرماتے ہیں:

"باید دانست کہ خلق محمدی دررنگ خلق سائر افراد انسانی نیست بلکہ بخلق ہیچ فردے از افراد عالم مناسبت ندارد کہ اُو ﷺ با وجود منشأ عنصری از نور حق جل وعلی مخلوق گشتہ است کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام خلقت من نور اللہ"۔

"جاننا چاہئے کہ پیدائش محمدی دیگر افراد انسانی کے پیدائش کے

رنگ میں نہیں ہے بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلقت افراد عالم میں سے کسی فرد کی خلقت کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "خلقت من نور اللہ" میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا"۔

عامر صاحب ذرا بتائیں کہ مجدد صاحب کے اس بیان میں کہیں عیسائیت کے لئے کوئی چور دروازہ تو نظر نہیں آتا۔

خلقت محمدی کا لطیف ونظیف ہونا

اے کاش یہ لوگ حضور ﷺ کے لئے مادی کثافتیں ثابت کرنے سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھ لیتے کہ عام انسان نجاست وغلاظت میں لتھڑے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور انہیں پیدائش کے بعد غسل دے کر صاف ستھرا کیا جاتا ہے، مگر حضور نبی کریم ﷺ پاک پیدا ہوئے، صرف یہی نہیں بلکہ حضور ﷺ پیدائشی طور پر بشریت کی کثافتوں سے پاک تھے، حضور ﷺ کی ولادت باسعادت نور وضیاء کے ساتھ ہوئی اور اس روشنی میں شام کے محلات چمکنے لگے، ملا علی قاری شرح شفاء میں فرماتے ہیں:

"وروی عن أمه آمنة انها قالت ولدته نظيفا ای نقيا ما به قذر ای وسخ ودرن كذا رواه ابن سعد فی طبقاته وروی انه ولدته أمه بغير دم ولا وجع"۔ انتہی

(شرح شفاء لعلی القاری، جلد ۱، ص ۱۶۵، مطبوعہ مصر)

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ حضرت آمنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور کو صاف ستھرا اور پاکیزہ جنا، حضور کے ساتھ کوئی گندگی اور میل وغیرہ نہ تھا، اسی طرح اس حدیث کو ابن سعد نے طبقات میں روایت کیا اور یہ بھی مروی ہے کہ

حضور کی والدہ نے حضور کو بلا خون اور بغیر کسی درد کے جنا"۔ [1]

حقیقت محمدی کی نورانیت

اور فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

"ومما ظهر من علامات نبوته عند مولده وبعده ما اخرجه الطبرانی عن عثمان بن ابی العاص الثقفی عن امه انها حضرت آمنة ام النبی ﷺ فلما ضربها المخاض قالت فجعلت انظر الی النجوم تدلی حتی اقول لتقعن علی فلما ولدت خرج منها نور اضاء له البيت والدار، وقال سمعت رسول الله ﷺ يقول انی عبد الله وخاتم النبيين وان آدم لمنجدل فی طينته وسا خبر كم عن ذلك انا دعوة ابی ابراهيم وبشارة عيسیٰ ورويا امی التی رأت و كذلك امهات النبيين يرين وان ام رسول الله ﷺ رأت حين وضعته نوراً اضاءت له قصور الشام اخرجه احمد وصححه ابن حبان والحاكم فی حديث ابی امامة وعند احمد نحوه واخرج ابن اسحاق عن ثور بن يزيد عن خالد بن معدان عن اصحاب رسول الله ﷺ نحوه وقالت اضاءت له بصری من ارض الشام"۔

(فتح الباری، جلد ۶، ص ۴۵۴، ۴۵۵)

"حضور ﷺ کے وہ علامات نبوت جو ولادت مقدسہ کے وقت اور

---

[1] عین وقت ولادت شریفہ کوئی درد نہیں ہوا، البتہ اس سے پہلے (مخاض) دردِ زہ کی نفی اس سے لازم نہیں آتی۔

اس کے بعد ظاہر ہوئے ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا اخراج طبرانی نے کیا ہے، عثمان بن ابی العاص ثقفی نے اپنی والدہ سے روایت کیا، وہ فرماتی ہیں کہ عند الولادت میں حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر تھی، جب انہیں درِدِزہ لاحق ہوا تو میں نے ستاروں کو دیکھا اس قدر نزدیک ہو گئے کہ گویا مجھ پر گرے پڑتے تھے، جب حضرت آمنہ نے حضور کو جنا تو حضرت آمنہ سے ایک ایسا نور نکلا کہ جس سے سارا گھر منور ہو گیا اور ساری حویلی روشن ہو گئی، اس حدیث کی شاہد حضرت عرباض بن ساریہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا میں اس وقت خاتم النبیین تھا جب آدم علیہ السلام اپنے خمیر میں تھے اور اس کے متعلق میں تمہیں بتاؤں گا (اور وہ یہ ہے) بے شک میں ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور اپنی والدہ ماجدہ کی وہ خواب ہوں جو انہوں نے دیکھی تھی اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی ماؤں کو خوابیں دکھائی جاتی ہیں اور حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنتے وقت ایک ایسا نور دیکھا تھا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے تھے، اس حدیث کا امام احمد نے اخراج کیا اور ابن حبان و حاکم نے اس کو صحیح کہا اور امام احمد کے نزدیک ابو امامہ کی حدیث اسی کی مانند ہے اور ابو اسحاق نے ثور بن یزید سے بروایت خالد بن معدان حضور ﷺ کے اصحاب سے بھی اسی کی مانند روایت کیا اور اس روایت میں ہے کہ اس نور کی وجہ سے ارض شام کا شہر بُصریٰ روشن ہو گیا"۔

اور ابن کثیر میں اسی واقعہ کی روایت میں یہ مضمون بھی وارد ہوا کہ ولادت باسعادت کے وقت جو نور محمدی چمکا اس کی روشنی میں ملک شام کے شہر بُصری کے اونٹوں کی گردنیں چمکنے لگیں۔

چونکہ حضور ﷺ کی خلقت بے نظیر لطیف و نظیف اور نورانی ہے، کسی قسم کی غلاظت و کثافت جسم اقدس میں نہیں پائی جاتی اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پسینۂ مبارک بلکہ تمام جسم اقدس حتیٰ کہ خون مبارک بھی انتہائی خوشبودار تھا۔

جسم اقدس، پسینہ مبارک اور خون مبارک کا خوشبودار ہونا

حضور ﷺ کے جسم اقدس کا مادی کثافتوں سے پاک ہونا ان احادیث شریفہ سے بھی روز روشن کی طرح واضح ہے جن میں وارد ہوا کہ حضور کی خوشبو کا مقابلہ دنیا کی کوئی خوشبو نہ کر سکتی تھی، حضرت انس فرماتے ہیں:

(۱) "ماشممت عنبرا قط ولا مسکا ولا شیئا اطیب من ریح رسول اللہ ﷺ"۔ (مسلم شریف، جلد ۲، ص ۲۵۷)

"میں نے کوئی مشک و عنبر یا کوئی شئے حضور ﷺ کی خوشبو مبارک جیسی نہیں سونگھی"۔

(۲) "اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ جب حضور ﷺ مدینہ کی راہوں میں سے کسی راہ سے گزرتے تو اہل مدینہ ان راہوں میں مہکتی ہوئی خوشبو پاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس راستے سے رسول اللہ ﷺ گزرے ہیں، اس حدیث کو ابو یعلی اور بزار نے صحیح سند سے روایت کیا"۔

(مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۲)

(۳) حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان

کے رخسار کو چھوا تو انہوں نے حضور کے دست اقدس کی ٹھنڈک محسوس کی اور ایسی تیز خوشبو پائی گویا کہ حضور ﷺ نے عطر فروش کے عطر کے ڈبے سے اپنے مبارک ہاتھ کو نکالا ہے اور ان کے غیر نے کہا کہ حضور ﷺ خوشبو لگائیں یا نہ لگائیں بہر صورت حضور سے مصافحہ کرنے والا اپنے ہاتھ میں تمام دن حضور ﷺ کے دست مبارک کی خوشبو پاتا تھا اور حضور ﷺ کسی بچے کے سر پر اپنا دست مبارک رکھ دیتے تھے تو حضور ﷺ کی خوشبو کی وجہ سے دوسرے بچوں میں پہچان لیا جاتا تھا"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۳)

(۴) "حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے اور دوپہر کو آرام فرمایا، سوتے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پسینہ آرہا تھا، میری والدہ ایک شیشی لے آئیں اور اس میں حضور ﷺ کے پسینہ مبارک کو جمع کیا، حضور ﷺ بیدار ہو گئے اور فرمایا کہ اے اُم سلیم یہ کیا کر رہی ہو؟ میری والدہ نے عرض کیا حضور! یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اسے اپنی خوشبو بنا رہے ہیں اور یہ سب خوشبوؤں سے اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے"۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔

(مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۳)

(۵) امام قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں:

"واما طيب ريحه ﷺ وعرقه وفضلاته فقد كانت الرائحة الطيبة صفته ﷺ وان لم يمس طيبا"۔

(مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۳)

ترجمہ۔ "بہر نوع حضور ﷺ کی ریح مبارک، پسینہ مقدس اور حضور

کے فضلات شریفہ کی مہکتی ہوئی خوشبوئیں سب حضور کی ذات مقدسہ کی صفات تھیں، خواہ حضور خوشبو لگائیں یا نہ لگائیں"۔

(۶) "ابو یعلی اور طبرانی نے ایک شخص کا قصہ روایت کیا کہ اس کے پاس کچھ نہ تھا اور اسے اپنی بیٹی کی شادی کرنا تھی، اُس نے حضور ﷺ سے استعانت کی، حضور نے اس سے ایک شیشی منگائی اور اس میں اپنا مبارک پسینہ بھر کر اُسے دے دیا اور فرمایا اپنی لڑکی سے کہو کہ وہ اپنے بدن پر میرے پسینہ کو بطور خوشبو استعمال کرے، جب وہ لڑکی حضور کے مبارک پسینہ کو بطور خوشبو استعمال کرتی تو تمام اہل مدینہ اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتے تھے اس لئے لوگوں نے اس گھر کا نام بیت المطیبین خوشبو والوں کا گھر رکھ دیا"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ا، ص ۲۸۳)

(۷) "وروی انه كان يتبرك ببوله ودمه ﷺ"۔

"روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پیشاب اور خون مبارک سے برکت حاصل کی جاتی تھی"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ا، ص ۲۸۴)

(۸) "وفی کتاب الجوهر المكنون فی ذكر القبائل والبطون: أنه لما شرب، ای عبد الله ابن الزبير، دمه تضوع فمه مسگا، وبقيت رائحته موجودة فی فمه الی أن صلب رضی الله عنه"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ا، ص ۲۸۴)[1]

"کتاب جوہر مکنون میں ہے کہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (حضور ﷺ کے بدن سے پچھنوں کے ذریعہ نکالا ہوا) خون پیا تو ان کے دہن مبارک سے مشک کی خوشبو مہکی اور وہ خوشبو ان کے منہ

[1] مواہب اللدنیہ مطبوعہ، دارالکتب العلمیہ بیروت، جلد ۲، ص ۷۷۔ خلیل رانا

سے ہمیشہ مہکتی رہی یہاں تک کہ ان کو سولی دی گئی (رضی اللہ عنہ)"۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بول و براز مبارک و جمیع فضلات شریفہ کا طیب وطاہر اور پاک ہونا

"ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رات کو اُٹھے ایک برتن میں پیشاب فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک خادمہ جن کا نام اُم ایمن یا برکہ ہے وہ فرماتی ہیں کہ مجھے پیاس لگی تو میں نے پانی سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا پیشاب مبارک پی لیا، صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ حضور وہ میں نے پی لیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تجھے کبھی پیٹ کی بیماری نہ ہوگی"۔

(نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض، جلد ۱، ص ۴۴۸، ۴۴۹)

محدثین کرام ملا علی قاری، علامہ شہاب الدین خفاجی نے فرمایا کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور اسی لئے دار قطنی محدّث نے امام بخاری اور امام مسلم پر الزام عائد کیا کہ جب یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط کے موافق صحیح تھی تو انہوں نے اس کو اپنی صحیحین میں کیوں درج نہ کیا، اگرچہ یہ الزام صحیح نہیں اس لئے کہ شیخین نے کبھی اس بات کا التزام نہیں کیا کہ جو حدیث ہماری مقرر کی ہوئی شرط پر صحیح ہوگی ہم ضرور اس کو اپنی صحیحین میں لائیں گے، لیکن دار قطنی کے اس الزام سے یہ بات ضرور ثابت ہوگئی کہ یہ حدیث علیٰ شرط الشیخین صحیح ہے"۔

(دیکھئے نسیم الریاض، جلد ۱، ص ۴۴۸ اور شرح شفاء ملا علی قاری، جلد ۱، صفحہ ۱۶۳)

اس حدیث سے اور اسی مضمون کی دیگر احادیثِ صحیحہ سے جلیل القدر ائمہ دین اور اعلام اُمت محدثین کرام اور فقہاء نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بول مبارک بلکہ جمیع فضلات شریفہ کی طہارت کا قول کیا جیسا کہ بالتفصیل عبارات نقل کی جائیں گی بلکہ

بعض روایات حضرات محدثین وشارحین کرام نے اس مضمون میں وارد فرمائی ہیں کہ حضور ﷺ کا بول و براز مبارک مشک وعنبر سے زیادہ خوشبودار تھا چنانچہ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شرح شفاء میں حسب ذیل روایت نقل فرماتے ہیں :

(۱) "وروی ان رجلا قال رایت النبی ﷺ أبعد فی المذهب فلما خرج نظرت فلم أر شیئاً ورایت فی ذلك الموضع ثلاثة الاحجار اللاتی استنجی بهن فأخذتهن فاذا بهن یفوح منهن روائح المسك فکنت اذا جئت یوم الجمعة المسجد اخذتهن فی کمی فتغلب رائحتهن روائح من تطیب وتعطر"۔[1]

"(صحابہ کرام میں سے) ایک مرد سے روایت ہے کہ میں نے دیکھا حضور ﷺ ضرورت رفع فرمانے کے لئے بہت دُور تشریف لے گئے جب واپس تشریف لائے تو میں نے اس جگہ نظر کی کچھ نہ پایا البتہ تین ڈھیلے پڑے تھے جن سے حضور ﷺ نے استنجا فرمایا تھا میں نے انہیں اُٹھالیا، ان ڈھیلوں سے مشک کی خوشبوئیں مہک رہی تھیں، جمعہ کے دن جب مسجد میں آتا تو وہ ڈھیلے آستین میں ڈال کر لاتا ان کی خوشبو ایسی مہکتی کہ وہ تمام عطر اور خوشبو لگانے والوں کی خوشبو پر غالب آجاتی"۔

(۲) علامہ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری، فتح الباری شرح بخاری میں طہارت فضلات شریفہ کا مضمون یوں ارقام فرماتے ہیں:

"وقد تکاثرت الادلة علی طهارة فضلاتہ وعد الائمة ذلك

---

[1] شرح شفاء، مطبوعہ مصر، ج۱، ص ۱۶۲۔ مکتبۃ العلمیہ بیروت، ص ۱۷۰، خلیل رانا

فی خصائصه فلا یلتفت الی ماوقع فی کتب کثیر من الشافعیة مما یخالف ذلك فقد استقر الامر بین أئمتهم علی القول بالطهارة"۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، جلد ا، ص ۲۱۸)

(باب الماء الذی یغسل به شعر الانسان۔ خلیل رانا)

"بے شک بڑی کثرت سے دلیلیں قائم ہیں حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کے طاہر ہونے پر اور ائمہ نے اس کو حضور ﷺ کے خصائص سے شمار کیا ہے لہٰذا اکثر شافعیہ کی کتابوں میں جو اس کے خلاف واقع ہوا ہے قطعاً قابل التفات نہیں اس لئے کہ ان کے ائمہ کے درمیان پختہ اور مضبوط قول طہارت فضلات ہی کا ہے"۔

(۳) اسی طرح علامہ بدرالدین عینی حنفی شارح بخاری عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کی طہارۃ کا قول کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"وقد وردت احادیث کثیرة ان جماعة شربوا دم النبی ﷺ منهم ابو طیبة الحجام وغلام من قریش حجم النبی علیه الصلوٰة والسلام وعبد الله ابن الزبیر شرب دم النبی ﷺ رواه البزار والطبرانی والحاکم والبیهقی وابونعیم فی الحلیة ویروی عن علی رضی الله تعالیٰ عنه انه شرب دم النبی علیه الصلوٰة والسلام وروی ایضاً ان أم ایمن شربت بول النبی ﷺ رواه الحاکم والدارقطنی وابو نعیم واخرج الطبرانی فی الاوسط فی روایة سلمی امرأة ابی رافع

انها شربت بعض ماء غسل به رسول الله علیه الصلوٰة والسلام فقال لها حرم الله بدنك على النار وقال بعضهم الحق ان حكم النبى عليه الصلوٰة والسلام كحكم جميع المكلفين فى الاحكام التكليفية الا فيما يخص بدليل قلت يلزم من هذا ان يكون الناس مساوياً للنبى عليه الصلوٰة والسلام ولا يقول ذلك الا جاهل غبيٌ واين مرتبتهٗ من مراتب الناس والا يلزم ان يكون دليل الخصوص بالنقل دائمًا والعقل لهٗ مدخل فى تميز النبى عليه الصلوٰة والسلام من غيره فى مثل هذا الاشياء وانا اعتقد انه لا يقاس عليه غيره وان قالوا غير ذلك فاذنى عنه صما۔ انتہیٰ

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد ۱، ص ۷۷۸)

"بے شک بہت سی حدیثیں اس بارہ میں وارد ہوئیں کہ صحابہ کی ایک جماعت نے حضور ﷺ کا خون مبارک پیا ان میں حضرت ابوطیبہ حجام ہیں اور ایک قریشی لڑکا ہے جس نے حضور ﷺ کے پچھنے لگائے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے بھی حضور ﷺ کا خون اقدس پیا، روایت کیا ہے اسے بزار نے اور طبرانی نے اور حاکم نے اور بیہقی نے اور ابونعیم نے حلیہ میں اور حضرت علی مرتضیٰ سے بھی مروی ہے انہوں نے بھی حضور ﷺ کا خون اقدس پیا، نیز مروی ہے کہ حضرت اُم ایمن نے حضور ﷺ کا پیشاب مبارک پیا اس حدیث کو حاکم نے دار قطنی نے اور ابونعیم نے روایت کیا اور طبرانی نے اوسط میں ابورافع

کی عورت سلمٰی کی روایت میں اخراج کیا کہ سلمٰی نے حضور ﷺ کا غسل میں استعمال کیا ہوا پانی پیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس پانی کی وجہ سے تجھ کو دوزخ پر حرام فرما دیا بعض کا قول ہے کہ حضور ﷺ احکام تکلیفیہ میں دیگر مکلفین کی طرح ہیں سوائے اس چیز کے جو دلیل سے خاص ہو، میں کہتا ہوں کہ اس قول سے تو لازم آتا ہے کہ (معاذ اللہ) عام لوگ رسول اللہ ﷺ کے مساوی ہو جائیں اور ایسی بات سوائے جاہل غبی کے اور کوئی نہیں کہہ سکتا، بھلا حضور ﷺ کے مرتبہ کو لوگوں کے مرتبہ سے کیا نسبت اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دلیل خصوص ہمیشہ نقل ہی سے ہو حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں حضور ﷺ کا اپنے غیروں سے ممتاز ہونا ایسی بات ہے جس میں عقل کو بھی دخل ہے اور میرا اعتقاد تو یہی ہے کہ حضور ﷺ پر غیر کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہتا ہے تو میرے کان اس کے سننے سے بہرے ہیں"۔

عامر صاحب ذرا اس نورانی بیان کو پڑھیں اور اپنی بدعقیدگی کا علاج فرمائیں۔

(۴) اسی طرح امام قسطلانی شارح صحیح بخاری مواہب اللدنیہ شریف میں حضور ﷺ کے تمام فضلات شریفہ کی پاکی اور طہارت کا حسب ذیل عبارت میں نورانی بیان فرماتے ہیں:

"وروی انه کان یتبرک ببوله ودمه ﷺ"۔

"مروی ہے کہ حضور ﷺ کے پیشاب اور خون مبارک سے برکت حاصل کی جاتی تھی"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۴)

آگے چل کر فرماتے ہیں :

"وفی کتاب الجوهر المکنون فی ذکر القبائل والبطون: أنه لما شرب، ای عبد الله ابن الزبیر، دمه تضوع فمه مسکًا، وبقیت رائحته موجودة فی فمه الی أن صلب رضی الله عنه"۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۴)

"کتاب جوہر مکنون فی ذکر القبائل والبطون" میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جب حضور ﷺ کا خون مبارک پیا تو ان کے منہ سے مشک کی خوشبو مہکی اور وہ خوشبو ان کے منہ میں انہیں سولی دیئے جانے تک باقی رہی (رضی اللہ عنہ)"۔

آگے چل کر اسی حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

"قال النووی فی شرح المهذب واستدلال من قال بطهارتهما بالحدیثین المعروفین ان ابا طیبة الحجام حجمه ﷺ وشرب دمه ولم ینکر علیه، وان امرأة شربت بوله ﷺ فلم ینکر علیها، وحدیث ابی طیبة ضعیف، وحدیث شرب البول صحیح رواه الدار قطنی وقال هو حدیث حسن صحیح وذلك کاف فی الاحتجاج لکل الفضلات قیاساً، ثم ان القاضی حسیناً قال الاصح القطع بطهارة الجمیع انتهی"۔

(مواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۲۸۵)

"علامہ نووی نے شرح مہذب میں فرمایا اور استدلال کیا ان لوگوں نے جو حضور ﷺ کے حدیثین معروفین یعنی بول وبراز (پیشاب

پاخانہ) کی پاکی اور طہارت کے قائل ہیں اس حدیث سے کہ حضرت ابوطیبہ حجام نے حضور ﷺ کے پچھنے لگائے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا (پچھنوں سے نکلا ہوا) خون پی گئے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان پر انکار نہ فرمایا، نیز ایک عورت نے حضور ﷺ کا پیشاب مبارک پی لیا اور اس پر بھی حضور نے انکار نہ فرمایا، ابوطیبہ والی حدیث ضعیف ہے اور بول مبارک پینے کی حدیث صحیح ہے، اسے دار قطنی نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور یہ حدیثیں ایک کا دوسرے پر قیاس کر کے تمام فضلات شریفہ کی طہارۃ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں، اس کے بعد علامہ نووی نے فرمایا کہ قاضی حسین کا قول اس مسئلہ میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کے تمام فضلات شریفہ کو قطعاً طاہر مانا جائے"۔

اسی طرح نسیم الریاض، جلد ۱، صفحہ ۳۴۸، زرقانی شرح مواہب، جلد ۴، ص ۲۳۱، مدارج النبوۃ، ص وغیرہ معتبر کتابوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات شریفہ کی طہارۃ منصوص ومرقوم ہے، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلہ کو شامی میں ارقام فرمایا:

"وصحح بعض ائمة الشافعية طهارة بوله ﷺ وسائر فضلاته وبه قال ابوحنيفة كما نقله فى المواهب اللدنية عن شرح البخارى للعينى وصرح به البيرى فى شرح الاشباه وقال الحافظ ابن الحجر تظافرت الادلة على ذلك وعد الائمة ذلك من خصائصه ﷺ ونقل بعضهم عن شرح مشكوٰة لملا على القارى انه قال اختار كثير من اصحابنا

واطال فی تحقیقہ فی شرحہ علی الشمائل فی باب ماجاء فی تعطرہ علیہ الصلوٰۃ والسلام"۔ انتہیٰ

"اور صحیح قرار دیا بعض ائمہ شافعیہ نے حضور ﷺ کے پیشاب مبارک اور باقی تمام فضلات شریفہ کی طہارت اور پاکیزگی کو اور یہی قول ہے امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جیسا کہ مواہب میں عینی شرح بخاری سے نقل کیا ہے اور اس کی تصریح علامہ ببری نے شرح اشباہ میں فرمائی اور حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے کہا کہ حضور ﷺ کے بول مبارک اور تمام فضلات شریفہ کی پاکی اور طہارۃ پر قوی دلیلیں قائم ہیں اور ائمہ نے اسے حضور ﷺ کے خصائص کریمہ میں شمار کیا ہے اور بعض علماء نے ملا علی قاری کی شرح مشکوٰۃ سے نقل کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہمارے اکثر اصحاب حنفیہ کا اس مسئلہ میں پسندیدہ قول یہی ہے کہ حضور ﷺ کے جمیع فضلات شریفہ طیب وطاہر اور پاک ہیں اور ملا علی قاری نے اپنی شرح علی الشمائل باب ماجاء فی تعطرہ ﷺ میں طہارت فضلات شریفہ کو ثابت کرنے کے لئے پوری تحقیق کے ساتھ طویل کلام فرمایا ہے"۔ انتہیٰ

طہارتِ فضلات شریفہ کے ثبوت میں جلیل القدر علماء محدثین کی اتنی بے شمار عبارتیں ہیں کہ اگر ان تمام کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، بخوف طوالت ہم قدرِ ضرورت پر اکتفا کرتے ہیں اور ان تمام دلائل کے بعد اتمام حجت کے لئے عامر صاحب کے صرف دو مقتداؤں کی دو مختصر عبارتیں نقل کر کے اس بحث کو آخری نتیجہ پر ختم کرتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے! آپ کے مولوی محمد انور شاہ صاحب کشمیری نے فیض الباری

میں ارقام فرمایا جس کا خلاصہ اُردو زبان میں حسب ذیل ہے:

"امام بخاری نے باب استعمال فضل وضوء الناس، منعقد کر کے ماء مستعمل کی طہارت کا قول فرمایا، اس قول کے ثبوت میں حضور ﷺ کے ماء مستعمل کی طھارۃ سے استدلال کیا مگر یہ استدلال میرے نزدیک محلِ نظر ہے، اگرچہ فی نفسہٖ مسئلہ درست ہے، استدلال کے صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علماء اُمت حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کی طہارت کی طرف گئے ہیں، جب حضور ﷺ کے فضلات پاک ہیں تو وضو سے بچا ہوا پانی کیوں پاک نہ ہوگا؟ لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماء مستعمل کے پاک ہونے سے مطلقاً ہر ایک کے مستعمل پر حجت قائم نہیں ہوسکتی"۔ الخ (فیض الباری، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۹)

دیکھئے! آپ کے مولوی انور شاہ صاحب کشمیری نے طہارت فضلات نبی اکرم ﷺ کو علماء اُمت کا مذہب بتایا۔

اس کے بعد نشر الطیب اُٹھا کر دیکھئے آپ کے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کیا فرما رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اور مروی ہے کہ آپ جب بیت الخلاء میں جاتے تھے تو زمین پھٹ جاتی اور آپ کے بول و براز کو نگل جاتی اور اس جگہ نہایت پاکیزہ خوشبو آتی، حضرت عائشہ نے اسی طرح روایت کیا ہے اور اسی لئے علماء آپ کے بول و براز کے طاہر ہونے کے قائل ہوئے ہیں، ابوبکر بن سابق مالکی اور ابونصر نے ان کو نقل کیا ہے اور مالک بن سنان یوم اُحد میں آپ کا خون (زخم کا) چوس کر پی گئے، آپ نے فرمایا اس کو کبھی دوزخ کی آگ نہ لگے گی اور عبداللہ بن زبیر نے آپ کا خون

جو پچھنے لگانے سے نکلا تھا پی لیا تھا، اور آپ کی خادمہ برکہ اُم ایمن نے آپ کا بول پی لیا تھا سو ان کو ایسا معلوم ہوا جیسا شیریں نفیس پانی ہوتا ہے"۔ (نشر الطیب، صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳)

ہاں! جناب عامر صاحب! دیکھا آپ نے؟ آپ کے تھانوی صاحب نے حدیثوں سے ثابت کیا ہے کہ جس جگہ حضور ﷺ نے بول و براز فرمادیا وہاں نہایت پاکیزہ خوشبو آتی تھی اور آپ کے تھانوی صاحب ہی فرمارہے ہیں کہ اُم ایمن نے جب حضور ﷺ کا بول مبارک پیا تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے شیریں نفیس پانی ہوتا ہے۔

خدا لگتی کہیے! حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کے یہ پاکیزہ اوصاف مادی کثافتیں ہیں یا نورانی لطافتیں؟

ایک اعتراض کا جواب

اگر اس مقام پر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضور ﷺ کے مبارک کپڑے سے حضور کے خشک مادہ منویہ کو کھرچ دیتی تھیں اور تر ہونے کی صورت میں دھو دیا کرتی تھیں کہ اگر حضور کی منی پاک ہوتی تو یہ کھرچنا اور دھونا کس لئے تھا، نیز حضور سیّد عالم ﷺ حوائج ضروریہ سے فراغت پا کر وضو اور غسل کیوں فرماتے تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کا بول و براز اور منی وغیرہ فضلات طیب وطاہر اور پاک ہیں، جیسا کہ ہم بکثرت دلائل و براہین سے اس دعویٰ کو ثابت کر چکے ہیں اس کے باوجود حکمت تعلیم کی بنا پر خود حضور ﷺ کے حق میں وہ فضلات شریفہ نواقض وضو اور موجبات غسل کا حکم رکھتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُمت کو غسل و وضو کے مسائل اور لباس و بدن کے پاک کرنے کے طریقے کیسے معلوم ہوتے؟ چنانچہ فتاویٰ

اسعدیہ فی فقہ الحنفیہ میں مفتی الانام علامہ سیّد اسعد المدنی الحسینی انبیاء علیہم السلام کی منی کے پاک ہونے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں

الجواب۔ "اعلم هداك الله الى اصوب الصواب ان منى نبينا ﷺ و كذلك سائر فضلاته طاهرة عند علمائنا الحنفية كماسنذ كره"۔

"جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں راہ صواب کی طرف ہدایت بخشے، ہمارے نبی کریم ﷺ کی منی مبارک اور اس کے علاوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام فضلات شریفہ ہمارے علمائے حنفیہ کے نزدیک طیب وطاہر ہیں جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے"۔

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:

"قولنا بالطهارة ليس هو على اطلاقه بل هو فى حق غيره ﷺ واما فى حق نفسه ﷺ فهو باق على حكمه الاصلى"۔ انتہیٰ

"حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کی طہارت کا قول اپنے اطلاق پر نہیں بلکہ حضور ﷺ کے غیر کے حق میں ہے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں وہ اپنے حکم اصلی پر باقی ہے"۔ انتہیٰ

گویا جو فضلات شریفہ اُمت کے حق میں طیب وطاہر ہیں ان کا حضور ﷺ کے حق میں حکماً غیر طاہر ہونا ایسا ہے جیسا حسنات الابرار سيأت المقربين۔

اس کے بعد طہارت فضلات شریفہ پر دلیل قائم فرماتے ہوئے ان احادیث کو علامہ اسعد الحسینی نے ارقام فرمایا جو اس سے پہلے ہم پیش کر چکے ہیں، مثلاً ایک قریشی غلام اور مالک بن سنان اور عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابوطیبہ کا مختلف

اوقات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خون مبارک پینا اور حضور کا ان پر انکار نہ فرمانا بلکہ ان کے اس فعل پر انہیں جنت کی خوشخبری سنانا اور بعض کے حق میں دوسرے الفاظ تعریف وستائش ارشاد فرمانا نیز حضرت اُم ایمن اور اُم سلیم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول مبارک کو پی لینا اور یہ سن کر حضور کا مسکرانا اور صحت وشفا کی خوشخبری ارشاد فرمانا بیان فرما کر صاحبِ الفتاوٰی الاسعدیہ نے فرمایا کہ یہ احادیث حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام فضلات شریفہ کے پاک ہونے کو ثابت کرتی ہیں اور یہی قول ہے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا"۔ انتہی (فتاویٰ اسعدیہ، جلد ۱، ص ۴)

الحمد للہ فتاویٰ اسعدیہ کے اس بیان سے ہمارا مسلک اچھی طرح واضح ہو گیا اور جو اعتراض وارد کیا گیا تھا اس کا شافی جواب بھی ناظرین کے سامنے آ گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مبارک تھوک اور بینی شریف کی ریزش

کوئی کتنا ہی بزرگ اور کیسا ہی محبوب کیوں نہ ہو لیکن طبعی اور فطری طور پر اس کے فضلات بول وبراز، پسینہ، رینٹھ، تھوک وغیرہ موجب نفرت ہی ہوتے ہیں، عقیدت اور چیز ہے، لیکن کثیف اور غلیظ چیزوں سے طبعی طور پر نفرت کا ہونا امر آخر ہے۔

ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فضلات شریفہ بول وبراز پسینہ کو کس طرح رغبت اور چاہت کے ساتھ حاصل کرتے تھے اور اس کے استعمال میں انتہائی راحت لذت وسرور پاتے تھے۔ یہی معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تھوک مبارک اور بینی مبارک کی ریزش کے ساتھ صحابہ کرام کرتے تھے، دیکھئے بخاری شریف میں ہے:

"واللہ ان تنخم نخامۃ الا وقعت فی کف رجل منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ"

(بخاری شریف درسی، قدیمی کتب خانہ کراچی، جلد ا، ص ۳۷۹)

"خدا کی قسم حضور ﷺ نے بینی مبارک کی کوئی ریزش نہیں پھینکی لیکن وہ کسی صحابی کی ہتھیلی پر پڑی جس کو اس نے اپنے چہرے اور بدن پر مل لیا"۔

آپ نے دیکھا؟ صحابہ کرام کس رغبت اور شوق کے ساتھ حضور کی ریزش بینی کو اپنے بدن اور چہروں پر ملتے تھے کیا اس کے بعد بھی حضور کے بلغم شریف یا ریزش بینی میں کسی مادی کثافت وغلاظت کا تصور ہوسکتا ہے؟

اسی طرح حضور ﷺ کا تھوک مبارک بھی مادی کثافت وغلاظت سے پاک تھا، بخاری شریف میں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی دعوت کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے گھر میں تشریف لائے:

"فاخرجت له عجينا فبسق فيه وبارك ثم عمد الى برمتنا فبسق فيه وبارك"

(بخاری شریف درسی، قدیمی کتب خانہ کراچی، جلد ۲، ص ۵۸۹)

"تو حضرت جابر کی بیوی نے گندھا ہوا آٹا حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا حضور ﷺ نے اس میں تھوک دیا اور ساتھ ہی دُعائے برکت بھی عطا فرمائی، حضرت جابر فرماتے ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہماری ہانڈی کی طرف قصد فرمایا اور اس میں بھی تھوک دیا اور دُعائے برکت فرمائی"۔

کیوں عامر صاحب! کیسا مزاج ہے؟ کچھ پتہ چلا آپ کو حضور ﷺ کی ناک مبارک کی ریزش اطہر کا اور سینۂ اقدس کا جما ہوا بلغم مبارک اور تھوک مقدس کیسا لطیف ونظیف اور طیب وطاہر ہے اور صحابہ کرام اسے کس طرح اپنے چہرے اور بدن

پر ملتے تھے اور اپنے آٹے اور ہانڈی میں تھوک مبارک کو مرغوب ومحبوب جان کر کمال رغبت ومحبت کے ساتھ اسے کھاتے تھے، اگر عامر صاحب واقعی حضور ﷺ کو اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات شریفہ کو معاذ اللہ اپنے فضلات جیسا مانتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ بھی اپنا تھوک بلغم ناک کی ریزش کسی کے بدن پر ڈالیں کسی کے منہ پر ملیں، روٹی ہانڈی میں کبھی اپنا تھوک ڈال دیا کریں اور نہ سہی اپنے ہی گھر میں تجربہ کرلیں ہانڈی میں ذرا سا تھوک کر دیکھیں اگر ان کے سر اقدس پر ہانڈی نہ ماردی جائے تو میں ذمہ دار ہوں، اچھا اگر وہ خود اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے تو اپنے بزرگوں، استادوں اور پیروں مقتداؤں کا تھوک رغبت ومحبت کے ساتھ کھالیا کریں، کبھی کسی بزرگ کی ناک کی ریزش بلغم، کھنگار اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے منہ پر مل لیا کریں لیکن مجھے اُمید نہیں کہ وہ بڑے سے بڑے مقدس انسانوں کا تھوک کھانا یا اس کی کھنگار وغیرہ کو اپنے منہ پر ملنا گوارہ فرمائیں، سب جانتے ہیں کہ جو شخص جنتی ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا مقدس اور مطہر ہوتا ہے، عامر صاحب کے نزدیک یزید کتنا مقدس اور بزرگ ہوگا، لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یزید بھی عامر صاحب کے منہ پر تھوک دے یا اپنی ناک سنک کر عامر صاحب کے منہ پر رینٹھ پھینک مارے تو عامر صاحب اسے رغبت کے ساتھ کھانے یا منہ پر ملنے کی بجائے انتہائی نفرت وحقارت کے ساتھ اپنے بدن سے دُور کرنے کی کوشش فرمائیں گے، معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا فضلات شریفہ کا کمال رغبت ومسرت سے پی لینا اور اس کے مزے میں شیرینی، لطافت اور خوشبو محسوس کرنا اس امر کی روشن دلیل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات مبارکہ بشری کثافتوں اور ہر قسم کی نجاستوں اور غلاظتوں سے قطعاً پاک اور طیب وطاہر تھے۔

عامر صاحب کا بار بار یہ کہنا کہ قرآن کریم میں "قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

وارد ہوا ہے مگر یہ لوگ حضور کی بشریت کے منکر ہیں اور ہم حضور کو نورِ محض مانتے ہیں قطعاً غلط اور ہم پر بہتان وافتراء ہے، ہم نے بارہا کہا کہ حضور ﷺ کی خلقت نور سے ہے لیکن یہ نورانیت بشریت کے منافی نہیں، علامہ شہاب الدین خفاجی حضور ﷺ کی بشریت مطہرہ کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وکونہ مخلوقا من النور لاینافیہ کما توھم"

(نسیم الریاض، جلد ۲، ص ۲۳۸)

"اور نبی کریم ﷺ کا نور سے مخلوق ہونا حضور ﷺ کی بشریت کے منافی نہیں جیسا کہ وہم کیا گیا"۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ ہم حضور ﷺ کو ایسا بشر مانتے ہیں جس میں بشریت کے عیوب ونقائص نہ ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں "**محمد**" پیدا کیا ہے جس کے معنی ہیں "حمد کیا ہوا" حمد کے معنی ہیں "تعریف وثنا" ظاہر ہے کہ تعریف وثنا حمد وخوبی پر ہی ہوسکتی ہے، عیب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حضور ﷺ چونکہ اپنے مرتبہ اور مقام میں مطلقاً "محمد" ہیں اس لئے ذاتِ مقدسہ میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاسکتی جو حضور کے حق میں کسی اعتبار سے بھی عیب قرار پائے، لہٰذا واضح ہوگیا کہ نجاست وغلاظت کثافت وثقالت ہر عیب سے حضور ﷺ پاک ہیں اور آپ کی بے عیب بشریت محمدیت کی دلیل ہے، رہا یہ امر کہ لفظ "مثلکم" سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ہماری مثل ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حصر اضافی ہے یعنی "لنسبتہ الی الالوھیۃ" اس لئے آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں عدم الوہیت میں تمہاری مثل ہوں، یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ بشری کثافتوں اور مادی غلاظتوں میں بھی تمہارے جیسا ہوں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کا نور سے مخلوق ہونا اور حضور کی بشریت مقدسہ وجسمانیت مطہرہ کا ہر قسم کی مادی کثافت، بدبو، نجاست اور غلاظت وغیرہ سے پاک ہونا ایسے دلائل کثیرہ وبراہین قویہ سے ثابت کردیا جن کا جواب انشاء اللہ العزیز قیامت تک عامر صاحب کیا؟ ان کی ذریت سے بھی نہ ہوسکے گا۔

کیوں عامر صاحب؟ آپ نے اپنے دلائل بول وبراز، منی، تھوک وغیرہ کا حشر دیکھ لیا؟ اَب تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حضور ﷺ کے فضلات شریفہ مادی کثافتیں نہیں بلکہ نورانی لطافتیں ہیں۔

عامر صاحب تو پہلے ہی اعلان کرچکے ہیں کہ ہم کاظمی کی ایک ایک دلیل کا جواب دیں گے لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان شاء اللہ العزیز آپ کا بھی کوئی جواب ایسا نہ ہوگا جسے جواب الجواب کے بعد کوئی شخص جواب کہہ سکے، ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ناظرین کرام ہماری طول نگاری سے ملول نہ ہوں گے اس لئے کہ یہاں جس قدر طول ہوگا فضائل وکمالات رسالت سامنے آتے جائیں گے۔

عامر صاحب لکھتے ہیں:

"حیرت ہے کہ نور کا یہی ایک لازمہ انہیں یاد رہ گیا کہ اس کا سایہ نہیں ہوتا، باقی تمام لوازمات ذہن کے کسی خفیہ گوشے میں جا چھپے...... یہ لوازمات بھی تو پیش نظر رہنے چاہئیں تھے کہ نور حقیقی پاخانہ پیشاب نہیں کرتا، کھانا نہیں کھاتا، شادی کرنے اور باپ بننے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا، نہ وہ حیز (اپنے محل وقوع) کو بھرتا ہے"۔الخ

(ماہنامہ تجلی، جون ١٩٦٠ء، ص ٤٧)

ضلالت کی وادیوں میں بھٹکنے کا نتیجہ حیرت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ عامر

صاحب! اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ نبی کریم ﷺ نور محض نہیں بلکہ بشریت سے بھی متصف ہیں، ہاں اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ کی بشریت معاذ اللہ ہماری طرح کثیف وغلیظ نہیں، بلکہ انتہائی لطیف اور طیب وطاہر ہے، جس میں بشریت کے کسی عیب کا شائبہ تک متصور نہیں ہو سکتا۔

جب نورانیت اور بشریت دونوں کا وجود ہوا تو ہر ایک کے لوازمات بھی موجود ہوں گے، کھانا پینا اور باپ بننا بشریت کے لوازمات سے قرار پائے گا، اور سایہ نہ ہونا نورانیت کے لوازمات سے ہوگا۔

شاید آپ کہیں کہ سایہ بھی لوازماتِ بشریت سے ہے تو میں عرض کروں گا کہ بے شک سایہ لوازماتِ بشریت سے ہے، لیکن اس بشریت کے لوازمات سے جو نورانیت سے بے بہرہ اور بشریت محضہ ہو، جس میں کثافت اور غلاظت وغیرہ نقائصِ بشریت پائے جاتے ہیں، نورانی بشریت اور لطیف و پاکیزہ بشریت کے لوازمات سے سایہ نہیں ہے۔

رہا کھانا پینا اور باپ بننا تو ان صفات کو بایں معنی لوازمات بشریت سے کہا جاتا ہے کہ بشریت میں ان کا پایا جانا امر واقعی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس میں بھی یہ صفات پائے جائیں وہ بشر ہے، دیکھئے بیضاوی شریف میں ہے:

"ولان ابن عباس روی ان من الملائکۃ ضربا یتوالدون یقال لھم الجن ومنھم ابلیس" ۔ انتھٰی

(بیضاوی، جلد ۱، ص ۶۴)

"(ابلیس ملائکہ سے تھا) اس لئے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ملائکہ کی ایک قسم وہ ہے جس میں توالد وتناسل پایا جاتا ہے (وہ اپنے باپ کے بیٹے ہوتے ہیں اور اپنے بیٹوں کے باپ

بنتے ہیں) جنہیں جن کہا جاتا ہے، اور انہی میں سے ابلیس ہے"۔

اسی مقام پر بیضاوی شریف کے حاشیہ میں ہے:

"قوله ولمن زعم انه لم يكن من الملائكة۔ الخ قاله الحسن وقتادة واشار بلفظ الزعم الى ضعفه ورجحان الاول (انه من الملائكة) لانه قول علی وابن عباس وعليه اكثر المفسرين"۔ انتہیٰ

(حاشیہ نمبر ۳ بیضاوی، ص ۶۴، مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

"(قوله ولمن زعم الخ) حضرت حسن بصری اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ سے نہ تھا مصنف نے لفظ "زعم" سے اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی قول اوّل کے راجح ہونے کی طرف بھی اسی لفظ زعم سے اشارہ فرمایا، قول اوّل یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا، اس قول کے راجح اور قوی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے اور اکثر مفسرین بھی اسی پر متفق ہیں"۔ انتہیٰ

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں نور و نار کے اختلاف کا سہارا لینا درست نہ ہوگا اس لئے کہ نور و نار کا مادہ ایک ہے، اوصاف زائدہ علی الذات کے اختلاف سے ذاتیات کا مختلف ہونا لازم نہیں آتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت سے جہاں بعض فرشتوں کا توالد و تناسل ثابت ہوا وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فرشتوں کے لئے کھانا پینا بھی محال نہیں، بلکہ بعض ملائکہ کے لئے واقع ہوا ہے، جیسا کہ احادیث کثیرہ میں وارد

ہے کہ جنات کھاتے ہیں اور بعض اشیاء خاص طور پر اُن کی غذا ہیں، کھانے پینے کے لئے پیشاب پاخانہ بھی لوازمات سے شمار کیا جاتا ہے، اس لئے جب کھانا پینا ان کے لئے ثابت ہوگیا تو پیشاب پاخانہ بھی منکرین کے اصول پر لازماً اُن کے لئے ماننا پڑے گا۔

عامر صاحب! آپ نے دیکھا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جنات کو ملائکہ کی ایک قسم قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ بعض اوصافِ زائدہ علی الذات مثلاً حرارت و برودت کے اختلاف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو جن وملائکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے، لہٰذا ثابت ہوگیا کہ کھانا، پیشاب، پاخانہ، باپ اور بیٹا بننا بشریت میں منحصر نہیں اور نہ یہ اوصاف نورانیت کے خلاف ہیں، ان اوصاف کو سامنے رکھ کر اَب کس منہ سے نورانیت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کا انکار کر سکتے ہیں۔

بیضاوی شریف کی روایت منقولہ بالا سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ جنات ملائکہ کی ایک قسم ہے، نور و نار دونوں مصدر ہیں جن کا مادہ ایک ہے یعنی نور، فرق صرف اتنا ہے کہ نور کے مقابلہ میں جسے نار کہا جاتا ہے وہ نور کے ساتھ متحد الماھیة ہونے کے باوجود کسی ایسی صفت میں مختلف ہے جس کا ذات اور ماہیت میں کوئی دخل نہیں۔

معلوم ہوا کہ جن وملائکہ ایک ہی نوع کی دو قسمیں ہیں جن میں بشریت کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، لیکن اس کے باوجود ملائکہ کی ایک قسم "جنات" میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جنہیں اوصاف اور لوازماتِ بشریت کہہ کر اُن کے موصوف کو بشر محض کہا جاتا ہے، اگر فی الواقع اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو وہ تمام جنات جنہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ملائکہ کی ایک قسم قرار دیا ہے بشر قرار پائیں گے، جو بالکل غلط اور ظاہر البطلان ہے۔

اس مضمون میں اگر اس بات پر بھی غور کرلیا جائے کہ فرشتوں کی ایک قسم جنات ہے جو کھاتے پیتے اور پیشاب و پاخانہ پھرتے ہیں اور اُن کی شادیاں بھی ہوتی ہیں، اور ازدواجی تعلقات سے ان کی نسل بڑھنے اور اولاد پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور اسی ضمن میں ان کا جوہر حیات جسے نطفہ اور منی سے تعبیر کرنا چاہئے ان کے اجسام سے خارج ہوتا ہے جو توالد و تناسل کی اصل ہے، تو یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر سامنے آجائے گی کہ منکرین نورانیت نبی کریم ﷺ کے وہ تمام ہفوات پادر ہوا ہیں جو عامۃ المسلمین کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ بشر محض نہ ہوتے تو وہ کھانا کیوں کھاتے اور اپنے والدین کے گھر کیسے پیدا ہوتے، اور ان کی اولاد کیوں کر ہو سکتی تھی اور معاذ اللہ ان کے ساتھ پیشاب، پاخانہ، منی اور تھوک وغیرہ کیوں کر متعلق ہو سکتے تھے، ان تمام اوصاف اور امور کا پایا جانا حضور ﷺ کی بشریت اور معاذ اللہ عنصری کثافت کا بین ثبوت ہے، ایسے لوگ مجھے بتائیں کہ جنات کے یہ تمام اوصاف اور امور کا پایا جانا حضور ﷺ کی بشریت اور معاذ اللہ عنصری کثافت کا بین ثبوت ہے؟ ایسے لوگ مجھے بتائیں کہ جنات کے یہ تمام اوصاف بھی بشریت اور عنصری کثافت کی دلیل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آپ امور مذکورہ و اوصاف مرقومہ کو حضور ﷺ کی بشریت محضہ کے ثبوت میں پیش کرنے کی کس طرح جرأت کرتے ہیں؟ کیا یہ طرز عمل حضور ﷺ کی بین عداوت کا ثبوت نہیں؟ فالی اللہ المشتکی

عامر صاحب کی علمی استعداد اور قرآن دانی کا بہترین نمونہ

عامر صاحب کی عبارت کا اقتباس جو ہم نے ابھی ہدیۂ ناظرین کیا ہے اس میں ہمارے ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ نور کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حیز (محل وقوع) کو نہیں بھرتا۔

حیز کا ترجمہ "محل وقوع" عامر صاحب کی علمی استعداد کا شاندار نمونہ ہے، انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ حیز متکلمین کی اصطلاح میں وہ فراغِ متوہم ہے جس کو کوئی شئے ممتد وغیر ممتد بھر لے۔ (شرح عقائد نسفی، ص)

نیز عامر صاحب نے نور کا یہ لازمہ بیان کر کے اپنے مبلغ علم کا ایک عجیب نمونہ پیش فرمایا ہے، انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ تمام ملائکہ اجسام نوریہ ہیں، اور ہر جسم خواہ نوری ہو یا غیر نوری محل وقوع کو پُر کئے بغیر نہیں پایا جاتا، کیوں کہ ہر جسم مکان کا محتاج ہوتا ہے، اور مکان حیز سے اخص ہے، اور اخص کا وجود اعم کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا ہر جسم کے لئے مکان کا ہونا ضروری ہے، اور مکان کا حیز کے بغیر پایا جانا محال ہے، بنا بریں ہر جسم نوری ہو یا غیر نوری حیز کے بغیر نہیں ہو سکتا اور حیز کے معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ ایسا فراغ متوہم ہے کہ جسے کوئی شئے ممتد یا غیر ممتد بھر لے، عامر صاحب محل وقوع کے نہ بھرنے کو نور کا لازمہ قرار دیتے ہیں، تو وہ بتائیں کہ اجسام نوریہ اُن کے نزدیک مکان میں ہیں یا لامکان میں؟ کیا وہ کہہ سکیں گے کہ نوری جسم مکان کے بغیر لامکان میں پایا جاتا ہے، نہیں اور ہرگز نہیں، پھر یہ کیا بات ہوئی کہ :

"نور کے لوازمات سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حیز (محل وقوع) کو نہ بھرے" ملخصاً

دیکھئے جبرئیل علیہ السلام نوری ہیں اور وہ جب اپنی اصلی نوری شکل میں ظاہر ہوئے تو انہوں نے اپنے محل وقوع کو بھر لیا، ہماری بات تو آپ کیا مانیں گے، اپنے چچا جان مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کی عبارت پڑھ لیجیے، وہ سورۃ النجم کی آیہ کریمہ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ پر حاشیہ نمبر ۷ میں ارقام فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ کو ابتدائے نبوت میں ایک مرتبہ حضرت جبرئیل اپنی صورت میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، اس وقت آسمان ایک کنارہ سے دوسرے کنارے تک اُن کے وجود سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا"۔

کیوں عامر صاحب! وہ آپ کا لازمہ کہاں گیا، یا آپ جبرئیل علیہ السلام کو نور حقیقی نہیں مانتے، جبرئیل علیہ السلام کے وجود سے آسمان کا ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ تک بھر جانا آپ کے نزدیک جبرئیل علیہ السلام کی بشریت کی دلیل ہے یا نورانیت کی؟ یا چچا جان بڑھاپے میں غلط لکھ گئے؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ ہمارے تعاقب میں آنکھیں بند کر کے ایسے بے تحاشا دوڑے ہیں کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں اور منہ کے بل گرے، مگر آپ کی جرأت قابل داد ہے کہ حق وصداقت کیخلاف اپنی جدوجہد اور تعاقب سے باز نہیں آئے۔ ع

"آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو"

عامر صاحب نے نور کے لوازمات بیان کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ:

"یہ لوازمات بھی تو پیش نظر رہنے چاہئیں تھے کہ نور حقیقی پیشاب پاخانہ نہیں کرتا، کھانا نہیں کھاتا، شادی کرنے اور باپ بننے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا"۔

نور کے اکثر افراد کا کھانے پینے، پیشاب پاخانہ کرنے اور توالدوتناسل سے بے تعلق ہونا تو مسلمات سے ہے، لیکن نور کی حقیقت اور اس کی جنس کے لئے مطلقاً ان امور کو لوازمات قرار دینا دلائل شرعیہ کی روشنی میں غلط اور باطل محض ہے، بیان سابق میں ہم اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ملائکہ نور حقیقی ہیں اور ملائکہ کی ایک قسم میں توالدوتناسل موجود ہے، وہ کھاتے پیتے بھی ہیں اور کھانا پینا پیشاب پاخانہ کو مستلزم ہے، عامر صاحب کو لازم کی تعریف بھی معلوم نہیں، لازم کے معنی ما یمتنع انفکاکہ عن الشیء، اگر یہ امور لوازم نور سے ہوتے تو ان کا انفکاک اس سے محال ہوتا، لیکن ایسا نہیں، تو معلوم ہوا کہ امور مذکورہ کو لوازمات نور کہنا لغو اور بے

بنیاد ہے۔

تفسیر بیضاوی سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت جو اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں، ہمارے بیان کی تائید میں کافی ہے جس میں یہ الفاظ موجود ہیں:

"ان من الملائکۃ ضربا یتوالدون یقال لھم الجن ومنھم ابلیس"

"فرشتوں کی ایک قسم وہ ہے جن میں توالد وتناسل ہوتا ہے، یعنی ان کی نسل چلتی ہے اور ان کے اولاد ہوتی ہے، انہیں جن کہا جاتا ہے اور ان ہی میں سے ابلیس ہے"۔

لیکن تفصیل مزید کے لئے ہم اس مسئلہ میں حضرات مفسرین کرام کی تصریحات پیش کرتے ہیں، تاکہ ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جائے اور مسئلہ کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

بیانِ سابق میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض مفسرین جیسے حضرت حسن بصری وغیرہ رضی اللہ عنہم کا یہ مسلک ہے کہ ابلیس ملائکہ سے نہ تھا لیکن یہ قول ضعیف ہے، جمہور مفسرین حضرات صحابہ کرام وتابعین کا یہی مذہب ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا۔

(ا) تفسیر روح المعانی میں ہے:

"واختلف الناس فیہ ھل ھو من الملائکۃ ام من الجن فذھب الی الثانی جماعۃ"

"اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ ابلیس ملائکہ سے ہے یا جن سے ایک جماعت شق ثانی کی طرف گئی ہے"۔

چند سطر بعد فرماتے ہیں:

"وذهب جمهور العلماء من الصحابة والتابعين الى الاوّل" ۔انتہیٰ (تفسیر روح المعانی، پ ا ص ۲۱۰)

"جمہور علماء، صحابہ وتابعین کا مذہب یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا"۔

(۲) تفسیر روح البیان میں ہے:

"واكثر المفسرين على ان ابليس من الملائكة لان خطاب السجود كان مع الملائكة قال البغوى وهو الاصح" ۔انتہیٰ (تفسیر روح البیان، جلد ا، ص ۱۰۴)

"اکثر مفسرین اسی پر ہیں کہ ابلیس ملائکہ سے تھا اس لئے کہ سجدہ کا خطاب ملائکہ سے تھا، امام بغوی نے فرمایا یہی اصح ہے"۔

(۳) تفسیر بیضاوی میں ہے:

"والاية تدل على ان أدم عليه السلام افضل من الملائكة المامورين بالسجود له ولو من وجه وان ابليس كان من الملائكة والا لم يتناوله امرهم ولم يصح استثناءه منهم" ۔

(بیضاوی شریف، جلد ا، مطبوعہ فاروقی، دہلی، ص ۶۴)

"اور آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آدم علیہ السلام ان ملائکہ سے افضل ہیں جو آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے پر مامور تھے، اگرچہ یہ فضیلت من وجہ ہو اور آیۂ کریمہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا، ورنہ فرشتوں کا امر اسے شامل نہ ہوتا نہ اس کا استثناء فرشتوں سے صحیح ہوتا"۔

(۴) تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"(المسئلة الثالثة) اختلفوا فی ان ابلیس هل کان من الملائکة قال بعض المتکلمین ولا سیما المعتزلة انه لم یکن منهم وقال کثیر من الفقهاء انه کان منهم"۔

(تفسیر کبیر، جلد اوّل، ص ۴۲۷)

"(تیسرا مسئلہ) لوگوں نے اختلاف کیا کہ ابلیس ملائکہ سے تھا یا نہیں، چنانچہ بعض متکلمین خصوصاً معتزلہ اس طرف گئے ہیں کہ وہ ان میں سے نہ تھا، اور اکثر فقہاء نے کہا کہ بے شک وہ اُن ہی میں سے تھا"۔

اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے علی الترتیب جانبین کے دلائل نقل فرمائے اور آخر میں ارقام فرمایا:

"فهذا ما عندی فی الجانبین والله اعلم بحقائق الامور"۔ انتہیٰ

(تفسیر کبیر، جلد اوّل، ص ۴۳۰)

"جانبین کی طرف سے میرے پاس جو کچھ تھا وہ یہی ہے جو میں نے بیان کر دیا اور حقائق امور کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے"۔

(۵) علامہ ابن کثیر تفسیر ابن کثیر میں لکھتے ہیں:

"عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنهما قال کان ابلیس من حی من احیاء الملائکة یقال لهم الجن خلقوا من نار السموم من بین الملائکة وکان اسمه الحارث وکان خازنا من خزان الجنة قال وخلقت الملائکة کلهم من نور غیر هذا الحی قال وخلقت الجن الذین ذکروا فی القراٰن من مارج من نار الحدیث"۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اوّل، ص ۷۵)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ابلیس ملائکہ کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ سے تھا، جسے جن کہا جاتا ہے، جو ملائکہ کے درمیان نار سموم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کا نام حارث تھا، اور جنت کے خازنوں میں سے ایک خازن تھا، فرمایا کہ اس قبیلہ کے علاوہ تمام ملائکہ نور سے مخلوق ہوئے ہیں اور "جنات" جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ نار کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں"۔

اس مقام پر یہ شبہ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ عبارت منقولہ بالا سے فرشتوں کا اپنی ماہیت میں جنات سے مبائن ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ فرشتے نور سے مخلوق ہیں اور جنات نار سے، اس لئے کہ عبارت منقولہ میں صاف موجود ہے کہ ابلیس فرشتوں کے قبیلے سے تھا، اور ظاہر ہے کہ کسی قوم کا ایک قبیلہ دوسرے قبائل سے جنسیت اور ماہیت میں مختلف اور مبائن نہیں ہوا کرتا، رہا یہ امر کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے اور جنات نار سے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نور و نار دونوں میں صرف عوارض کی وجہ سے تفاوت ہے، ورنہ ماہیت دونوں کی متحد ہے، جیسا کہ عنقریب دلائل سے ثابت کیا جائے گا۔

آگے چل کر علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"لما فرغ الله من خلق ما احب استوی علی العرش فجعل ابلیس علی ملك السماء الدنیا وكان من قبیلة من الملائكة یقال لهم الجن "-الخ

(تفسیر ابن کثیر، جلد اوّل، ص۷۶)

"اللہ تعالیٰ کو جو کچھ پیدا کرنا تھا، جب وہ پیدا کر دیا تو پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اور ابلیس کو آسمان دنیا کے ملک پر مقرر کر دیا، اور وہ فرشتوں کے ایک قبیلہ سے تھا جسے جن کہا جاتا ہے"۔

(۶) تفسیر "سراج منیر" میں خطیب شربینی نے ارقام فرمایا ہے :

"وخلق الملائکة والجن فاسکن الملائکة فی السماء واسکن الجن فی الارض فمکثوا فیها دهرا طویلا ثم ظهر فیهم الحسد والبغی فافسدوا فیها فبعث الله تعالی الیهم جندا من الملائکة یقال لهُ الجن وهم خزان الجنان اشتق لهم اسم من الجنة راسهم ابلیس فکان رئیسهم ومن اشدهم واکثرهم علما" ۔ انتہٰی

(تفسیر سراج منیر، جلد اوّل، ص ۴۱)

"اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور جن کو پیدا فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آسمان میں اور جن کو زمین میں ٹھہرایا تو وہ ایک طویل زمانہ تک زمین میں ٹھہرے رہے، پھر ان میں حسد اور بغاوت کا ظہور ہوا، تو انہوں نے زمین میں فساد کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتوں کا ایک لشکر بھیجا جسے جن کہا جاتا تھا اور وہ سب لشکری جنت کے خازن تھے، ان کا نام بھی لفظِ جنت سے مشتق تھا، ان کا بڑا ابلیس تھا جو ان کا سردار تھا، اور سب سے زیادہ قوت والا اور سب سے زیادہ علم والا تھا"۔

اس کے بعد خطیب شربینی اسی تفسیر سراج منیر کے صفحہ ۴۵ پر فرماتے ہیں:

"فان قیل لهٗ ذریة والملائکة لا ذریة لهم اجیب بان ابن عباس رضی الله عنهما روی ان من الملائکة نوعا یتو الدون یقال لهم الجن ومنهم ابلیس" ۔

(تفسیر سراج منیر، جلد اوّل، ص ۴۵)

"اگر اعتراض کیا جائے کہ شیطان کی اولاد ہے، حالانکہ ملائکہ کی اولاد نہیں ہوتی تو جواب دیا جائے گا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ملائکہ میں ایسی نوع بھی ہے جس کی اولاد ہوتی ہے، انہیں جن کہا جاتا ہے اور ان ہی میں سے ابلیس ہے"۔

(۷) تفسیر ابن جریر میں علامہ ابن جریر فرماتے ہیں :

"عن قتادة قوله اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ قال كان من قبيل الملائكة يقال لهم الجن"۔

(تفسیر ابن جریر، جلد اوّل، ص ۱۷۳)

"حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے قول اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ کی تفسیر میں مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ابلیس ملائکہ کے قبیل سے تھا، جنہیں جن کہا جاتا ہے"۔

(۸) تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"واختلفوا فيه فقال ابن عباس واكثر المفسرين كان ابليس من الملائكة"۔ انتہیٰ

(تفسیر معالم التنزیل، جلد اوّل، ص ۴۱)

"ابلیس کے بارے میں اختلاف ہے اکثر مفسرین اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا"۔

(۹) تفسیر خازن میں ہے :

"قال ابن عباس رضى الله عنهما كان ابليس من الملائكة بدليل انه استثناء منهم"۔ انتہیٰ

(تفسیر خازن)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابلیس ملائکہ سے تھا، جس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ فرما کر اسے ملائکہ سے مستثنیٰ فرمایا (اور استثنیٰ میں اصل متصل ہے)"۔

(۱۰) تفسیر مدارک میں امام نسفی مقتدائے احناف فرماتے ہیں:

"(فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ) الاستثناء متصل لانه کان من الملائکة کذا قاله علی وابن عباس وابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنهم ولان الاصل ان الاستثناء یکون من جنس المستثنیٰ منه" الخ

"اللہ تعالیٰ کے قول اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ میں استثناء متصل ہے اس لئے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا یہی قول حضرت علی مرتضیٰ، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا ہے اور اس لئے بھی کہ استثناء میں اصل یہ ہے کہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"وعن الجاحظ ان الجن والملائکة جنس واحد فمن طهر منهم فهو ملك ومن خبث فهو شیطان ومن کان بین بین فهو جن"۔

"جاحظ سے مروی ہے کہ جن اور فرشتے جنس واحد ہیں ان میں جو پاک رہا وہ فرشتہ ہے، اور جو خبیث ہو گیا وہ شیطان ہے، اور جو بین بین رہا یعنی پاکیزگی اور خباثت کے درمیان رہا وہ جن ہے"۔

(تفسیر مدارک، جلد اوّل، ص ۳۴)

ان تمام عبارات ائمہ تفسیر سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ جمہور علماء، صحابہ مثلاً حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم وتابعین واکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا، اور جن وفرشتہ جنسِ واحد سے ہیں، فرشتوں اور جنات کا مادہ اور ان کی حقیقت ایک ہے، ان میں جو پاک رہا فرشتہ کہلایا اور جو خبیث ہو گیا وہ شیطان بنا، اور جو خباثت و پاکیزگی کے درمیان رہا وہ "جن" قرار پایا، شیطان، جن اور فرشتے تینوں کی حقیقت وماہیت میں کچھ فرق نہیں ہے، صرف عارضی صفات کا فرق ہے اور بس، نیز یہ فرق بھی عبارات منقولہ بالا سے ثابت ہو گیا کہ ملائکہ کی ایک قسم ایسی ہے جس میں توالد وتناسل پایا جاتا ہے، اور وہ کھاتے پیتے ہیں، اور کھانے پینے کی وجہ سے پیشاب اور پاخانہ پھرتے ہیں، اور اگر جمہور علماء صحابہ وتابعین واکثر مفسرین کے خلاف بھی مان لیا جائے کہ جنات ملائکہ کی قسم نہیں تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے، اس لئے کہ نور ونار متحد المادہ اور ایک جنس سے ہوتے ہیں، اور جنات کا توالد وتناسل اور کھانا پینا بھی حقیقت ثابتہ ہے، لہٰذا نور کے مادہ اور اس کی جنس کے بعض افراد سے توالد وتناسل اور کھانے پینے کا منفی ہونا ثابت نہ ہوا، ایسی صورت میں ان تمام امور کے ہونے کو علی الاطلاق بشریت کے لئے ضروری اور نہ ہونے کو نورانیت کے لئے لازمی قرار دینا جہالت وضلالت قرار پایا۔

اس کے بعد اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ فرشتے نور سے مخلوق ہیں اور جنات نار سے نیز یہ کہ نور کا مقتضیٰ عصمت ہے اور نار کا تقاضا معصیت، اگر جنات کو بھی ملائکہ قرار دے دیا جائے تو ملائکہ کی عصمت باطل ہو گی، کیونکہ جنات میں فسوق وعصیاں پایا جاتا ہے اور ملائکہ کا معصوم ہونا قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے ثابت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم صرف اور لغت کی رُو سے نور ونار متحد المادہ ہیں،

چنانچہ نور، بنور، نورًا و نارًا اس پر دلیلِ روشن ہے، نور و نار دونوں ایک ہی باب کے مصدر ہیں اور دونوں کا مادہ اور ماہیت ایک ہے، فرق صرف عوارض سے ہے، ذاتیات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، اور ملائکہ یقیناً معصوم ہیں، مگر سب نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر، اور ان میں بعض افراد غیر معصوم بھی ہیں، قرآن مجید میں جہاں ملائکہ کی عصمت کا بیان ہے وہاں ان کے ایک خاص گروہ کا ذکر ہے، جمیع افرادِ ملائکہ کی عصمت پر کوئی دلیل قائم نہیں، بلکہ بعض کی عدمِ عصمت ثابت ہے، قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ بیضاوی شریف میں فرماتے ہیں:

"وان من الملائکۃ من لیس بمعصوم وان کان الغالب منہم العصمۃ کما ان من الانس معصومین والغالب فیہم عدم العصمۃ" ۔انتہیٰ

"اور آیت کریمہ "فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ" اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ملائکہ کے بعض افراد معصوم نہیں ہیں، اگرچہ ان کا وصف غالب عصمت ہے، جیسا کہ بعض انسان (حضرات انبیائے کرام) یعنی جس طرح انسانوں میں بعض معصوم ہیں اور اکثر غیر معصوم، اسی طرح اس کے برعکس فرشتوں میں بھی بعض غیر معصوم اور اکثر معصوم"۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں نفیس بحث کرتے ہوئے آگے چل کر فرماتے ہیں:

"لا یقال کیف یصح ذلک والملائکۃ خلقت من نور والجن من نار لما روت عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہ علیہ السلام قال خلقت الملائکۃ من النور وخلق الجن

من مارج من نار لانه کالتمثیل [۱] لما ذکرنا فان المراد بالنور الجوهر المضیء والنار کذلک غیر ان ضوءها مکدر مغمور بالدخان محذور عنه بسبب ما یصحبه من فرط الحرارة والاحراق فاذا صارت مهذبة مصفاة کانت محض نور "۔الخ (بیضاوی شریف، جلد اوّل، ص ۶۴)

---

[۱] (قوله لانه کالتمثیل۔الخ) ای تمثیل لحقیقتها ببیان مادتها ما قال بعض القاصرین من انه سلوك بطریق المعتزلة من حمل النصوص علی غیر ظاهرها حتی انکر واسوال نکیر ومنکر وعذاب القبر والمیزان والصراط وغیرها مع ان حمل ماذکر فی خلق الملائکة والجن علی التمثیل یقتضی حمل خلق اٰدم من تراب علیه ایضاً وهو خلاف ظاهر الاٰیة والحدیث ففیه انما یدوان لوکان مقصود المصنف رحمة الله تعالیٰ ان الحدیث محمول علی هذا المعنی بل مقصوده ان ببیان مادتها رمزا الی ما ذکر فهو بیان لبطن الحدیث مع حفظ ظاهره وهو طریقة العلماء العارفین بالله فمعنی قوله خلقت الملائکة من النور انها خلقت من جوهر مضیء غایة الاضاءة سواء کان بذاته کذالك او حاصلاً من النار بعد التصفیة وتمثیل لکون الملائکة محض خیر مبرأة عن ظلمة الشر اما بذاته او بغیره ومعنی قوله خلقت الجن من مارج من نار ای من جوهر مضیء مختلط بالدخان یحتمل غلبة کل واحد منهما فهو تمثیل لاستعداده بالذات للخیر والشر۔

(حاشیہ بیضاوی، جلد اوّل، ص ۶۴)

"یہاں تمثیل سے مراد یہ ہے کہ ان کا مادہ (نور و نار) بیان کر کے ان کی حقیقت کی مثال بیان کر دی یعنی نور استعداد خیر کی مثال ہے اور نار استعداد شر کی، اس مقام پر بعض کوتاہ فہم لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ اسے تمثیل قرار دینا معتزلہ کے راستہ پر چلنا ہے کہ انہوں نے (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

"اعتراض نہ کیا جائے کہ جنات کا از قبیل ملائکہ ہونا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ حالانکہ ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں، اور جنات آگ کے شعلہ سے، اس لئے کہ ہم جواب دیں گے کہ ملائکہ کے لئے لفظِ نور اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نصوص کو ان کے غیر ظاہر معنی پر حمل کردیا، یہاں تک کہ نکیرین کے سوال، عذابِ قبر، میزان اور پل صراط وغیرہ کا بھی انکار کر بیٹھے، اس کے ساتھ یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ ملائکہ اور جن کی پیدائش کے ذکر میں نور و نار کو تمثیل پر حمل کرنا اس بات کا مقتضی ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بیان میں جو مِنْ تُرَابٍ کا لفظ آیا ہے، اسے بھی تمثیل پر حمل کردیا جائے، حالانکہ یہ ظاہر آیت اور حدیث کے قطعاً خلاف ہے تو ان کوتاہ فہموں کی بات قابل قبول نہیں، اس لئے کہ مفسر (قاضی بیضاوی علیہ الرحمہ) پر یہ الزام اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ وہ ملائکہ اور جنات کے نور و نار سے مخلوق ہونے کی حدیث کو محض تمثیلی معنی پر محمول کرتے، مگر مفسر نے ایسا نہیں کیا، بلکہ تمثیل سے ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ حدیث شریف میں ملائکہ اور جن کے مادہ نور و نار کو بیان کر کے اس کی استعداد خیر و شر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ معنی ایسے ہیں جن سے بطن حدیث کے معنی بھی بیان ہوگئے اور اس کے ظاہری معنی بھی محفوظ رہے، اور یہ طریقہ علماء عارفین باللہ کا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے ظاہری معنی کو برقرار رکھتے ہوئے باطنی معنی بھی بیان کردیا کرتے ہیں، لہٰذا خلقت الملائکۃ من النور کے یہ معنی ہیں کہ فرشتے ایک ایسے روشن جوہر سے مخلوق ہیں جو بہت زیادہ انتہائی روشنی والا ہے، عام اس سے کہ یہ انتہائی روشنی بذاتہ ہو یا صفائی کے بعد نار سے حاصل ہوئی ہو، اور ان کی پیدائش کے بیان میں من النار اس بات کی تمثیل ہے کہ وہ فرشتے بذاتہ یا بغیرہ ظلمت شر سے پاک اور مبرا ہیں، اسی طرح خلقت الجن من مارج من نار کے معنی یہ ہیں کہ جنات کی پیدائش ایسے روشن جوہر سے ہوئی جو دھوئیں سے مخلوط ہوا اور اس میں جوہر مضیٔ و دخان میں سے ہر ایک کے غلبہ کا احتمال پایا جائے، لہٰذا وہ اس بات کی تمثیل ہے کہ جن بذاتِ خود خیر و شر دونوں کی استعداد رکھتا ہے"۔

جنات کے لئے لفظِ نار اس چیز کی تمثیل کے طور پر مستعمل ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں (کہ ملائکہ نیک اور پاکیزہ ہیں، اور جنات فاسق اور گنہگار) یعنی ملائکہ کے لئے نور و نار کا لفظ ان کی استعداد خیر و شر کی تمثیل کے لئے ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ نور سے مراد جوہر مضئ (روشن جوہر) ہے اور نار کے معنی بھی یہی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ نار کی روشنی مکدر اور دھوئیں سے مخلوط ہوتی ہے اور اس سے پرہیز کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اس میں شدید حرارت اور احراق (جلانا) پایا جاتا ہے، جب وہ صاف اور ستھری ہو جائے تو وہی نار نورِ محض ہو جاتی ہے"۔

اسی طرح تفسیر روح المعانی میں صاحبِ روح المعانی فرماتے ہیں:

"و کون الملائکة لا یستکبرون وھو قد استکبر لا یضرا ما لان الملائکة من لیس بمعصوم وان کان الغالب فیھم العصمة علی العکس منا وفی عقیدة ابی معین نسفی مایوئد ذلک واما لان ابلیس سلبه الله تعالیٰ الصفات الملکیة والبسه ثیاب الصفات الشیطانیة فعصی عند ذلک والملک مادام ملکا لا یعصی الخ"۔

"اور فرشتوں کا متکبر نہ ہونا اور ابلیس کا متکبر ہونا اس دعویٰ کے لئے مضر نہیں کہ شیطان ملائکہ سے تھا، اس لئے کہ ملائکہ میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جو معصوم نہیں اگرچہ غالب ان میں عصمت ہی ہے، ہمارے برعکس اور عقیدۂ ابی معین نسفی سے اس کی تائید ہوتی ہے، یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے صفات ملکیہ کو سلب کر کے اسے

صفاتِ شیطانیہ کا لباس پہنادیا تھا، اس لئے اس نے عصیاں کیا، اور فرشتہ جب تک لباس ملکیت میں رہے عصیاں نہیں کرتا"۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وکونہ مخلوقًا من نار وھم مخلوقون من نور غیر ضار أیضا ولا قادح فی ملکیتہ لان النار والنور متحدا المادة بالجنس واختلافھما بالعوارض علی ان ما فی اثر عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنھا من خلق الملائکة من النور جار مجری الغالب والا خالفہ کثیر من ظواھر الاٰثار اذفیھا ان اللہ تعالیٰ خلق ملائکة من نار وملائکة من ثلج وملائکة من ھذا وھذہ الخ" (تفسیر روح المعانی، پ ۱، ص ۲۱۱)

"نیز ابلیس کا نار سے مخلوق ہونا، حالانکہ ملائکہ نور سے مخلوق ہیں ابلیس کی ملکیت میں ضرر و قدح پیدا نہیں کرتا، اس لئے کہ نار و نور جنس میں متحد المادہ ہیں، ان کا اختلاف محض عوارض سے ہے، علاوہ ازیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں جو وارد ہوا ہے کہ ملائکہ نور سے مخلوق ہیں، اکثریت کے لحاظ سے ہے ورنہ بہت سے ظواہر آثار اس کے خلاف ہیں، کیونکہ روایات کثیرہ میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتوں کو نار سے پیدا کیا، اور بعض کو برف، اور بعض کو اس چیز سے، اور بعض کو اس چیز سے"۔

اور تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"(اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ) ھذا یدل علی ان ابلیس کان من الملائکة لصحة الاستثناء کما مر عن ابن عباس فعلی ھذا لا

یکون الملائکۃ کلھم معصومین بل الغالب منھم العصمۃ کما ان بعضا من الانس معصومون والغالب منھم عدم العصمۃ"۔ (تفسیر مظہری، جلد اوّل، ص ۵۶)

"آیہ کریمہ (فَسَجَدُوٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا کیونکہ یہاں استثناء (متصل) صحیح ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول گزر چکا ہے، اس تقدیر پر کل ملائکہ معصوم نہیں ہوں گے، بلکہ ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ان میں غالب عصمت ہے، جیسا کہ بعض انسان (حضرات انبیاء علیہم السلام) معصوم ہیں، اور اکثر و بیشتر انسان غیر معصوم ہیں"۔

اس کے بعد صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں :

"او یقال النور والنار حقیقۃ واحدۃ والامتیاز بینھما بالتھذیب والصفأ وبدونہ قولہ تعالیٰ وَجَعَلُوۡا بَیۡنَہٗ وَبَیۡنَ الۡجِنَّۃِ نَسَبًا وھو قولھم الملائکۃ بنات اللہ دلیل علی اتحاد حقیقتھما واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"۔ انتہیٰ

(تفسیر مظہری، پ ۱، ص ۵۶)

"یا یہ کہا جائے کہ نور و نار حقیقت واحدہ ہیں اور ان کے درمیان جو امتیاز ہے وہ محض تہذیب وصفا کے ہونے اور نہ ہونے سے ہے، یعنی نور صاف ستھرا مہذب و مصفّٰی ہوتا ہے، اور نار میں وہ پاکیزگی اور صفائی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان نسب قائم کر دیا، اور وہ نسب قائم کرنا یہ ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اس بات پر

روشن دلیل ہے کہ جنات اور ملائکہ کی حقیقت ایک ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی حقیقت حال کو خوب جانتا ہے"۔ انتہیٰ

ان تمام عبارات سے وہ تمام شکوک اور شبہات زائل ہو گئے جو ہمارے بیان میں پیدا ہو سکتے تھے، دلائل کی روشنی میں جنات کا از قبیل ملائکہ ہونا اور ان میں توالد و تناسل کا پایا جانا ہم ثابت کر چکے ہیں، اَب ہم اس بات پر دلیل لاتے ہیں کہ جنات (جو دراصل ملائکہ ہیں) کھانا بھی کھاتے ہیں اور ان کے لئے طعام کا ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے، بخاری شریف میں ہے:

"عن ابی هريرة انه كان يحمل مع النبی ﷺ اداوة لوضوءه وحاجته فبينما هو يتبعهٗ بها فقال من هذا فقال انا ابو هريرة فقال النبی اجارا استنفض بها ولا تأتنی بعظم ولا بروثة فاتيته باحجار احملها فی طرف ثوبی حتی وضعت الی جنبه ثم انصرفت حتی اذا فرغ مشيت فقلت مابال العظم والروثة قال هما من طعام الجن وانهٗ اتانی وفد جن نصيبين ونعم الجن يسألونی الزاد فدعوت الله لهم ان لا يمروا بعظم ولا بروثة الا وجدوا عليها طعاما"۔ انتہیٰ

(بخاری شریف، جلد اوّل، ص ۵۴۴)

"حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ حضور کی حاجت اور وضو کے لئے پانی کا برتن اُٹھا کر چلا کرتے تھے، اس اثناء میں کہ وہ حضور ﷺ کے پیچھے چل رہے تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! یہ کون ہے؟ حضرت ابو ہریرہ نے کہا حضور! میں ابو ہریرہ ہوں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! میرے لئے

ڈھیلے تلاش کرو جن سے میں استنجا کروں اور ہڈی اور لید نہ لانا،
حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے کپڑے کے کنارے میں
ڈھیلے رکھ کر لایا اور حضور کے قریب رکھ کر واپس چلا گیا، جب حضور
فارغ ہو گئے تو میں حضور کے ساتھ چلا اور میں نے عرض کیا کہ حضور
ہڈی اور لید کا کیا حال ہے کہ حضور نے ان کے لانے سے منع فرمایا،
فرمایا یہ دونوں چیزیں جنات کا طعام ہیں، میرے پاس (شہر)
نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور وہ جنات بہت اچھے ہیں،
انہوں نے مجھ سے کھانا مانگا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ کسی
ہڈی اور لید پر نہ گزریں مگر اس پر طعام پائیں"۔

ظاہر ہے کہ کھانے کے ساتھ پینا اور کھانے پینے کے لئے پیشاب پاخانہ کرنا لوازمات و مسلمات سے ہے، اَب عامر صاحب بتائیں کہ نور کے وہ من گھڑت لوازمات جو انہوں نے بیان کئے ہیں ان کا کیا حال ہے؟

جو لوگ ملائکہ کی مثال دے کر حضور سرور عالم ﷺ کی نورانیت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اگر نور ہوتے تو فرشتوں کی طرح کھانے پینے، شادی کرنے، توالد و تناسل و دیگر اوصاف بشریت سے لاتعلق ہوتے۔

بر تقدیرِ تسلیم عرض کروں گا کہ انہیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ فرشتوں کے لئے یہ سب امور محال عقلی نہیں بلکہ محال عادی ہیں، جن کا وقوع بطور خرق عادت ممکن ہے، دیکھئے جن فرشتوں کے لئے کھانا پینا اور شادی کرنا محال ہے ان کے لئے باقی اوصاف بشریت سے متصف ہونا بھی محال ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا بعض اوصاف بشریہ سے متصف ہو کر دنیا میں آنا قرآن و حدیث سے ثابت ہے، حضرت

ابراہیم علیہ السلام کے پاس حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری لے کر بوصف بشری فرشتے دنیا میں آئے تھے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حضرت عزرائیل (ملک الموت) علیہ السلام جامۂ بشریت میں حاضر ہوئے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان کو طمانچہ مارا جس کی وجہ سے ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں وارد ہوا، یہ ضروری ہے کہ وہ صدمہ ان کی بشریت پر آیا تھا جس سے ان کی ملکیت متاثر نہیں ہوئی، لیکن احوال بشریہ کا فرشتوں پر طاری ہونا اور اوصاف بشریت سے نوری فرشتے کا متصف ہونا بہر حال اس واقعہ سے ثابت ہو گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس انسانی لباس میں فرشتے آئے، علیٰ ہذا حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام لباس بشریت میں تشریف فرما ہوئے، اور حضور سیّد عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بصورت حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض اوقات اجنبی صورت میں حاضر ہوئے جیسا کہ صحیحین کی روایت میں وارد ہے، اس حدیث میں "شدید سواد الشعر" کے الفاظ بھی موجود ہیں جس کے معنی ہیں سخت سیاہ بالوں والے، ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ سیاہی کو ظلمت سے اور سپیدی کو نور سے مناسبت ہے، جبرئیل علیہ السلام کا لباس نہایت سپید تھا اور بال نہایت کالے تھے، بتائیے جبرئیل علیہ السلام نوری ہیں یا نہیں؟ جب وہ نوری ہیں تو نور میں سیاہی کیسی؟ کیا کوئی عقل مند انسان نور کو سیاہ سمجھ سکتا ہے، ہر گز نہیں بلکہ یہی کہنا پڑے گا کہ نور میں سیاہی محال ہے، اور سیاہ بالوں والا ہونا بشری اوصاف میں سے ہے، مگر اس کے باوجود جبرئیل علیہ السلام اس سے متصف ہوئے اور محال عادی واقع ہوا۔

جب یہ اوصاف بشریہ نورانی مخلوق میں خرق عادت کے طور پر پائے جا سکتے ہیں تو کھانا، پینا، توالد و تناسل، باپ بیٹا ہونا کیوں نہیں پایا جا سکتا؟ آپ کہیں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب فرشتے لباس بشری میں آئے تو ابراہیم علیہ السلام ان

کے لئے گائے کا ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے، اور کھانے کے لئے ان کے آگے رکھ دیا، جب دیکھا کہ یہ نہیں کھاتے تو ابراہیم علیہ السلام اپنے دل میں خوفزدہ ہوئے، فرشتوں نے کہا آپ خوفزدہ نہ ہوں ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم لوط پر عذاب لے کر آئے ہیں، اگر فرشتوں کے لئے کھانا پینا ممکن تھا تو انہوں نے کیوں نہ کھایا؟

میں عرض کروں گا کہ نہ کھانا اس بات کی دلیل نہیں کہ ان کے لئے کھانا عقلاً محال تھا، عدم وقوع سے عدم امکان ثابت نہیں ہوتا، اگر حکمت ایزدی اور مشیت ایزدی اس کی مقتضی ہوتی تو ضرور اس کا وقوع ہو جاتا، اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت کے مطابق ہوتا ہے، فرشتے جس کام کے لئے بشری اوصاف لے کر آئے تھے اس کام کو انجام دینے کے لئے اسی قدر اوصاف بشریت کا ہونا مقتضائے حکمت تھا، جو انہیں دیئے گئے تھے اور نبی کریم ﷺ کو جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا اس کی انجام دہی کے لئے ان تمام اوصاف بشریت کا ہونا حکمت کے مطابق تھا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام لے کر تشریف لائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ حضور ﷺ خداوند تعالیٰ کی طرف سے معلم بن کر تشریف لائے، نوع بشر کو اپنی بشریت کے ہر شعبہ میں اور حیات کے ہر مرحلہ پر ایک نمونہ اور اسوہ درکار تھا اس لئے حکمت الٰہیہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ نوع بشر کے ہر شعبہ حیات میں تعلیم دینے کے لئے حضور سیّد عالم ﷺ کو بشریت کے وہ تمام اوصاف دیئے جائیں جو اس حکمت کے پورا ہونے کے لئے ضروری ہیں، اگر فرشتے بھی اسی منصب تبلیغ و تعلیم پر مامور ہو کر آتے تو یقیناً انہیں بھی بشریت کے وہ جملہ اوصاف دیئے جاتے جو حضور نبی کریم ﷺ کو عطا فرمائے گئے، اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا (الانعام) اگر ہم کسی فرشتے کو نبی بنا کر بھیجتے تو اسے بھی رجل ہی بناتے رجل مرد بالغ کو کہتے ہیں جو نوع بشر کا فرد

ہے، معلوم ہوا کہ نوری مخلوق کو حکمت تعلیم کے لئے بشری اوصاف ملنا اس کے نوری ہونے کے منافی و معارض نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

رہا یہ شبہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کا علم نہ ہوا اور وہ خوف زدہ ہوئے، اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام (معاذ اللہ) بے علم اور کمزور دل ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لاعلمی نہیں بلکہ بے توجہی ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوبوں پر جب کسی خاص حالت کا غلبہ ہوتا ہے تو اُن کا دھیان بعض اوقات کسی امر معلوم کی طرف نہیں ہوتا، ابراہیم علیہ السلام انتہائی کریم النفس اور مہمان نواز تھے، آنے والے فرشتے چونکہ بشکل مہمان آئے تھے، انہیں دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وصف کریمی اور جذبۂ اکرام ضیف یعنی مہمان نوازی کا ذوق قوت سے فعل میں آگیا اور اس وصف جمیل کا ان کی ذات مقدسہ پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس وقت اس غلبۂ حال میں ان کی توجہ آنے والوں کی ملکیت کی طرف مبذول نہ ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ حال اور یہ وصف حال محمود اور وصف جمیل ہے جو موجب تعریف اور باعث مدح ہے اس لئے اس وصف جمیل کا غلبہ ابراہیم علیہ السلام کے حق میں (معاذ اللہ) کسی جرح وقدح کا موجب نہیں ہوسکتا بلکہ مدح وثناء اور ان کی تعریف کا باعث ہوگا، تعجب اس امر پر ہے کہ جہاں کوئی لفظ لاعلمی پر دلالت نہیں کرتا وہاں ان لوگوں کو لاعلمی نظر آگئی، مگر قرآن مجید ہی کے اندر انہیں یہ آیت نظر نہ آئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ (سورۃ الانعام)

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو تمام آسمانوں اور زمینوں کے

ملک دکھائے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں"۔

یہ لوگ ذرا غور کریں کہ وہ فرشتے جو انسانی لباس میں آئے تھے مَلَکُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں شامل تھے یا نہیں؟ جب شامل تھے تو ابراہیم علیہ السلام کے احاطۂ رویت سے انہیں کس طرح خارج کیا جاسکتا ہے؟ پھر لطف یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہی واقعہ جس میں فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے اس امر کی روشن دلیل ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کے ارحام میں آنے سے پہلے ہی ان کی پیدائش کا علم نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلکہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام کو بھی ہو گیا تھا، جو دلیل محبوبانِ خدا کے کمال کی مثبت ہو اُسے (معاذ اللہ) عیب ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جانا ع

"بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

اس عدم التفات کی مفصل بحث ان شاء اللہ ہم کسی دوسری فرصت میں کریں گے، سردست اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ مومن بسا اوقات معتقداتِ دینیہ اور احکامِ الٰہیہ (جن پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، مثلاً کھانے پینے یا دیگر حوائج بشریہ کے پورا کرنے میں مصروف ہے یا نیند کی حالت میں ہے، یا خدانخواستہ کسی رنج والم اور صدمہ و تکلیف کے حال میں مبتلا ہے، اس وقت اس کی توجہ قیامت، حشر و نشر، دوزخ و جنت، جزا و سزا وغیرہ امور کی طرف مبذول نہیں، مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس وقت اسے ان چیزوں کا علم بھی نہیں، کیونکہ علم کی نفی تصدیق کی نفی کو مستلزم ہے اور تصدیق کی نفی ایمان کی نفی ہے تو (معاذ اللہ) ایسے حال میں وہ مومن نہ رہیگا؟ بلکہ کافر قرار پائے گا؟ حالانکہ وہ اس وقت بھی مومن ہے، معلوم ہوا کہ کسی حال کے غلبہ کے باعث اگر کسی امر معلوم کی طرف توجہ نہ رہے تو اس سے علم کی نفی لازم نہیں آتی، اسی طرح حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار واقعات پیش آئے لوگوں

نے علم کی نفی سمجھی حالانکہ صرف توجہ اور التفات کی نفی تھی، چونکہ انبیاء علیہم السلام کی توجہ اور عدم توجہ دونوں اللہ تعالیٰ کی خاص حکمتوں سے وابستہ ہیں اس لئے کبھی عدم التفات کا حال جلدی ختم ہو جاتا ہے اور کبھی دیر تک باقی رہتا ہے، کچھ بھی ہو بہر نوع توجہ کی نفی سے علم منتفی نہیں ہوتا، یہی حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا جس کو لوگوں نے نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی کا اقرار کرنے کی بجائے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو لاعلم کہہ دیا۔

اَب خوفزدہ ہونے کے پہلو کو سامنے لائیے، بے شک ابراہیم علیہ السلام خوفزدہ ہوئے، مگر یاد رکھئے کہ یہ خوف کسی مخلوق سے نہیں جو کہ کمزور دل ہونے کی دلیل بن جائے بلکہ اس کا منشاء یہ تھا کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر یہ امر منکشف ہوا کہ یہ آنے والے فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لے کر آئے ہیں اور عذاب الٰہی اگرچہ نافرمانوں کے لئے تھا لیکن انبیاء علیہم السلام چونکہ قرب و معرفت الٰہی کے اعلیٰ مقام پر ہوتے ہیں اس لئے خوف اور خشیت الٰہی جس قدر انہیں لاحق ہوتا ہے کسی دوسرے کو لاحق نہیں ہوتا، ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "انا اعلمکم باللہ واخشاکم معہ" (بخاری)

"مَیں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں"، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا

وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ (سورۃ الرحمٰن)

"جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔"

لٰہذا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خوف الٰہی سے متاثر ہونا بھی ان کے کمزور دل ہونے کا مثبت نہیں بلکہ ان کے کمال قرب و معرفت کی دلیل ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جو فرشتے کھانے پینے، توالد و تناسل سے بے تعلق ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ نور کے لئے یہ چیزیں عقلاً محال ہیں بلکہ صرف یہ وجہ ہے کہ ان کے لئے ان امور کا ہونا مقتضائے حکمت کے خلاف ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ میں ان امور کا پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ حضور ﷺ نورانیت سے خالی ہم جیسے بشر ہیں، بلکہ نور ہونے کے باوجود جملہ اوصاف بشریہ جو مذکور ہوئے منصب نبوت کے مناسب اور حکمت تعلیم و تکمیل دین کے لئے ضروری تھے۔

ایک اشکال اور اس کا حل

شاید آپ کہیں کہ فرشتے کی تعریف یہی ہے کہ وہ ایک ایسا نورانی جوہر ہے جو اشکال مختلفہ میں متشکل ہوتا ہے اور اس میں مذکر و مؤنث نہیں پایا جاتا، اس تعریف سے معلوم ہوا کہ جن امور کو آپ اوصاف بشری اور ملائکہ کے حق میں انہیں محال عادی کہہ رہے ہیں وہ سب اشکال محضہ ہیں جو فرشتوں کے لئے عادت ہیں اور انہیں اوصاف بشریہ قرار دے کر ملائکہ کے حق میں محال عادی کہنا درست نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شکل اس ہیئت کو کہتے ہیں جو کسی مقدار کو متناہی کی جہت سے حاصل ہو، اس ہیئت کا حصول ملائکہ کے حق میں قطعاً امر عادی ہے، ہم نے اسے نہ اوصاف بشریہ میں شمار کیا نہ فرشتوں کے لئے محال عادی کہا لیکن ملائکہ کے لئے صرف شکل بشری ہی نہیں بلکہ دیگر اوصاف بشریت بھی ثابت ہیں، صحیحین کی حدیث میں جبرئیل علیہ السلام کے لئے شدید بیاض الثیاب، شدید سواد الشعر کے الفاظ وارد ہیں جن کے معنی ہیں نہایت سفید کپڑوں والے، سخت سیاہ بالوں والے، اور اس کے بعد اَسْنَدَ رکبتیه الی رکبتیه ووضع کفیه علی فخذیه بھی وارد ہے، جس کے معنی ہیں جبرئیل علیہ السلام نے اپنے دونوں گھٹنے حضور ﷺ کے گھٹنوں سے

ملا دیئے اور اپنی دونوں ہتھیلیاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یا اپنی رانوں پر رکھ دیں۔

ظاہر ہے کہ نورانیت محضہ ایسی چیز نہیں جس کے لئے کپڑے پہننا، سیاہ بالوں والا ہونا، اور گھٹنے سے گھٹنہ ملانا اور ہتھیلیوں کا رانوں پر رکھنا متصور ہو، بلکہ نورِ محض کے لئے تو سیاہی، بال، گھٹنا، ہتھیلی اور ان کا وجود ہی ممکن نہیں، اسی طرح شکل محض کے بارے میں بھی یہ امور متحقق نہیں ہو سکتے، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ جبرئیل علیہ السلام جو نورِ محض ہیں صرف شکل بشری نہیں بلکہ وصف جسمانیت بھی لے کر آئے تھے، علاوہ ازیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لطمہ (طمانچہ) بھی اس امر کی دلیل ہے کہ ملک الموت جو ایک مقرب فرشتہ ہے محض شکل بشری میں نہ تھا، کیونکہ شکل تو ایک ہیئت کا نام ہے اس کو مارنا قطعاً امرِ غیر معقول ہے، پھر ملک الموت کی آنکھ پھوٹنا بھی اس امر کی قوی دلیل ہے کہ وہ محض شکل بشری میں نہ تھے بلکہ وصفِ بشری تھا، کیونکہ شکل کا پھوٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ ملائکہ محض شکلِ انسانی نہیں بلکہ اوصاف بشریہ سے بھی بطور خرق عادت متصف ہو سکتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اگر سوال کیا جائے کہ توالد و تناسل، کھانا پینا، بول و براز، خون اور تھوک، صحت و مرض، استقرار فی الارض ایسے امور ہیں جو لوازم و خواص بشریت سے ہیں، انہیں محض مقتضیات و مناسبات یا اوصاف بشریت سے کیوں تعبیر کیا گیا تو میں جواباً عرض کروں گا کہ امور بشریت کے خواص ولوازمات سے نہیں بلکہ محض مقتضیات و مناسبات اور اوصاف بشریت ہی سے ہیں، اس لئے کہ خاصہ کے معنی ہیں ما توجد فیہ ولا توجد فی غیرہ حالانکہ یہ امور بشریت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وحوش و بہائم اور دیگر حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر اوصاف جنات میں بھی موجود ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ گائے، بیل، گھوڑا، گدھا، اونٹ، بکری، شیر، ہاتھی،

سب جانوروں میں توالد وتناسل، کھانا پینا، بول و براز، خون، تھوک، صحت ومرض، استقرار فی الارض کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور جنات میں توالد وتناسل، کھانا، پینا وغیرہ ہم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں، اگر یہ امور خواصِ بشریت قرار دے دیئے جائیں تو جنات وحیوانات میں ان کا پایا جانا کیونکر صحیح ہوگا۔

رہا یہ امر کہ یہ لوازمات کیوں نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ لازم کی تعریف یہ ہے کہ مایمتنع انفکاکہ عن الشیء جس کا کسی شئے سے جدا ہونا محال ہو وہ اس کا لازم ہے، ہزاروں افرادِ انسانی ایسے ہیں جن میں توالد وتناسل نہیں پایا جاتا اور ان میں اس کی صلاحیت بھی مفقود ہوتی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں کسی مرد کو دخل نہیں، حوا علیہا السلام کے پیدا ہونے میں کسی عورت کا وجود نہیں، آدم علیہ السلام کی خلقت مرد وعورت دونوں سے لاتعلق ہے، عیسیٰ علیہ السلام باوجود بشریت کے عنصری غذا کھانے پینے، بول وبراز، بیماری وآزاری وغیرہ امور سے بری ہیں اور ان کا استقرار بھی زمین کی بجائے آسمان پر ہے جہاں عنصری اور مادی آلائشوں سے وہ بالکل لاتعلق ہیں، اگر ان امورِ مذکورہ کو لوازم بشریت سے مانا جائے تو کوئی فردِ بشر ان اوصاف میں سے کسی ایک وصف سے بھی کسی وقت خالی نہیں رہ سکتا، لیکن یہ خلو اور انفکاک ثابت و متحقق ہے، معلوم ہوا کہ امورِ مذکورہ نہ خواصِ بشریت سے ہیں نہ لوازمات بشریت سے بلکہ مقتضیات اور مناسباتِ بشریت سے ہیں اور بس۔

اور اگر حقائق سے چشم پوشی کر کے امورِ مذکورہ کو خواص اور لوازم مان ہی لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ یہ خواص بشر کے علاوہ جن حیوانات میں پائے جاتے ہیں وہ سب بشر ہیں اور لوازماتِ مذکورہ جن افراد بشر میں نہیں پائے جاتے وہ سب بشریت سے خارج ہیں، اس تقدیر پر جملہ حیوانات بشر ہو جائیں گے اور وہ ہزاروں افراد بشر جن میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے سب بشریت سے خارج متصور ہوں

گے، جو صراحۃً باطل ہے۔

اور اگر اس ساری بحث سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی حضور ﷺ کی نورانیت پر حرف نہیں آتا، کیونکہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے وجود اقدس میں بشریت بھی ہے اور نورانیت بھی، یہ علیحدہ امر ہے کہ بشریت محمدی ہر قسم کی کثافت وغلاظت اور جملہ عیوب ونقائص بشریہ سے پاک ہے لیکن بہر نوع وجود اقدس میں نورانیت کے ساتھ بشریت بھی ضرور پائی جاتی ہے، قرآن مجید میں حضور ﷺ کے متعلق "قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ" بھی آیا ہے اور "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" بھی وارد ہے، لہٰذا بشریت کے لئے مناسبات بشریہ کا ہونا عین حکمت کے مطابق ہے، اسی طرح نورانیت کے لئے مناسبات نورانیت کا ہونا بھی ضروری اور لابدی ہے۔

لیکن اس مقام پر یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ ہر چیز کے مناسبات اس کے لئے عادت کہلاتے ہیں اور جو امور اس کے مناسبات سے نہیں وہ اس کے حق میں خرق عادت قرار پاتے ہیں، کسی چیز میں امور عادیہ کا پایا جانا حیرت کا موجب نہیں ہوتا لیکن خرق عادت کا ظہور یقیناً حیرت کا سبب ہوتا ہے، مثلاً گائے بیل کے لئے زمین پر رہنا عادت ہے اور مچھلیوں کے لئے پانی میں رہنا، اسی طرح پرندوں کے لئے ہوا میں اُڑنا عادت ہے اور چیونٹیوں وغیرہ حشرات الارض کے لئے زمین میں رہنا اور زمین پر چلنا، اَب اگر مثلاً گائے بیل اور مچھلیاں ہوا میں اُڑنے لگیں اور آسمان پر اُڑنے والے پرندے پانی میں دوڑنے لگیں اور چیونٹیاں وغیرہ زمین میں رہنے والے کیڑے پانی میں رہائش اختیار کر لیں یا فضاؤں میں اُڑنے لگیں تو یہ امور ان کے لئے خرق عادت ہونے کی وجہ سے حیرت واستعجاب کا موجب ہوں گے، اور یہ اس بات کی علامت قرار پائیں گے کہ ان چیزوں میں غیر معمولی استعداد موجود ہے جو اپنے عواقب ونتائج کے حسن وخوبی کے اعتبار سے ان کی خوبی اور کمال کی دلیل ہو سکتے ہیں۔

بشریت ونورانیت کے مقتضیات ومناسبات کو بھی اسی نہج پر سمجھنا چاہئے، کھانا پینا، توالدوتناسل، بیماری، تندرستی، بھوک پیاس، زمین پر چلنا، جسم کا زخمی ہونا، بدن سے خون نکلنا، پیشاب وغیرہ دیگر فضلات کا پایا جانا، امور بشریت کے مقتضیات اور اس کے مناسبات ہیں جو بشریت کے حق میں قطعاً امور عادیہ ہیں، اس کے برخلاف کھانے پینے، بیماری تندرستی، بھوک پیاس، توالدوتناسل، زخمی ہونے، خون بہنے اور پیشاب وغیرہ سے لاتعلق ہونا نورانیت کے مناسبات ومقتضیات ہیں اور یہ جملہ امور نورانیت کے لئے یقیناً امور عادیہ ہیں، جس طرح بشریت ونورانیت میں سے ہر ایک کے مناسبات اس کے حق میں امور عادیہ ہیں اسی طرح ان میں سے ہر ایک کے مناسبات دوسرے کے لئے غیر عادیہ ہیں، اگر بشریت کے مناسبات نورانیت کے ساتھ پائے جائیں تو وہ اس کے لئے خرق عادت ہوں گے اور اسی طرح نورانیت کے مناسبات بشریت کے ساتھ پائے جائیں تو وہ اس کے لئے خرق عادت قرار پائیں گے۔

جن لوگوں نے حضور سیّد عالم ﷺ کے احوال بشریہ کو دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا جیسا سمجھ لیا انہوں نے انتہائی تنگ نظری کا ثبوت دیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدسہ میں جس طرح بشریت پائی جاتی ہے اسی طرح نورانیت بھی پائی جاتی ہے اور جب بشریت ونورانیت دونوں موجود ہیں تو دونوں کے مقتضیات ومناسبات کا پایا جانا بھی ضروری ہے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو پیش نظر رکھا جائے لیکن تنگ نظر لوگوں نے حضور ﷺ کے کھانے پینے کو تو دیکھ لیا اور یہ نہ دیکھا کہ "نہ کھانا پینا" بھی حضور ﷺ کی صفت ہے، چنانچہ صحیحین کی حدیث میں وارد ہے کہ حضور ﷺ پے در پے نفلی روزے اس طرح رکھتے تھے کہ دن کو بھی روزہ رات کو بھی روزہ اور یہ صوم وصال مسلسل کئی دن تک جاری رہتا تھا اور اس نہ کھانے پینے کی وجہ

سے حضور ﷺ کی ذات مقدسہ میں ذرہ برابر کمزوری اور ضعف کا اثر پیدا نہ ہوتا تھا، بعض صحابہ کرام نے بھی یہ وصال کا روزہ رکھنا شروع کیا اور دو تین دن میں ایسے کمزور ہو گئے کہ ضعف کی وجہ سے چلتے چلتے گر جاتے تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا یہ حال دیکھ کر ارشاد فرمایا "ابیت عند ربی وھو یطعمنی ویسقینی ایکم مثلی" یعنی میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے، تم میں کون میری مثل ہے، اور بخاری شریف کی ایک حدیث میں اس مقام پر "ایکم مثلی" کی بجائے "لَسْتُ مِثْلَکُمْ" وارد ہے، یعنی میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔

دیکھئے جس طرح بشریت کی مناسبت سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کھانا پینا ثابت ہے بالکل اسی طرح نورانیت کی مناسبت سے نہ کھانا اور نہ پینا بھی ثابت ہے، اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بتقاضائے بشریت بھوک پیاس کے حال سے متصف ہونا اور بیماری وتندرستی کے ماحول سے گزرنا یقیناً ثابت ہے، لیکن بتقاضائے نورانیت حضور ﷺ کے آثار شریفہ سے لوگوں کی بھوک پیاس کا دُور ہو جانا اور بیماریوں کا زائل ہونا بھی ثابت ہے، بلکہ جُبہ مبارکہ کی برکت سے بیماروں کا شفایاب ہونا حقیقت ثابتہ ہے، دیکھئے مسلم شریف میں وارد ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جبہ سے بیماروں کے لئے شفا حاصل کرتے تھے (مسلم شریف، جلد اوّل، کتاب اللباس والزینۃ، مطبوعہ دار المغنی، ریاض سعودی عربیہ، ص ۱۴۷)، پیشاب فرمانے، پسینہ مبارک آنے اور دیگر فضلات شریفہ کے جسم اقدس میں پائے جانے پر تو نظر رکھی مگر یہ نہ دیکھا کہ پسینہ اقدس فضلات شریفہ ایسے معطر و معنبر اور خوشبودار تھے کہ دنیا کی کوئی خوشبو ان کی خوشبو کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی اور فضلات لطیف ونظیف اور طیب وطاہر تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بتقاضائے بشریت زمین پر چلنا یقیناً حق ہے لیکن بتقاضائے نورانیت

آسمانوں پر تشریف فرما ہونا بلکہ عرش الٰہی پر خرام ناز فرمانا بھی ثابت ہے، بے شک مناسبات بشریہ کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام توالد وتناسل کی صفت سے متصف ہیں اور آدم علیہ السلام کی اولاد میں یقیناً شامل ہیں لیکن بتقاضائے نورانیت اوّل خلق بھی حضور ہی ہیں، اور آدم علیہ السلام ودیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے قبل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلقت واقع ہوئی جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہوا، "انا اولھم خلقًا" یعنی میں تمام انبیاء علیہم السلام سے پہلے پیدا ہوا ہوں، ترمذی شریف کی ایک حدیث میں وارد ہے کہ میں اس وقت نبی تھا، جب آدم علیہ السلام جسم اور روح کے درمیان تھے، گویا بشریت کے اعتبار سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ اور اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے بیٹے ہیں، لیکن اپنی نورانیت کے لحاظ سے آدم واولاد آدم سب کی اصل ہیں لاریب! حضور ﷺ جہاد کے موقع پر بارہا زخمی ہوئے اور بتقاضائے بشریت بدن مبارک سے خون اقدس کے قطرے بھی ٹپکے، لیکن کئی بار شق صدر مبارک ہوا اور بتقاضائے نورانیت خون کا ایک قطرہ بھی جسم شریف سے نہیں نکلا نہ زخم ہوا نہ تکلیف ہوئی نہ دوا دارو کی حاجت واقع ہوئی۔

علیٰ ہذا القیاس حضور سرور عالم ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ شریفہ میں شب کی نماز پڑھتے تھے، حجرہ مبارکہ میں چراغ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا ہوتا تھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سجدہ فرماتے تو حضرت اُم المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جسم اقدس کو اپنے دست مبارک سے ذرا دبا دیتے تو اُم المومنین حضور کے سجدہ کے لئے جگہ چھوڑ دیتیں، ذات مقدسہ میں باوجود نورانیت ہونے کے اُجالا نہ ہونا بشریت کا مقتضا تھا لیکن حضور سیّد عالم شب کی تاریکی میں جب راستہ پر چلتے تو حضور ﷺ کے نور سے دیواریں روشن ہو جاتیں دیکھئے بیہقی شریف کی حدیث میں ہے:

"وقال ابو ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ واذا ضحک صلی اللہ علیہ وسلم یتلالؤ فی الجدر رواہ البزار والبیہقی ای یضیء فی الجدر بضم الجیم والدال جمع جدارٍ وھو الحائط ای یشرقُ نورہٗ علیھا اشراقًا کاشراقِ الشمس علیھا۔ انتھٰی"

(مواہب اللدنیہ، جلد اوّل، ص ۲۷۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ جب ہنستے تھے تو حضور کا نور دیواروں پر چمکتا تھا اس حدیث کو امام بزار اور بیہقی نے روایت کیا، امام قسطلانی حدیث کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا نور دیواروں پر ایسا چمکتا اور روشن ہوتا تھا جیسے سورج کی روشنی دیواروں پر پڑتی ہے اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

رات کی تاریکی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے دیواروں کا روشن ہونا نورانیت کا مقتضا تھا، رہا یہ امر کہ اُم المومنین کے حجرہ میں اُجالا ظاہر نہ ہونے میں کیا حکمت تھی؟ تو میں عرض کروں گا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام مقتضیات بے شمار حکمتوں پر مبنی ہیں بالخصوص مقتضیات بشریہ میں جو چیز سب سے زیادہ واضح اور روشن ہے، وہ تبلیغ و تعلیم اور تکمیل دین کی حکمت ہے، اُم المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ شریفہ میں اگر اُجالا ظاہر ہوتا تو وہ حضور ﷺ کے سجدہ کے لئے خود بخود جگہ چھوڑ دیتیں اور حضور ﷺ کو بحالت نماز ان کے بدن کو چھونے کی نوبت نہ آتی، جب حجرہ شریفہ میں اُجالا نہ ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بدن کو مس فرمانے کا موقع بہم پہنچا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس عمل مبارک سے بادی النظر میں دین کے پانچ مسئلے مکمل ہو گئے اور اگر بنظر غائر دیکھا

جائے تو نہ معلوم اور کتنے مسائل نکلیں گے، وہ مسائل خمسہ حسب ذیل ہیں:

(۱) نماز میں عمل قلیل جائز ہے۔

(۲) عورت کے بدن کو ہاتھ لگنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(۳) عورت کو چھونا مفسد صلوٰۃ نہیں۔

(۴) بوقت ضرورت اندھیرے میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔

(۵) نمازی کے آگے عورت کے ہونے سے نماز میں فتور نہیں آتا۔

شاید کوئی کہے کہ آپ نے جو امور مقتضیات بشریت کے خلاف بیان کئے ہیں وہ سب حضور ﷺ کے معجزات ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ بے شک وہ جملہ امور بشریت کے اعتبار سے معجزات ہیں، لیکن جس طرح یہ امور معجزہ ہیں اسی طرح تمام مقتضیات بشریت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں معجزہ قرار پائیں گے، کیونکہ ہر وصف خارق عادت نبی کے حق میں معجزہ کی شان رکھتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اوصاف بشریہ حضور ﷺ کی نورانیت کے لئے یقیناً خارق عادت ہیں، لہٰذا اچھی طرح واضح ہو گیا کہ جس طرح حضور ﷺ کا عرش پر جانا بشریت کے اعتبار سے معجزہ ہے اسی طرح فرش پر رہنا نورانیت کے لحاظ سے معجزہ ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صوم وصال کے وقت مسلسل کئی دن اور کئی راتوں تک کھانے پینے سے لاتعلق رہنا بشریت کی نسبت سے معجزہ ہے اور حکمت تعلیم کے لئے کھانا پینا نورانیت کے اعتبار سے معجزہ ہے، شق صدر مبارک کے اوقات میں حضور ﷺ کے جسم اقدس سے خون مبارک کا نہ نکلنا بشریت کے حق میں معجزہ ہے اور جہاد کے مواقع میں خون اقدس کا نکلنا نورانیت کے لئے معجزہ ہے، پسینہ مبارک و دیگر فضلات شریفہ کا خوشبودار و معطر ہونا اور جسم اقدس کے جمیع متعلقات شریفہ کا طیب و طاہر ہونا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا معجزہ ہے اور نفس فضلات شریفہ کا پایا جانا نورانیت کا معجزہ ہے، لعاب دہن

مبارک سے لوگوں کی بھوک پیاس کا زائل ہو جانا اور جُبہ مبارکہ سے بیماروں کا شفایاب ہونا بشریت کی جہت سے معجزہ ہے اور حضور ﷺ پر خود بھوک پیاس اور بیماری کا عارض ہونا نورانیت کی نسبت سے معجزہ ہے، یہ علیحدہ امر ہے کہ اس عالم میں بشریت مطہرہ کے غلبہ اور ظہورِ تام کے باعث ان مقتضیات بشریہ کا بلحاظ نورانیت معجزہ ہونا غیر ظاہر ہو، لیکن حقیقت واقعیہ کے پیش نظر حضور ﷺ کے تمام اوصاف بشریہ معجزانہ شان رکھتے ہیں، علیٰ ہذا آدم واولادِ آدم علیہ السلام کی اصل ہونا بشریت کے لئے خرق عادت ہونے کی وجہ سے حسن وجمال ہے اور نسل بنی آدم میں پیدا ہو کر والدین ماجدین کا بیٹا ہونا نورانیت کے باعث خوبی وکمال ہے، مختصر یہ کہ حضور سیّد عالم ﷺ کے خواص نورانیت بالنسبۃ الی البشریت معجزات وکمالات ہیں اور اوصاف بشریت بالنسبۃ الی النورانیت کمالات ومعجزات ہیں اور ذاتِ محمدیہ ﷺ میں جب بشریت اور نورانیت دونوں جمع ہو گئیں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مجسم معجزہ اور کمال ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

فرشتہ نور ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ سے فرشتہ ہونے کی نفی وارد ہے چنانچہ ارشاد فرمایا "وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ" یعنی کہہ دو کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملک ہونے کی نفی ہو گئی تو نورانیت کی بھی نفی ہو گئی، اس کا ازالہ یہ ہے کہ ملک اور نور کے مابین تساوی کی نسبت نہیں کہ ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی ہو جائے، دوسرے یہ کہ حقیقت قول کی نفی وجودِ مقول کی نفی کو مستلزم نہیں، تیسرے یہ کہ ملک ایک خاص نوری مخلوق کو کہا جاتا ہے جس میں بشریت نہیں ہوتی، اگر حضور ﷺ کو ملک کہا جائے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ سے حقیقت بشری منتفی ہو جائے گی، حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام حقائق کائنات کے جامع ہیں، اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملک

کہنا جائز نہیں لیکن ملک نہ ہونے سے نور نہ ہونا لازم نہیں آتا، فرشتوں کے علاوہ بے شمار نوری افراد ہیں جو ملک نہیں مگر نور ہیں اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ملک نہیں مگر نور ہیں۔

یہ تمام گفتگو عامر صاحب کے من گھڑت لوازمات نور پر تھی، ناظرین کرام نے دیکھ لیا کہ حقائق کی روشنی میں عامر صاحب کے بیان فرمودہ لوازمات میں سے ایک لازمہ بھی صحیح ثابت نہ ہوا، اس سلسلہ میں اگرچہ ہمارا بیان کچھ طویل ہو گیا ہے مگر اس کے ذیل میں ایسے مسائل آ گئے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ طول باعثِ ملال نہ ہوگا۔

انسان کے لئے بے خبری اور لاعلمی کی حالت میں مکھی کیا زہر بھی کھا لینا ممکن ہے، لیکن دکھانے اور بتانے کے بعد کوئی ہوشمند ایک معمولی سی مضرت رساں چیز کھانا بھی گوارا نہیں کرتا۔

سایۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے میں عامر صاحب نے السعید کا ظل نمبر پڑھنے کے بعد اس کے تعاقب میں جو زہر کی گولیاں چبائیں اور جیتی مکھیاں کھائی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بصیرت و بصارت کی نعمت سے یکسر محروم ہیں، وہ خوش ہیں کہ ہم نے طعن و تشنیع کی بھر مار کر کے اور چند طنزیہ فقروں کی لوٹ پھیر کا چکر چلا کر عوام کے اذہان کو السعید کے پیش کردہ براہین کے وزن سے خالی کر دیا، اور سادہ لوح عوام کو سمجھا دیا کہ السعید کے دلائل کچھ نہیں، لیکن جوابِ تعاقب میں ہمارے مضمون کی چار قسطیں پڑھنے کے بعد ناظرین کرام پر واضح ہو گیا ہوگا کہ عامر صاحب کی یہ خوش فہمی کتنی دیر پا ثابت ہوئی، عامر صاحب کو اپنی طرزِ نگارش پر ناز ہے، وہ محض اپنی لفاظی کے بل بوتے پر دلائل و براہین کی ٹھوس حقیقتوں سے ٹکرا جاتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ لفظِ بے معنی جسمِ بے جان کی طرح بے وقعت اور بیکار ہوتا ہے۔

السعید نے دلائل و براہین کی شمشیر سے عامر صاحب کی ابلہ فریبیوں پر

ایسی کاری ضربیں لگائی تھیں جن کی تاب نہ لا کر سسکیاں لئے بغیر ہی ان کا خاتمہ ہو چکا تھا، لیکن عامر صاحب کی جسارت دیکھئے کہ انہیں اپنی لفاظی کا جامہ پہنا کر صرف زندوں کی صف میں نہیں بلکہ بہادر پہلوانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا اور ان کے سہارے پر ڈھٹائی کے ساتھ خم ٹھونک کر سامنے آ گئے۔ ع

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو

عامر صاحب کو المحن بالحجۃ (جھگڑالو) ہونے میں جو کمال حاصل ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا ایک حقیقت ثابتہ کو جھٹلانا ہے جس کی روشن دلیل ناظرین کرام کے سامنے موجود ہے کہ انہوں نے اپنی علمی اور استدلالی کمزوریوں اور بے مائیگی کو الفاظ کے جامے میں چھپانے کی انتہائی کوشش کی ہے مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کٹ حجتی حقانیت کی دلیل ہوتی تو ایسے لوگوں کے حق میں زبانِ رسالت سے قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ کی وعید صادر نہ ہوتی۔

خدا سے ڈریئے! اور خوف خدا کو دل میں جگہ دے کر السعید کے ظل نمبر میں پیش کردہ حقائق پر ایک دفعہ پھر ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے اور سوچئے کہ جن بنیادی امور کا آپ سے جواب نہ بن پڑا کس صفائی سے آپ نے انہیں نظر انداز کر دیا، نہیں بلکہ آپ انہیں شیر مادر کی طرح ہضم فرما گئے۔

میرے مضبوط دلائل کے سامنے طنزیہ انداز میں پھسپھسے الفاظ آپ نے کہے ہیں اور کمالات رسالت کا انکار کرنے میں جس عناد کا مظاہرہ کیا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ وہ زہر کے پیالے ہیں جنہیں آپ نے جان بوجھ کر پیا ہے اور جتنی مکھیاں ہیں جنہیں دیکھ بھال کر آپ نے کھایا ہے۔

آپ نے میری پیش کردہ ایک آیت قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ کے مقابلے میں بائیس آیات قرآنیہ اور اکیس عبارات مختلفہ بالکل بے محل

پیش کر کے حق چھپانے کی ناکام کوشش کی اور تقریباً چودہ صفحے کی طول نگاری میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ جس طرح دیگر آیات میں لفظ "نور" بطور استعارہ مستعمل ہے، اسی طرح اس آیت میں بھی استعارہ ہے، اور نور سے مراد نورِ حسّی حقیقی نہیں بلکہ علم وہدایت کا نور ہے۔

انشاء اللہ اگلے صفحات میں آپ کے استعارے پر مفصل گفتگو ہوگی، اور آپ کو معلوم ہوگا کہ اس بحث کو چھیڑ کر آپ کیسی دلدل میں پھنسے ہیں اور آپ کی اُلٹی منطق کنکھجورا بن کر کس طرح آپ کو چمٹی ہے۔

سردست آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے تعاقب میں آپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، لیکن جس نکتہ پر میں نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی تھی وہ ایسا سنگ گراں ثابت ہوا کہ آپ کسی طرح اسے نہ ہلا سکے، بلکہ آپ کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس کے قریب ہو کر بھی نہیں گزرے۔

عامر صاحب حضور ﷺ کے علم وہدایت کا نور ہونے میں اختلاف نہیں، وہ کون سا شقی ہے جو ہادیٔ عالم اور اعلم کائنات ﷺ کو علم وہدایت کا نور نہیں مانتا، اختلاف اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نورانیت فقط علم وہدایت میں منحصر ہے یا حسی حقیقی نورانیت کو بھی شامل ہے، جسے ضیاء، لمعان، روشنی اور چمک کہا جاتا ہے۔

عامر صاحب اگر سچ پوچھیں تو بتا دوں کہ آپ لوگ فی الحقیقت حضور ﷺ کو علم وہدایت کا نور بھی نہیں مانتے کیونکہ شب وروز آپ حضور ﷺ کے علم کی تنقیص میں لگے رہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو برأت صدیقہ کا علم نہ تھا، لیلۃ القدر کا علم نہ تھا، روح کا علم نہ تھا، مغیبات خمسہ کا علم نہ تھا وغیرہ، بے شمار جزئیات اور واقعات کے علم کی آپ لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے نفی کرتے رہتے ہیں، نیز ابو طالب کے ہدایت یافتہ نہ ہونے کو آپ لوگ حضور ﷺ کے ہادی نہ ہونے کی دلیل قرار دیا

کرتے ہیں، جب علم وہدایت دونوں کا انکار ہو گیا تو آپ کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہم حضور کو علم وہدایت کا نور مانتے ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ میں نے احادیث صحیحہ اور اقوال مفسرین کی روشنی میں اس حقیقت کو آفتاب سے زیادہ روشن کر کے دکھا دیا تھا کہ حضور ﷺ کا نور ہونا صرف ایک قسم کی نورانیت (علم وہدایت) میں منحصر نہیں بلکہ تمام قسم کی نورانیتیں حضور ﷺ کے لئے ثابت ہیں۔

حضور ﷺ کے جسم اقدس کی روشنی سے دیواروں کا روشن اور منور ہو جانا، دندان مبارک سے نورانی شعاعوں کا نظر آنا، چہرۂ انور اور پیشانی مقدسہ سے نور کی شعاعوں کا چمکنا یہ سب کچھ احادیث صحیحہ سے بحوالہ کتب و صفحات "السعید" کے ظل نمبر میں لکھ چکا ہوں، اور تشریح مزید کے لئے شارحین ومفسرین وعلماء متبحرین کے واضح اقوال نقل کر چکا ہوں، میرے مضمون میں (تفسیر) روح المعانی کی یہ عبارت بھی آپ نے پڑھی ہوگی جو میری پیش کردہ آیت کریمہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ کے تحت روح المعانی پ ۶، ص ۸۷ پر مرقوم ہے۔

"(قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ) ای نور الانوار والنبی المختار محمد صلی اللہ علیہ وسلم"۔

یعنی حضور ﷺ صرف نور نہیں بلکہ نور الانوار یعنی "سب نوروں کا نور" ہیں، "الانوار" نور کے تمام اقسام وافراد کو شامل ہے اور لفظ نور اس کی طرف مضاف بہ اضافت استغراقیہ ہے، جو مضاف الیہ کے جمیع افراد کو شامل ہے اور اس کا مفاد یہ ہے کہ عالم کا کوئی نور نہیں جس کا نور حضور ﷺ نہ ہوں، حضور صرف نور نہیں بلکہ "نور الانوار" ہیں، بتائیے آیۂ کریمہ میں لفظ نور ہر قسم کی نورانیت کو شامل ہے یا نہیں؟

عامر صاحب کی افتادِ طبع سے بعید نہیں کہ وہ اس تفسیری کلمہ کا معارضہ اصول فقہ کی مشہور کتاب "نورالانوار" کے نام سے کر بیٹھیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں یہ لفظ ایک کتاب کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو "انوار" اس کتاب کے لئے عقل سلیم کی روشنی میں تسلیم کئے جا سکتے ہیں ان سب کا مجموعہ لفظ "نور الانوار" سے مراد ہوسکتا ہے، اور صاحب روح المعانی کے کلام میں یہ لفظ "نورالانوار" کلام الٰہی کے ایک لفظ "نور" کی تفسیر میں وارد ہے جس کا مصداق ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ ہے، اس لئے یہاں وہ تمام حقائق نوریہ مراد لئے جائیں گے جن کا حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ میں ہونا ممکن اور دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، عامر صاحب کا یہ استدلال بالکل ایسا ہوگا جیسے کوئی احمق کسی صحابی یا غیر صحابی کے متعلق حدیث میں لفظِ رسول (بمعنی قاصد) دیکھ لے اور کہنے لگے کہ معاذ اللہ حضرت محمد ﷺ کی طرح یہ بھی رسول ہے کیونکہ قرآن میں "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" آیا ہے اور اس شخص کے لئے بھی یہی لفظ رسول موجود ہے لہٰذا دونوں کی رسالت یکساں ہے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، اور اگر عامر صاحب کے لئے اتنی بات کافی نہ ہو تو میں ان سے پوچھوں گا کہ اصول فقہ کی کتاب کا نام بھی نورالانوار ہے، اور رسول اللہ ﷺ بھی "نورالانوار" ہیں، کیا آپ کے نزدیک دونوں کے انوار یکساں ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا معارضہ باطل ہے۔

المرام

خلاصۃ الکلام یہ کہ نبی کریم ﷺ ایسے کامل نور ہیں جس کے دامن میں تمام عالم کے تمام حقائق نوریہ مستور ہیں، حضور ﷺ جہاں علم وحکمت، ایمان وعرفان اور ہدایت واسلام کے نور ہیں وہاں حسّی حقیقی نور بھی ہیں، عامر صاحب! آیات قرآنیہ اور عبارات مختلفہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور ہدایت اور نور علم وحکمت ثابت کرنا

ہمارے دعویٰ کے خلاف نہیں، ہاں حقیقی حِسّی نور نہ ہونا یقیناً ہمارے دعویٰ کے منافی ہے لیکن آپ نے اَب تک جتنی آیات وعبارات پیش کی ہیں ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے حضور ﷺ کے نورِ حسّی حقیقی ہونے کی نفی ثابت ہوتی ہو، عامر صاحب نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کردیا کہ آیۂ کریمہ کی تفسیر میں علماء نے علم وہدایت کے الفاظ تو ضرور لکھے ہیں لیکن یہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہاں لفظ نور علم وہدایت کے معنی میں منحصر ہے اور یہ نورِ حسّی حقیقی نورانیت کے منافی ہے، خوب یاد رکھئے "نور ہدایت" اور "صرف نور ہدایت" ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور ہدایت مانتے ہیں مگر صرف نور ہدایت جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حسّی حقیقی نورانیت کی نفی ہوتی ہو نہیں مانتے، بائیس آیتیں کیا آپ سارا قرآن پڑھ جائیے آپ کو ایسا ایک لفظ نہ ملے گا جس میں حصر ہو، نہ آج تک کسی مفسر نے حصر کا قول کیا، علیٰ ہذا احادیث کی طرف آئیں تو ان شاء اللہ قیامت تک ایک ضعیف سے ضعیف حدیث بھی آپ کو نہ مل سکے گی جس میں نبی اکرم ﷺ کے حسّی حقیقی نور نہ ہونے کی اور محض علم وہدایت میں منحصر ہونے کی تصریح ہو، اسی طرح بجز کسی بدعقیدہ مصنف کے کسی عالم دین متقدم یا متاخر کے کلام میں نورِ حسّی کی نفی اور علم وہدایت میں انحصار کا ثبوت نہ مل سکے گا، هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ اس کے بر خلاف ہم نے وہ احادیث واقوال علمائے مفسرین پوری تفصیل وتشریح کے ساتھ پیش کردیئے جن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نورِ حسّی ہونا بھی ثابت ہے۔

عامر صاحب سے یہ امر بھی بعید نہیں کہ وہ اپنی ترنگ میں آکر اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ پڑھ دیں اور کہہ دیں کہ دیکھئے یہاں بشریت میں حصر موجود ہے تو میں پہلے سے ان کی خدمت میں عرض کردوں کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ کے ساتھ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کو بھی پڑھ لیجئے، اگر وہاں بشریت میں حصر ہے تو یہاں رسالت میں ہے، ظاہر ہے کہ رسالت

بشریت کا غیر ہے ورنہ ہر رسول بشر ہوگا جو بداہۃً باطل ہے، کیونکہ فرشتے بشر نہ ہونے کے باوجود رسول ہیں، معلوم ہوا کہ وہاں آپ نے جو حصر سمجھا ہے، وہ درست نہیں، ان شاءاللہ حصر کی یہ پوری بحث اپنے وقت پر آئے گی۔

حرفِ آخر

حضور ﷺ کا نور ہدایت ہونا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نورِ حِسّی ہونے کے ہرگز منافی نہیں جیسا کہ چاند سورج کا نورِ حِسّی ہونا ان کے (حسبِ حال) نور ہدایت ہونے کے منافی نہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ، یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ ستارے بھی موجب ہدایت ہیں، علاوہ ازیں اگر چاند سورج کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ اپنے صانع کی دلیل ہیں تو دینی ہدایت کا بھی وہ سبب قرار پاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا کی تفسیر میں آج تک کسی مفسر نے نُوْرًا و ضِيَآءً کے تحت ہدایت کی روشنی کے معنی نہیں لکھے، لیکن اس سے ان کے نور ہدایت ہونے کی نفی نہیں ہوتی، اسی طرح اگر کسی مفسر نے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ کے تحت نورِ حِسّی کے معنی نہیں لکھے تو اس کی وجہ سے حضور ﷺ کے نورِ حِسّی ہونے کی بھی نفی نہیں ہو سکتی، پھر غور سے سن لیجئے، آپ کا یہ شبہ ہے کہ آیت کریمہ "قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ" کے تحت مفسرین نے حضور ﷺ کے نورِ حِسّی ہونے کی تصریح نہیں فرمائی اور حضور کے نور ہونے کو حضور کے سایہ نہ ہونے کی دلیل نہیں ٹھہرایا، مگر یہ شبہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ مفسرین نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ ہم قرآن کریم کی آیات و کلمات کے تمام معنی بیان کر دیں گے، قرآن کریم کے علوم غیر متناہی ہیں، غیر متناہی کا احصاء کون کر سکتا ہے، مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں لَا تُحْصٰى عَجَائِبُهٗ، قرآن کے معانی عجیبہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

علاوہ ازیں علم تجوید وقراءت، علم تصوف، علم کلام اور علم فقہ کے تمام مسائل آج تک کسی مفسر نے اپنی تفسیر میں جمع نہیں کئے، بلکہ ہر فن کا مسئلہ اسی فن میں آیات واحادیث کی روشنی میں علماء دین بیان کرتے چلے آئے، فقہ وفتاویٰ، علم الاسانید، اسماء الرجال، مسائل کلامیہ مستقل فنون ہیں، اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ نہ ہونا ابوابِ مناقب سے متعلق ہے اور مناقب ایک مستقل فن ہے، جس کا تعلق علماء کے ایک خاص طبقہ سے ہے جو فضائل وشمائل اور سیرت مقدسہ کے ابواب وفصول کی تدوین وتالیف کا کام انجام دیتا ہے، اور بحمدہٖ تعالیٰ ہم نے کتب فضائل وشمائل اور سیَر کے اتنے بے شمار حوالوں اور عبارتوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ نہ ہونا ثابت کر دیا ہے کہ عامر صاحب کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی، اس کے بعد بھی ان کا یہ کہنا کہ "قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ" کی تفسیر میں مفسرین نے سایہ نہ ہونے کا مسئلہ نہیں لکھا ایسا ہے جیسے بے وقوف یہ کہہ دے کہ مبسوط، فتح القدیر، فتاویٰ شامی، عالمگیری، دُرمختار اور قاضی خاں کے جملہ ابواب وفصول چونکہ مفسرین نے نہیں لکھے، اس لئے میں تسلیم نہیں کرتا، یا شرح مواقف، شرح مقاصد اور شرح عقائد وغیرہ کتب علم کلام کے جملہ مسائل مفسرین نے آیات متعلقہ کے تحت ارقام نہیں فرمائے اس لئے وہ غلط ہیں، یا علم تصوف واخلاق کے وہ تمام مسائل جو (کشف المحجوب) فتوحات مکیہ، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، طریقہ محمدیہ، حدیقہ ندیہ وغیرہ کتب اخلاق وتصوف میں مرقوم ہیں آج تک کسی مفسر نے اُن آیات کے تحت ارقام نہیں فرمائے جن سے وہ مستنبط ہیں، لہٰذا وہ سب غلط اور ناقابل قبول ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور ﷺ کے جسم اقدس میں نورِ حسّی کا وجود اپنے مشاہدہ سے بیان کر رہے ہیں اور صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ کے نور سے دیواریں روشن ہو جاتی تھیں تو آپ کو

کیا حق پہنچتا ہے کہ محض اپنی اُبچ، ہٹ دھرمی اور ضد کو پورا کرنے کے لئے چمکتی ہوئی اور روشن احادیث کونظر انداز کر کے اتنی بات پر اَڑ جائیں کہ اس آیت کی تفسیر میں کسی مفسر نے نورِ حِسّی کا لفظ نہیں لکھا اس لئے میں نہیں مانتا، ارے بندۂ خدا کسی مفسر نے نورِ حِسّی کا انکار کیا ہے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت کو ایک قسم کی نورانیت میں منحصر مانا ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو تمہارا ادعائے حصر تمام مفسرین کے خلاف اور تفسیر بالرائے نہیں تو کیا ہے؟

آپ تو دلیلِ حصر کے بغیر حصر مان رہے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نورِ حِسّی کا انکار کر رہے ہیں کہ مفسرین نے آیت قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کی تفسیر میں نور علم وہدایت کے سوا نورِ حِسّی کا ذکر نہیں کیا اور آپ کے مقتداء مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی نے تو آیت کریمہ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تفسیر میں ختم زمانی کے علاوہ ختم ذاتی اور ختم مکانی کے معنی بھی لکھ دیئے اور اسی لفظ خاتم النبیین کے عموم میں ختم ذاتی اور ختم مکانی کے معنی کو شامل کر لیا، حالانکہ عہد رسالت سے لے کر آج تک کسی مفسر نے اس آیت کی تفسیر میں ختم ذاتی اور مکانی کے معنی نہیں لکھے، "هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" بلکہ ساری اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ آیت کریمہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے معنی ختم زمانی میں منحصر ہیں، دیکھئے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجماع کو اپنی مشہور کتاب شفاء میں نقل کیا، اور مرزائیوں کے مقابلہ میں آپ کے مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے اس اجماع علی الحصر کو بڑے زور شور سے پیش فرمایا، ملاحظہ فرمائیے ختم النبوۃ فی الآثار، ص ۱۰۹۔

لیکن اس کے باوجود آپ نے یا آپ کے ہم خیال کسی شخص نے مولوی نانوتوی صاحب کے خلاف قلم نہیں اُٹھایا اور ان سے نہیں پوچھا کہ جناب آیہ کریمہ

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تفسیر میں تو آج تک کسی مفسر نے ختم ذاتی اور مکانی کے معنی نہیں لکھے، نہ آیت کے یہ معنی کسی حدیث میں وارد ہیں بلکہ ان دونوں معنی کی نفی اور صرف ختم زمانی کے معنی پر حصر اجماع سے ثابت ہے، آپ کے ہم خیال تمام علماء نانوتوی صاحب کی اس انوکھی، نرالی اور ان کی اپنی تفسیر کو شیر مادر کی طرح ہضم کر گئے اور قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کی تفسیر میں باوجودیکہ کسی مفسر نے ادعاء حصر نہیں کیا اور حضور ﷺ کی نورانیت حِسّیہ کے ثبوت میں روشن احادیث بھی موجود ہیں لیکن عامر صاحب یہی رَٹ لگائے چلے جا رہے ہیں کہ اس آیت میں لفظ نور کی تفسیر کرتے ہوئے کسی مفسر نے حضور کے حِسّی نور ہونے کا ذکر نہیں کیا لہٰذا یہ لفظ محض استعارہ ہے حِسّی نورانیت کی دلیل نہیں۔

آخری اتمام حجت کے لئے عرض کر دوں کہ علماء نے اسی آیہ کریمہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کی تفسیر میں حضور ﷺ کو نہ صرف نورِ حِسّی بلکہ نورِ حِسّی کی اصل مانا ہے، علامہ صاوی مالکی مصری، تفسیر صاوی، جلد اوّل، ص ۲۳۹ میں فرماتے ہیں:

"لانه صلی الله علیه وسلم اصل کل نور حِسّی ومعنوی"

ترجمہ۔ اس لئے کہ حضور ﷺ ہر نور حِسّی اور معنوی کی اصل ہیں۔

بائیس آیات اور اکیس عبارات

جس طرح مرزائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تَوَفّی کو موت کے معنی میں ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کی وہ سب آیات نقل کر دیں جہاں واقعی لفظ "توفی" بمعنی موت وارد ہے، اور اسی ذیل میں بعض عبارات کو مفید مدعا سمجھ کر نقل کر دیا اور ان تمام دلائل و براہین کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو حیات مسیح علیہ السلام پر قائم ہیں بالکل اسی طرح عامر صاحب نے وہ سب آیتیں نقل کر دیں جن میں نور بمعنی ہدایت یا

علم وارد ہوا ہے اور اسی طرح وہ عبارات لکھ ڈالیں جن میں یہ معنی مرقوم ہیں، اور ان تمام دلائل وشواہد سے آنکھوں کو بند کر لیا جن میں حضور نبی اکرم ﷺ کے نور حِسّی ہونے کا روشن ثبوت موجود ہے۔

ہم نے نہ کبھی یہ کہا کہ لفظ نور علم وہدایت کے لئے نہیں آتا اور نہ یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے (معاذ اللہ) علم وہدایت کا نور ثابت نہیں، پھر ان دونوں باتوں کو ثابت کرنے کے لئے عامر صاحب کا سارا زور لگا دینا لغو اور بے معنی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں اگر ان میں کچھ ہمت تھی تو وہ یہ ثابت کرتے کہ لفظ نور بجز علم وہدایت کے نور حِسّی کے معنی میں نہیں آتا، نیز یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ کے لئے قرآن وحدیث میں جہاں لفظ نور آیا ہے وہاں صرف علم وہدایت ہی کے معنی میں منحصر ہے، حِسّی نورانیت کے معنی وہاں منتفی ہیں، جب وہ ثابت نہ کر سکے اور نہ قیامت تک ثابت کر سکتے ہیں تو اپنے گریبان میں خود منہ ڈال کر دیکھیں کہ وہ حق کے مقابلہ میں کس قدر ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں ایک اور اہم نکتہ عامر صاحب نے نظر انداز کر دیا، اور وہ یہ کہ آیت کریمہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کو حضور ﷺ کے نور خالص ہونے، اور نور ہونے کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ نہ ہونے کا تمام مضمون آپ کے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے امداد السلوک میں لکھا ہے، ان کی اصل عبارات مع تشریح ظل نمبر میں پیش کر چکا ہوں اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے بیان پر بجز تشریح کے کچھ اضافہ نہیں کیا، لیکن آپ اسے بھی شیر مادر کی طرح ہضم فرما گئے، السعید کے ظل نمبر میں بھی میں نے کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ سے حضور ﷺ کا نور خالص ثابت کرنا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور خالص ہونے کو حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونے کی دلیل

قرار دینا آپ کے مقتداء اور دیوبندیت کے ستون مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا کارنامہ ہے، اس لئے آپ کے طعن و تشنیع کا نشانہ سب سے پہلے گنگوہی صاحب ہی بنتے ہیں، گمراہی، بے دینی، عیسائیت و نصرانیت اور کفر و شرک کے جتنے فتوے آپ نے اس مسلک والوں پر جڑے ہیں وہ آپ کے گنگوہی صاحب پر ہیں، لہٰذا آپ کا فرض اوّلیں ہے کہ صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کر دیں کہ ہمارے نزدیک مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اس مسئلہ میں یکساں مجرم ہیں، کیونکہ دونوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور خالص مان کر حضور ﷺ کو بے سایہ مانتے ہیں، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا نہ آپ سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے، پھر آپ ہی بتائیں کہ حق پرستی اور دیانت اسی کا نام ہے؟ دین پسندی اور ایمانداری اسی کو کہتے ہیں؟ کیا مولوی رشید احمد صاحب احکام شرع سے مستثنیٰ ہیں؟ خدا کے خوف کو دل میں جگہ دے کر سوچیں کہ آپ کا یہ اغماض اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا مصداق ہے یا نہیں؟

عامر صاحب فرماتے ہیں:

> حد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات کے لئے بھی لفظ نور استعمال فرماتے ہیں تو تمثیل و تشبیہ ہی کے اسلوب میں، نہ کہ طبعیات کے نقطۂ نظر سے، ملاحظہ ہو سورۂ نور، رکوع ۵، پارہ ۱۸
>
> اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔ (الآیہ)"
>
> (ماہنامہ تجلی، بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۵۲)

اقول: سچ ہے کسی چیز کی محبت ہو یا عداوت، انسان کو اندھا کئے بغیر نہیں چھوڑتی، حضور ﷺ کی نورانیت کی عداوت میں ذاتِ مقدسہ کے لئے معاذ اللہ

تاریک سایہ ثابت کرنے کے لئے حضور ﷺ کے متعلق قرآن و حدیث میں وارد شدہ لفظ "نور" کو حقیقت نورانیت کے معنی سے پھیر کر تشبیہ و تمثیل پر محمول کرنے کا عامر صاحب پر ایسا بھوت سوار ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کی بے مثل و بے تشبیہ ذاتِ مقدسہ کے لئے بھی اپنے زعم باطل میں اسی قرآن عظیم سے تشبیہ و تمثیل ثابت کردی جو بانگ دہل اعلان فرما رہا ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ اللہ تعالیٰ مثل وشبہ سے پاک ہے، اس کی کوئی شی مثل نہیں۔

عامر صاحب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جو لفظ نور کو وہ تمثیل و تشبیہ پر محمول فرما رہے ہیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ نور کو وہ اللہ تعالیٰ کی مثل اور اس کے مشابہ قرار دے رہے ہیں، کیا اس کے علاوہ تمثیل و تشبیہ کے کوئی اور معنی بھی ہو سکتے ہیں؟ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو نور کو اللہ تعالیٰ کی مثل اور اس کے مشابہ کہہ کر انہوں نے قرآن پاک کی صاف و صریح آیت لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کی معاذ اللہ تکذیب کی یا نہیں؟

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ طبعیاتی نور سے پاک ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ لفظِ نور سے جہاں طبعیاتی نور مراد نہ ہو وہاں تمثیل و تشبیہ متعین ہو جائے؟ کیا مصدر بمعنی للفاعل نہیں ہوا کرتا؟ اور کیا اس طرح نور بمعنی منور نہیں ہو سکتا؟ کیا مجاز مرسل کے طور پر لفظِ نور کا استعمال ممکن نہیں؟ افسوس عامر صاحب نے اپنے جنون کے جوش میں خدائے قدوس کی بے مثلی کی شان کو بھی نسیاً منسیا کر دیا اور ان کے ذہن میں نور کے صرف ایک طبعیاتی معنی خلش پیدا کر رہے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ لفظِ نور کتنے معنی میں مستعمل ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا استعمال تمثیل و تشبیہ سے دُور کا تعلق بھی نہیں رکھتا، آئیے ہم آپ کو بتائیں کہ لفظِ نور کے مندرجہ ذیل معانی کتب لغت و تفاسیر میں مرقوم ہیں:

(۱) النور فی اللغة الضیاء۔ "نور لغت میں روشنی کو کہتے ہیں"

(۲) قالت الفلاسفة النور اجسام صغار تنفصل عن المضیء وتتصل بالمستضیء۔

"فلاسفہ نے کہا "نور" ایسے چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جو (کسی) روشن چیز سے جدا ہو کر روشنی حاصل کرنے والے سے متصل ہو جاتے ہیں"۔

(۳) النور عرض من الکیفیات المحسوسة۔

"نور کیفیاتِ محسوسہ میں سے ایک عرض ہے"۔

(۴) النور غنی عن التعریف کسائر المحسوسات۔

"نور باقی محسوسات کی طرح تعریف سے مستغنی ہے"۔

(۵) النور کمال اوّل للشفاف من حیث انه شفاف۔

"نور کمال اوّل ہے کسی شفاف چیز کے لئے اس حیثیت سے کہ وہ شفاف ہے"۔

(۶) النور کیفیة لا یتوقف الابصار بها علی الابصار بشیء اٰخر تعریف بما هو اخفی۔

"نور ایک ایسی کیفیت ہے جس کا دیکھنا کسی دوسری چیز کے دیکھنے پر موقوف نہیں"۔

(۷) النور نفس ظهور اللون۔

"نور، کسی چیز کے نفس ظہورِ رنگ کو کہتے ہیں"۔

(۸) النور مغائر النفس ظهور اللون۔

"نور، نفسِ ظہورِ رنگ کے (ساتھ بعض اوصاف میں مشترک

ہونے کے باوجود اس کے) مغائر کو کہتے ہیں"۔

(۹) النور الظاهر بذاته هو المظهر لغيره۔

"نور ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے ظاہر ہو اور اپنے غیر کو ظاہر کرنے والی ہو"۔

(۱۰) النور نور عقلی۔

"نور، عقلی روشنی کو بھی کہتے ہیں (علم وہدایت، ایمان وعرفان وغیرہ تمام انوارِ عقلیہ اس میں شامل ہیں)

(۱۱) النور نور نفسی۔

"نور کے معنی نور نفسی بھی آتے ہیں"۔

(۱۲) النور نور جسمی۔

"نور، جسمی روشنی کو بھی کہا جاتا ہے"۔

(۱۳) النور موجد۔

"نور، موجد (ایجاد کنندہ) کو بھی کہتے ہیں۔

(۱۴) النور الظهور بنفسه والاظهار لغيره۔

"نور، خود بخود ظاہر ہونے اور اپنے غیر کو ظاہر کرنے کے (لازمی) معنی میں بھی آتا ہے"۔

(۱۵) النور منزه من كل عيب ومن ذلك قولهم امرأة نوار اى بريئة من الريبة بالفحشاء۔

"نور کے معنی "ہر عیب سے منزہ" ہیں اور اسی سے عرب کا مقولہ ہے "اِمرأة نوار" یعنی یہ عورت بے حیائی کے کاموں کے شک وشبہ سے پاک ہے"۔

(۱۶) النور منور۔

"نور کے معنی روشن کرنے والے کے بھی آتے ہیں"۔

(۱۷) نور نوّرَ ماضی بدلیل والارض بالنصب۔

"آیت کریمہ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ" میں نور فعل ماضی ہے جس کے معنی ہیں روشن کردیا، اس کی تائید اسی آیت میں (ایک قرأت کے مطابق) "وَالْاَرْضَ" کے نصب سے ہوتی ہے"۔

ان تمام معنی کا ماخذ روح المعانی کے حسب ذیل اقتباسات ہیں:

روح المعانی پ ۱۸، ص ۱۴۴ (مطبوعہ بیروت، ص ۱۵۹) پر "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے تحت مرقوم ہے۔

(۱) النور فی اللغة علی ما قال ابن سکیت الضیاء۔

"نور" لغت میں ابن سکیت کے قول کے موافق ضیاء (روشنی) ہے"۔

(۲) واعلم ان الفلاسفة اختلفوا فی حقیقة النور فمنهم من زعم انه اجسام صغار تنفصل عن المضیء وتتصل بالمستضیء۔ (تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۵)

"جاننا چاہئے کہ فلاسفہ نے نور کی حقیقت میں اختلاف کیا اور ان میں سے بعض نے گمان کیا کہ نور چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جو کسی روشن چیز سے جدا ہو کر روشنی حاصل کرنے والی چیز سے متصل ہوجاتے ہیں"۔

(تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۵۔ مطبوعہ بیروت، ص ۱۶۰)

(۳) وذهب بعضهم الی انه عرض من الکیفیات المحسوسة وقالوا هو غنی عن التعریف کسائر

المحسوسات وتعریفه بانه کمال اول للشفاف من حیث انه شفاف او بانه کیفیة لا یتوقف الابصار بها علی الابصار بشی اٰخر تعریف بما هو اخفی وکان المراد به التنبیه علی بعض خواصه ومن هٰؤلاء من قال انه نفس ظهور اللون ومنهم من قال بمغائرتهما۔

(تفسیر روح المعانی، ص ۱۴۵۔ مطبوعہ بیروت، ص ۱۶۱)

"بعض فلاسفہ اس طرف گئے کہ نور عرض ہے اور کیفیات محسوسہ میں سے ہے، اور انہوں نے کہا کہ وہ تعریف سے بے نیاز ہے، جیسے باقی محسوسات تعریف سے بے نیاز ہیں، اور اس کی یہ تعریف کہ وہ کمال اوّل ہے کسی شفاف چیز کا اس حیثیت سے کہ وہ شفاف ہے یا وہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کا دیکھنا کسی دوسری شے کے دیکھنے پر موقوف نہیں، نور کی یہ تعریف ایسی چیز کے ساتھ ہے جو اس سے زیادہ خفی اور پوشیدہ ہے (حالانکہ تعریف اجلیٰ اور اظہر کے ساتھ ہونی چاہئے) یہ تعریف دراصل تعریف نہیں بلکہ نور کے خواص میں سے اس کی بعض خاصیتوں پر تنبیہ ہے، اور ان ہی لوگوں میں سے بعض نے کہا کہ وہ نور، رنگ کے نفس ظہور کا نام ہے، اور بعض نے اُن دونوں کی مغایرت کا قول کیا"۔ (تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۵)

(۴) ولهم فی النور اطلاق اٰخر وهم الظاهر بذاته والمظهر لغیره وقالوا هو بهٰذا المعنی مساو للوجود بل نفسه فیکون حقیقة بسیطة کالموجود منقسمًا کانقسامه فمنه نور واجب لذاته قاهر علی ماسواه ومنه

انوار عقلية ونفسية وجسمية والواجب تعالی نور الانوار۔الخ

(تفسیر روح المعانی،ص ۱۴۷۔مطبوعہ بیروت،ص ۱۶۳)

"اور فلاسفہ کے لئے نور میں ایک اور اطلاق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ نور ایسی چیز ہے جو خود اپنی ذات سے ظاہر ہو، اور اپنے غیر کو ظاہر کرنے والی ہو، اور انہوں نے کہا کہ وہ اس معنی میں "وجود" کا مساوی ہے بلکہ نفس وجود ہے تو اس صورت میں نور وجود کی طرح حقیقت بسیط ہوگا اور وجود کی طرح اس کی بھی تقسیم ہوگی تو اس میں سے ایک نور واجب لذات کا ہے جو اپنے ماسوا پر غالب ہے اور اس میں سے انوار عقلیہ ہیں اور بعض اس میں سے انوار نفسیہ اور جسمیہ ہیں اور واجب تعالیٰ نور الانوار ہے"۔الخ

(تفسیر روح المعانی،،ص ۱۴۷)

(۵) اذا علمت هذا فاعلم ان اطلاق النور علی الله سبحانه وتعالی بالمعنی اللغوی والحکمی السابق غیر صحیح لکمال تنزهه جل وعلا عن الجسمية والكيفية ولوازمهما واطلاقه علیه سبحانه بالمعنی المذکور وهو الظاهر بذاته والمظهر لغیره قد جوزه جماعة منهم حجة الاسلام الغزالی

(تفسیر روح المعانی،پ ۱۸،ص ۱۴۷)

"جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب جاننا چاہئے کہ اللہ سبحٰنہٗ وتعالیٰ پر لفظ نور کا اطلاق باعتبار معنی لغوی اور حکمی کے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جسمیت اور ہر قسم کی کیفیت

اور ان کے تمام لوازمات سے کامل طور پر منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ پر باعتبار معنی مذکور "ظاہر بذاتہ مظہر لغیرہ" کے لفظ نور کا اطلاق ایک جماعت نے جائز رکھا ہے ان میں سے حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں"۔ (تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۷)

(۶) وجوز بعض المحققين كون المراد من النور في الاية الموجد كانه قيل: الله موجد السموات والارض ووجه ذلك بانه مجاز مرسل باعتبار لازم معنى النور وهو الظهور في نفسه اظهار الغيره۔

(تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸۔ مطبوعہ بیروت، ص ۱۶۴)

"اور بعض محققین نے آیت کریمہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ میں نور سے موجد کا مراد ہونا جائز قرار دیا ہے گویا اس آیت کریمہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا موجد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ مجاز مرسل ہے باعتبار لازم معنیٰ نور کے جو ظہور فی نفسہ اور اظہار لغیرہ ہے (یعنی خود بخود ظاہر ہونا اور اپنے غیر کو ظاہر کرنا)"۔

(تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸)

(۷) وقيل المراد به المنزه من كل عيب ومن ذلك قولهم امرأة نوار اى بريئة من الريبة بالفحشاء۔

(تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸۔ مطبوعہ بیروت، ص ۱۶۴)

"ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظِ نور سے مراد (کبھی) ہر عیب سے منزہ ہوتا ہے، اور اسی سے اہل عرب کا یہ مقولہ ہے "امرأۃ نوار" یعنی یہ عورت بے حیائی کے کاموں کے شک وشبہ سے پاک ہے"۔

(تفسیر روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸)

(۸) وقیل نور بمعنی منور وروی ذٰلك عن الحسن وابی العالیة والضحاك وعلیه جماعة من المفسرین ویؤیده قرأة بعضهم منور و کذا قراة علی کرم الله وجههٗ وابی جعفر وعبد العزیز المکی وزید بن علی وثابت ابن ابی حفصة والقورصی ومسلمة بن عبد الملك وابی عبد الرحمن السلمی وعبد الله بن عباس بن ابی ربیعة نور فعلا ماضیًا والارض بالنصب۔ (روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸)

"آیت کریمہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں نور بمعنی منور ہے یعنی روشن کرنے والا، یہ مروی ہے حسن بصری سے، ابو العالیہ سے اور ضحاک سے اور اسی قول پر مفسرین کی ایک جماعت ہے اور تائید کرتی ہے اس قول کی اس آیت میں بعض علماء کی قرأت "اللہ منور السمٰوات" اسی طرح اس کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ابوجعفر، عبد العزیز مکی، زید بن علی، ثابت بن ابی حفصہ، قورصی، مسلمہ بن عبد الملک، ابو عبد الرحمن السلمی اور عبد اللہ بن عباس ابن ابی ربیعہ نے نَوَّرَ فعل ماضی اور الارض کو نصب (زبر) کے ساتھ پڑھا"۔ (روح المعانی، پ ۱۸، ص ۱۴۸)

عامر صاحب ذرا سوچیں کہ قرآن کریم کی جس آیت (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ، الآیة) کے لفظ "نور" کو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے معاذ اللہ تمثیل وتشبیہ قرار دے رہے ہیں اس کے سترہ معنی منقولہ میں سے ایک معنی بھی انہیں ایسے نظر نہ آئے جنہیں تمثیل وتشبیہ کے بغیر مراد لیا جا سکے؟ کیا خدائے قدوس کے حق میں تمثیل وتشبیہ کا لفظ استعمال کرتے

ہوئے انہیں ذرا بھی خوف خدا محسوس نہیں ہوا، مفسرین کرام کی تصریحات جلیلہ منقولہ بالا میں انہیں یہ نظر نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ صفاتِ حدوث اور صفاتِ مخلوقہ سے منزہ ہے اور مثل وشبہ سے پاک اور تمثیل وتشبیہ سے مقدس ہے۔

شاید عامر صاحب کو بعض تفاسیر میں یہ دیکھ کر مغالطہ ہو گیا کہ (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ) اللہ تعالیٰ کے نور کی مَثَل ہے اس لئے انہوں نے تمثیل وتشبیہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے درست سمجھ لیا، اس مغالطہ کو دُور کرنے کے لئے انہیں "مفردات امام راغب" کی حسب ذیل عبارت کو غور سے پڑھنا چاہئے جس میں ان کے مغالطہ کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے تمثیل وتشبیہ سے مبرہ ومنزہ ہونے کو آفتاب سے زیادہ روشن کر کے دکھایا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"والتمثال" الشیء المصور ... والمثل عبارةٌ عن قول فی شیءِ یشبہ قولاً فی شیءِ آخر بینہما مشابہةٌ لیبین احدھما الاخر ویصورہ ... والمثل یقال علی وجھین احدھما بمعنی المثل نحو شبہ وشَبہ ونِقضٍ ونَقضٍ، قال بعضھم وقد یعبر بھما عن وصف الشیء نحو قولہ (مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ) والثانی: عبارة عن المشابھة لغیرہ فی معنی من المعانی ای معنی کان وھواعم الالفاظ الموضوعة للمشابھة وذٰلك ان النِدّ یقال فیما یشارك فی الجوھر فقط، والشبه یقال فیما یشارك فی الکیفیة فقط، والمساوی یقال فیما یشارك فی الکمیة فقط، والشکل فیما یشارکہ فی القدر والمساحة فقط، والمثل عام فی جمیع ذٰلك ولھٰذا لما اراد اللہ تعالیٰ نفی التشبیه من کل وجه خصه بالذکر

فقال (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)، واما الجمع بين الكاف والمثل فقد قيل ذلك لتاكيد النفي تنبيهاً على انه لا يصح استعمال المثل ولا الكاف فنفى بليس الامرين جميعًا وقيل المثل ههنا هو بمعنى الصفة ومعناه ليس كصفته صفة تنبيهًا على انه وان وصف بكثير مما يوصف به البشر فليس تلك الصفات له على حسب ما يستعمل في البشر۔
"تمثال" شی مصور کو کہتے ہیں "مَثَل" عبارت ہے قول سے کسی شے میں جو مشابہ ہو قول کے شی آخر میں کہ ان دونوں کے درمیان مشابہت ہوتا کہ ایک دوسرے کو بیان کردے اور اسے مصور کردے اور "مَثَل" کا استعمال (مزید) دو طریقوں پر بھی ہوتا ہے، ایک مثل کے معنی میں جیسے شِبْہٌ و شَبَہٌ اور نِقْضٌ و نَقَضٌ، بعض نے کہا ان دونوں کے ساتھ کبھی وصف شے کو بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ، اور دوسرے طریقہ پر اس طرح کہ لفظ مَثَل عبارت ہوتا ہے اپنے غیر کے ساتھ مشابہت سے معانی میں سے کسی معنی میں بھی کیوں نہ ہو، اور وہ مشابہت کے معنی میں ان تمام الفاظ سے اعم ہے جو مشابہت کے معنی کے لئے وضع کئے گئے ہیں مثلاً لفظ نِدّ کا استعمال صرف ان چیزوں میں ہوتا ہے جو فقط جوہر میں باہم شریک ہوں اور "شبہ" کا اطلاق اِن اشیاء پر ہوتا ہے جو صرف کیفیت میں باہم مشارک ہوں اور لفظ "مساوی" کا استعمال صرف ان چیزوں میں ہوتا ہے جو فقط مقدار میں شریک ہوں، اور "شکل" کا لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں دو

چیزیں صرف اندازے اور پیمائش میں مشارک ہوں، اور لفظ "مِثل" ان سب میں عام ہے، یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے (اپنی ذات مقدسہ سے) من کل وجہ (ہر طرح سے تشبیہ) کی نفی کا ارادہ فرمایا تو اسی لفظ "مِثل" کو ذکر کے ساتھ خاص کیا اور فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ، رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مثل کے ساتھ کاف تشبیہ کو کیوں جمع فرمایا تو بعض نے اس کا جواب دیا کہ تاکیدِ نفی کے لئے ایسا کیا، گویا اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمثیل وتشبیہ سے ایسا پاک ہے کہ اس کے حق میں لفظِ مثل کا استعمال جائز ہے نہ کاف تشبیہ کا، لہٰذا لَيْسَ کے ساتھ کاف تشبیہ اور مثل دونوں کی نفی فرمادی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظ مثل یہاں صفت کے معنی میں ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی طرح کوئی صفت نہیں اور اس کا مقصد اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ اگرچہ (قرآن مجید میں) اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بکثرت موصوف کیا گیا ہے جن سے بشر موصوف کئے جاتے ہیں (جیسے سمع، بصر، علم، رحم، ید، وجہ وغیرہا) لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لئے ان صفات کا استعمال ایسا نہیں جیسے بشر کے حق میں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تمثیل وتشبیہ سے مطلقاً پاک ہے اور اس ذات وصفات کی مثل کوئی شئ اور کسی کی صفت نہیں ہوسکتی۔

(مفردات امام راغب اصفہانی، ص ۴۷۸)

اقتباسات وعبارات مرقومہ بالا سے عامر صاحب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ان پر یہ امر واضح ہو جانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمثیل وتشبیہ سے پاک ہے اور

مَثَلُ نُوْرِہٖ میں لفظ مَثَل سے صفت مراد ہے اور بس۔

عامر صاحب تو اپنے آپ کو عالم دین تصور کرتے ہیں، میرے نزدیک تو کوئی ادنیٰ درجہ کا معمولی پڑھا لکھا مسلمان بھی آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے تمثیل وتشبیہ کے معنی نہیں سمجھ سکتا۔

اس کے بعد عامر صاحب کی علمی قابلیت کا ایک ایسا بے مثل و بے نظیر نمونہ ناظرین کرام کو ہم دکھاتے ہیں جو ان کے خصوصیات سے ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف تو لفظ نور کو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے تمثیل وتشبیہ کے اسلوب پر قرار دیتے ہیں جیسا کہ ابھی تفصیل سے گزر چکا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کو خود حقیقی اور واقعی نور تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ وہ اسی بیان میں آیت کریمہ "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا" الآیۃ لکھ کر ارقام فرماتے ہیں :

"یہاں اللہ جل شانہ نے خود اپنے نورِ مقدس کا ذکر فرمایا ہے وہ چونکہ واقعی بہمہ وضوح وہ نور ہی نور ہیں اس لئے لفظ کو اس کے حقیقی و وضعی معنی پر محمول کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی"۔

(ماہنامہ تجلی، بابت مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۵۳)

اقول : دروغ گو را حافظہ نہ باشد،

ابھی تو لفظِ نور کو اللہ تعالیٰ کے لئے بطور تمثیل وتشبیہ مانا تھا اور ابھی اتنی جلدی اللہ تعالیٰ کو واقعی اور حقیقی نور کہہ کر ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے اسی لفظِ نور کو حقیقی اور وضعی معنی میں تسلیم کرلیا، عامر صاحب کی اس تضاد بیانی پر سخت حیرت اور تعجب ہے، انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ کوئی لفظ اپنے حقیقی اور وضعی معنی میں تمثیل وتشبیہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا، مثلاً لفظ اسد کے حقیقی وضعی معنی شیر اور حیوان مفترس کے ہیں تو اس لفظ کو شیر کے معنی میں تمثیل وتشبیہ کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ تمثیل وتشبیہ غیر ما

وضع لہٗ میں ہرگز تمثیل وتشبیہ کے لئے استعمال نہیں ہوا کرتا، لیکن عامر صاحب نے کمال کر دکھایا کہ وہ ایک ہی لفظ نور کو اللہ تعالیٰ کے لئے تمثیل وتشبیہ کے طور پر بھی قرار دیتے ہیں اور اسی کو ما وضع لہ میں بھی مستعمل مانتے ہیں۔ ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

عامر صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ سے حِسّی نورانیت کی نفی کے جوش میں قرآن کریم کی بکثرت آیات نقل فرمادیں، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچا، بجز اس کے کہ انہوں نے اپنے خیال میں یہ سمجھ لیا کہ اور کچھ نہ سہی مگر پڑھنے والا اتنا تو ضرور اثر لے گا کہ کاظمی کے پیش کردہ دلائل کثیرہ کے جواب میں عامر صاحب نے اتنی آیات قرآنیہ سے حضور ﷺ کا تاریک سایہ ثابت کر دیا۔

رہا یہ امر کہ شرع (نہیں بلکہ فقہ) ان کے اس کارنامہ کو عذاب وثواب کے کس خانہ میں رکھے گی؟ تو ہمیں اس سے سروکار نہیں، ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عامر صاحب نے اس مقام میں دین ودیانت اور علم وعقل سے یکسو ہو کر محض اپنی ملاہٹ کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

اس کا کون منکر ہے کہ عربی محاورات اور قرآن وحدیث میں استعارات مستعمل نہیں ہوتے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک لفظ اگر کسی جگہ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے تو وہ ہر جگہ استعارہ ہی قرار پائے، عامر صاحب نے لفظِ نور کو استعارہ ثابت کرنے کے لئے جتنی آیات پیش کی ہیں ان میں بعض وہ آیات بھی نقل کر دیں جن میں لفظِ نور استعارہ نہیں بلکہ حِسّی اور حقیقی روشنی کے معنی میں مستعمل ہے۔

دیکھئے عامر صاحب نے اپنی منقولہ آیات کے ذیل میں مندرجہ ذیل دو آیتیں تحریر فرمائی ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ اس میں لفظِ نور استعارہ ہے، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے، جیسا کہ ہم اس کا ثبوت پیش کریں گے، پہلی آیت اور

اس کے متعلق عامر صاحب کا دعویٰ ملاحظہ فرمائیے:

"یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرٰكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" پ ۲۷

"جس دن تو دیکھے گا مومن مرد و زن کو اس حال میں کہ دوڑتی ہوئی چل رہی ہوگی ان کے آگے اور دائیں بائیں روشنی خوشخبری تم کو آج کے دن باغوں کی کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں سدا رہو اُن میں، یہی تو ہے عظیم کامیابی"۔

یہاں بھی "نور" کو استعارہ ہی ماننا پڑے گا۔

(تجلی، ماہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۵۲)

اقول: اگر آپ زبردستی منوانا چاہتے ہیں تو آپ کی بات وہی مانے گا جس پر آپ کی زبردستی چل سکے، اور اگر دلیل سے ماننے کی بات ہو تو پھر ہماری بات آپ کو ماننا پڑے گی کہ لفظ "نور" یہاں استعارہ نہیں بلکہ اپنی حقیقت پر ہے، دیکھئے تفسیر روح المعانی میں اسی آیت کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

"(يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ) والرؤية بصرية"

"(جس دن تو دیکھے گا ایمان والے مرد و زن کو) اور یہ رویت بصریہ ہے یعنی آنکھ سے دیکھنا مراد ہے"۔

اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

"(يَسْعٰى نُوْرُهُمْ) حال من مفعول (ترى) والمراد بالنور حقيقة على ماظهر من شموس الاخبار واليه ذهب الجمهور والمعنى يسعى نورهم اذا سعوا" انتہیٰ

(روح المعانی، پ ۲۷، ص ۲۵۱)

"(دوڑتی ہوئی جارہی ہے ان کے آگے دائیں بائیں روشنی) یہ جملہ حال ہے مفعول سے اور "نور" (استعارہ نہیں بلکہ) اس کی حقیقت مراد ہے، جیسا کہ روایات واخبار کے چمکتے ہوئے سورجوں سے یہ بات ظاہر ہے اور اسی کی طرف جمہور گئے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ مومنین ومومنات جب دوڑیں گے تو ان کی روشنی ان کے آگے اور دائیں بائیں دوڑتی ہوگی"۔ انتہیٰ (روح المعانی، پ ۲۷، ص ۲۵۱)

کس قدر واضح الفاظ میں صاحب روح المعانی نے روایات واخبار کے چمکتے ہوئے سورجوں کی روشنی میں فرمایا ہے کہ یہاں لفظِ نور استعارہ نہیں بلکہ اپنی حقیقت پر ہے اور اس نور سے حسّی روشنی مراد ہے۔

عامر صاحب! خدا لگتی کہیے، اس آیت میں اَب بھی استعارہ منوائیں گے؟

دوسری آیت عامر صاحب نے اس طرح لکھی:

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا

(پ ۲۷، آیت ۱۳)

"جس دن کہیں گے منافق مرد وزن مومنوں سے کہ ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں گے، کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ پیچھے پھر ڈھونڈلو روشنی"۔

اس کے بعد چند آیات لکھ کر تمام منقولہ آیات میں استعارہ کی رَٹ لگاتے ہوئے عامر صاحب لکھتے ہیں:

"جب قرآن کی اتنی بہت سی نظیریں آپ کے سامنے آگئیں تو

انصاف کیجئے کہ ایک آیت سے نور کے معنی محمد رسول اللہ لینا اور پھر تعبیر و استعارہ کے حدود پھلانگ کر پورے قرآن سے آنکھیں پھیر کر زبان و ادب کے معلوم و معروف تقاضے نظر انداز کر کے جسدِ رسول کا سایہ غائب کر دینا تلعب بالقرآن اور دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے؟" (تجلی، جون ١٩٦٠ء، ص ۵۳)

اقول: عامر صاحب! مسائل کے لئے پہلے دلائل درکار ہیں، اس کے بعد نظائر پیش کئے جا سکتے ہیں، مگر آپ نے دلائل سے اعراض فرما کر محض نظائر سے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی سعی ناتمام کی ہے، پھر اس میں بھی آپ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، جن آیات میں لفظ "نور" استعارہ نہ تھا انہیں بھی آپ نے استعارہ قرار دے دیا، پہلی آیت پر کلام کر چکا ہوں، اس دوسری آیت کی تفسیر بھی روح المعانی میں ملاحظہ فرما لیجئے اور دیکھئے کہ یہاں لفظِ نور استعارہ ہے یا حِسّی حقیقی نور کے معنی میں مستعمل ہے، دیکھئے صاحب روح المعانی اس دوسری آیت کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

"لانھم اذا نظروا الیھم استقبلوھم بوجوھھم والنور بین ایدیھم فیستضیئون بہ"۔

(تفسیر روح المعانی، پ ٢٧، ص ٢۵٢)

"مومن جب منافقین کی طرف دیکھیں گے تو مومنین کے آگے نور ہوگا جس کی روشنی سے منافق روشن ہو جائیں"۔

کیوں عامر صاحب! مومنین کی جس روشنی سے منافقین ضیاء حاصل کریں گے وہ حِسّی حقیقی نور نہ ہوگا تو منافقین کا اس سے ضیاء حاصل کرنا اور روشن ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ ثابت ہوا کہ اس آیت میں نور سے حقیقی حِسّی نور مراد ہے استعارہ نہیں۔

رہا یہ امر کہ آپ نے آیت کریمہ قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ میں لفظ "نور" سے حضور ﷺ کو مراد لینا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بے سایہ ہونے کی دلیل سمجھنا تلعب بالقرآن قرار دیا ہے اور اسے دھاندلی کہا ہے تو آپ کا یہ فتویٰ عبداللہ بن عباس سے لے کر جلال الدین سیوطی تک تمام اعلام اُمت پر چسپاں ہوتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ آپ کے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی متعلب بالقرآن اور دھاندلی کرنے والے قرار پاتے ہیں جیسا کہ ہم ان کی مفصل عبارات پہلے نقل کر چکے ہیں۔

اَب استعارہ کی اس بحث میں حرف آخر کے طور پر آپ کے مسلم علماء مفسرین میں سے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی ایک عبارت تفسیر مظہری سے پیش کرتا ہوں۔

قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی منقولہ آیت کریمہ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ" میں مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قال کعب هذا مثل ضربه الله لنبیه ﷺ"

"حضرت کعب نے فرمایا۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ" میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی مثل بیان فرمائی ہے"۔

(تفسیر مظہری، جلد ۶، ص ۵۲۴)

آگے چل کر اسی آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضور سیّد عالم ﷺ کے چہرۂ انور کی حسّی حقیقی روشنی کا بیان فرماتے ہیں، سنئے:

"وفی شمائل محمدیه قالت حلیمة ما کنا نحتاج الی سراج من یوم اخذناه لان نور وجهه کان انور من السراج فاذا احتجنا الی السراج فی مکان جئنا به فتنورت الامکنة

ببرکتہ ﷺ۔ انتہیٰ

(تفسیر مظہری، جلد ۶، ص ۵۲۸)

"اور شمائل محمدیہ میں ہے حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا، جس دن سے ہم نے حضور ﷺ کو لیا اس دن سے ہمیں چراغ کی حاجت نہ رہی اس لئے کہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کا نور چراغ سے زیادہ روشن تھا، چنانچہ جب کسی جگہ ہمیں چراغ کی ضرورت ہوتی تو وہاں ہم حضور ﷺ کو لے آتے اور اس مکان کی ہر جگہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت سے روشن و منور ہو جاتی"۔

آپ تفسیر مظہری کے حوالے بہت دیا کرتے ہیں، ذرا یہ عبارت بھی اسی تفسیر مظہری میں ملاحظہ فرما لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مثل نور فرما کر جو لفظ نور اپنے حبیب ﷺ کے لئے ارشاد فرمایا ہے وہ استعارہ نہیں، بلکہ اس سے مراد حِسّی اور حقیقی نور ہے جس کے ہوتے ہوئے چراغ کی حاجت نہ رہے۔

آپ نے حضور ﷺ کے حق میں لفظ نور کو محض استعارہ قرار دینے کے لئے جتنے پاپڑ بیلے تھے تفسیر مظہری کی اس عبارت نے ان سب پر پانی پھیر دیا، اور اس حقیقت کو آفتاب سے زیادہ روشن کر دیا کہ حضور ﷺ کی نورانیت صرف علم و ہدایت میں منحصر نہیں بلکہ حِسّی حقیقی روشنی کو بھی شامل ہے۔

اے کاش عامر صاحب ٹھنڈے دل سے غور فرماتے کہ ان جلیل القدر مفسرین کی روشن تصریحات کے ہوتے ہوئے حضور ﷺ کی نورانیت کا انکار قرآن و اسلام اور فضائل و مناقب مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ استہزا اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔

السعید کے ظل نمبر میں دلائل کے انبار نے منکرین کی ایسی کمر توڑی کہ انہیں سیدھا ہونے کی ہمت نہ ہو سکی۔

عامر صاحب ازراہِ عناد کچھ بھی کہیں لیکن بالآخر انہیں ہمارے دلائل کے وزن کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔

انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ نفی الظل کے دلائل نے ان کی ساری محنت برباد کر دی اور بزعم خویش نفی الظل کے عقیدہ کی جو بیخ کنی انہوں نے کی تھی وہ سب اکارت ہو گئی، چنانچہ وہ خود تجلی میں ارقام فرماتے ہیں:

"ہمارا دل نہیں مانتا کہ دلائل کا جو انبار منکرین ظل نے جمع کر دیا ہے اسے یوں ہی چھوڑ دیں، اگر یوں ہی چھوڑ دیا تو بیخ کنی کا وہ عمل جو ہمارے گزشتہ اجمالی نقد نے انجام دیا تھا بیکار چلا جائے گا"۔

(تجلی، دیوبند، بابت جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۶)

اَب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے دلائل کے انبار کو عامر صاحب نے ہاتھ لگایا ہے یا محض جھنجلا کر چند طنزیہ فقرے کس دیئے اور جواب کے میدان سے دامن بچا کر چلتے نظر آئے۔

ناظرین کرام پر ظاہر ہے کہ نفی الظل کے دلائل کے انبار کو ہاتھ لگانا تو درکنار، عامر صاحب اس کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزرے، بلکہ اسی گزشتہ اجمالی نقد کو نقل کر کے وہی پرانا راگ دوبارہ الاپتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ:

"بیخ کنی کا وہ عمل جو ہمارے گزشتہ اجمالی نقد نے انجام دیا تھا بیکار چلا گیا"

قسط اوّل میں تفسیروں کے اکیس، بائیس حوالوں پر عامر صاحب کو بہت ناز ہے، ناظرین کرام نے ان کی حقیقت ہمارے جواب کی گزشتہ قسطوں میں بخوبی معلوم کر لی ہو گی جن میں عامر صاحب کی خوش فہمیوں اور تعلیوں کو پوری طرح بے نقاب

کر دیا گیا ہے۔

حضور سیّد عالم ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی بحث میں عامر صاحب شرک وتوحید اور افراط وغلو کے الفاظ بار بار لاتے ہیں، جس سے قارئین کے اذہان میں وہ یہ تاثر پیدا کرنے کے درپے ہیں کہ حضور سیّد عالم ﷺ کے جسمانی سایہ کو تسلیم نہ کرنا شرک وغلو اور افراط ہے اور اسے مان لینا خالص توحید، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس مسلک کو شرک اور افراط وغلو قرار دینے سے خود ان کے اکابر واسلاف حتیٰ کہ حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں جن کی مفصل عبارات مکتوبات امام ربانی، جلد سوم، ص ۱۸۷ اور امداد السلوک، ص ۸۵، ۸۶ سے ہم السعید کے صفحات میں نقل کر چکے ہیں، اور عامر صاحب آج تک اس کے جواب سے ساکت وصامت ہیں۔

پھر تعجب ہے کہ حضور ﷺ کو جسمانی سایہ سے معریٰ تسلیم کرنا عامر صاحب کے نزدیک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بڑھانے چڑھانے کے مساوی کیونکر قرار پا گیا، عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معاذ اللہ ابن اللہ اور اِلٰہ مانتے تھے، کیا جسمانی سایہ نہ ہونا بھی عامر صاحب کے نزدیک الوہیت ہے، اگر اس کو الوہیت مان لیا جائے تو وہ تمام خلائق لطیفہ معاذ اللہ وصف الوہیت سے متصف قرار پائیں گی جو سایہ نہیں رکھتیں، کیا کسی مومن وموحد کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے؟

رہا یہ امر کہ "جھوٹی حدیثیں جو عقل کے نزدیک بھی قابل قبول نہ ہوں کسی طرح لائق احتجاج نہیں ہوسکتیں اور ایسی خلاف عقل وضعی روایات کو مان لینا محبت رسول نہیں بلکہ جہالت وغلو ہے"۔ یقیناً درست اور صحیح ہے اور ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں، لیکن غیر موضوع کو موضوع کہنا، سچ کو جھوٹ بتانا اور معقول کو غیر معقول کہہ دینا بھی انتہائی جہالت اور پرلے درجے کی نامعقولیت ہے، کج فہمی کو عقل سمجھ لینا نادانی

اور کم عقلی نہیں تو اور کیا ہے؟

حضور ﷺ کے فضائل و محامد کے دلائل کو کذب محض اور خلاف عقل کہہ دینا کس قدر جرأت اور بے باکی ہے۔ (العیاذ باللہ)

کتب صحاح سے ہماری پیش کردہ احادیث (جن سے رسول اللہ ﷺ کی حِسّی اور حقیقی نورانیت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے) کے جواب سے عاجز ہو کر عامر صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے اور تسلیم کر لیا کہ حضور ﷺ حِسّی اور ظاہری نور سے خالی نہ تھے، دیکھئے وہ تجلی میں لکھتے ہیں:

"اس تمہید کے بعد یہ خوب ذہن نشین رکھئے کہ اختلاف کیا ہے، ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حضور ﷺ ہر قسم کے نورِ حِسّی و ظاہری سے بالکل خالی تھے، آپ کے چہرے پر جس حسن و جمال اور طلعت و تابانی کا تذکرہ محدثین کرتے ہیں اس سے انکار کی کسے اور کیوں مجال ہے؟ یہ بھی ہم مانتے ہیں کہ بعض رہبہ بعض حضرات نے آپ کے کسی عضو یا چند اعضاء سے ایک ایسی روشنی خارج ہوتے دیکھی جو ان کے خیال میں حِسّی اور مرئی تھی، یہ بھی ناممکن نہیں کہ باطنی علوم و معارف اور اعلیٰ درجہ کی نبوت منورہ کے نتیجے میں آپ کے جسدِ مطہر سے غیر معمولی نور و طلعت کا مشاہدہ کیا گیا ہو"۔

(تجلی، دیوبند، بابت جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۷)

عامر صاحب نے اس عبارت میں ہمارے مسلک کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا، یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر وہ اس پر قائم رہیں یا نہ رہیں، لیکن ان کے رسالے کے پیش نظر اقتباس میں صاف مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے وجودِ اقدس میں نور حِسّی و ظاہری موجود تھا، لیجئے کہ باطنی علوم و معارف و انوار ثبوت حِسّی و ظاہری نور کی

صورت میں جسم اقدس سے محسوس و مشاہد ہوئے اور اعضاء مقدسہ سے اس کی روشنی کا نکلنا دیکھا گیا۔

اَب اس کے بعد ایک یا چند اعضاء کی تخصیص اور بقیہ کی نفی اپنی بات کی اپچ نہیں تو کیا ہے؟ باوجودیکہ وہ اس نورِ حسّی کو باطنی علوم و معارف اور نبوت منورہ کی روشنی مان رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی پوری ذات مقدسہ وصف نبوت کے ساتھ متصف ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ کا ایک عضو یا چند اعضاء میں نبوت کی صفت پائی جاتی تھی، باقی اعضاء مقدسہ اور وجود مبارکہ میں نبوت نہ تھی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض اعضاء میں وہ نور چمکے اور بعض بالکل بے نور رہیں؟ کیا عامر صاحب کے نزدیک یہ بھی نوامیس فطرت کا مقتضا ہے؟

نیز اسی عبارت میں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرلیا کہ جسم اقدس اتنا مصفّٰی اور شفاف تھا کہ اندرونی انوار اس سے باہر آتے اور دیکھنے والوں کو محسوس ہوتے تھے، کیونکہ غیر شفاف اور کثیف جسم سے اندرونی روشنی باہر نہیں آسکتی، لالٹین کی روشنی سے مکان اسی وقت منور ہوسکتا ہے کہ اس میں صاف شیشے کی چمنی رکھی جائے اور اگر چمکتے ہوئے چراغ پر مٹی کا گھڑا اوندھا دیا جائے تو اس کی روشنی اس حال میں اسی طرح محسوس و مشاہد نہیں ہوسکتی۔

عامر صاحب نے یہ سب کچھ ہمارے دلائل سے مجبور ہو کر تسلیم کیا ہے ورنہ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ۱۹۶۰ء سے پہلے کسی اپنی تحریر کے حوالے سے بھی یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ انہوں نے حضور ﷺ کے لئے اس قسم کی حسّی اور ظاہری نورانیت کو مانا ہے جس کی روشنی جسم اقدس سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہو۔

ہمارا مسلک

ہم نے آج سے پہلے بارہا کہا کہ ہم حضور سیّد عالم ﷺ کی ذات مقدسہ کو

نور ماننے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت مطہرہ پر ایمان رکھتے ہیں، السعید کے صفحات اور ہماری دیگر تصنیفات اس دعویٰ پر شاہد و عادل ہیں کہ ہم لوگ سیّد عالم ﷺ کو نورانیت اور بشریت دونوں سے متصف مانتے ہیں، ہمارے نزدیک حضور ﷺ کی بشریت و نورانیت مطہرہ عناصر اربعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی سے مرکب ہے لیکن خمیر جسد مبارک جو میاہِ جنت، کوثر و تسنیم اور سلسبیل کے پانی سے گوندھ کر تیار کیا گیا تھا، اتنا لطیف اور پاکیزہ تھا کہ تمام عنصری کثافتوں سے پاک اور صاف ہو کر اتنا شفاف ہو گیا تھا کہ نور محمدی کی شعاعیں اس جسم اقدس سے چمکتی تھیں، جسے عامر صاحب نے بھی واضح طور پر پیش کردہ اقتباس میں تسلیم کر لیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جسم شفاف میں جب نور چمک رہا ہو تو اس جسم کا سایہ نہیں پڑتا خواہ وہ جسم عنصری ہی کیوں نہ ہو، دیکھئے لالٹین کی چمنی، بجلی، گیس کا شیشہ بالکل مادی اور عنصری جسم ہے لیکن جب ان میں روشنی چمکتی ہے تو ان اجسام عنصری کے شفاف شیشوں کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا، عامر صاحب نے جب حضور ﷺ کے اندرونی انوار کی روشنی کو جسم اقدس سے چمکتا ہوا محسوس و مشاہد تسلیم کر لیا تو اَب سایہ نہ ہونے کو تسلیم نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ سب کچھ مان کر یہ کہنا کہ:

> "گفتگو اس نکتہ میں ہے کہ منکرین ظل کہتے ہیں کہ رسول اللہ کا پورا جسم مبارک طبعی و حقیقی معنوں میں نور مستقل تھا"۔
>
> (تجلی، دیوبند، بابت جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۷)

خلط مبحث اور حق پوشی کی اس سے واضح مثال شاید کہیں نہ مل سکے، ہم نے کب کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک طبعی اور حقیقی معنوں میں نور مستقل تھا، (اور اس میں عنصریت اور مادیت کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا تھا) هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

اقتباس بالا کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ عامر صاحب سب کچھ مان کر بھی اپنے دلی عناد کے اظہار سے باز نہ رہ سکے، لکھتے ہیں:

"آپ کے چہرے پر جس حسن وجمال اور طلعت وتابش کا تذکرہ محدثین کرتے ہیں اس سے انکار کی کسے اور کیوں مجال ہے"۔

صحیح بخاری اور ترمذی کی احادیث صحیحہ کو محض تذکرہ محدثین کے لفظ سے تعبیر کر دینا کتنی جرأت اور دیدہ دلیری ہے، گویا پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کرنا مقصود ہے کہ جسم اقدس سے تابش نور کا مضمون صرف محدثین کی ذکر کی ہوئی بات ہے اور بس، حق کو چھپانے اور اس پر پردہ ڈالنے کی اس سے زیادہ اور کیا کوشش کی جاسکتی ہے، اور سنئے! فرماتے ہیں:

"یہ بھی ہم مانتے ہیں کہ بعض مرتبہ بعض حضرات نے آپ کے کسی عضو یا چند اعضاء سے ایک ایسی روشنی خارج ہوتے ہوئے دیکھی جو ان کے خیال میں حسّی اور مرئی تھی"۔

جب آپ یہ مان چکے کہ بعض حضرات نے حضور کے اعضاء سے روشنی خارج ہوتے ہوئے دیکھی تو اس کے بعد یہ کہنا کہ جو ان کے خیال میں حسّی اور مرئی تھی، کیا معنی رکھتا ہے؟ دیکھی ہوئی چیز کا دیکھنے والے کے خیال میں مرئی ہونا عجیب بات ہے، مرئی کہہ کر پھر اسے خیال میں مرئی قرار دینا علاوہ مہمل اور لغو ہونے کے پڑھنے والوں کے لئے ایک زبردست مغالطہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس عبارت کو پڑھنے والا اس دھوکے میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ شاید وہ روشنی دیکھنے والے کے صرف خیال میں مرئی ہو اور حقیقت میں مرئی نہ ہو، عامر صاحب کا مطلب بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

حیرت ہے کہ دیکھنے والوں کے نزدیک وہ روشنی حقیقی مرئی ہو اور نہ دیکھنے والوں کے نزدیک محض خیالی مرئی، کیا اس سے بڑھ کر بھی قلبی عناد کا مظاہرہ ہو سکتا ہے؟

حضور ﷺ کے حسن و جمال کے بارے میں صحابہ کرام کے تاثرات کی بحث میں عامر صاحب لکھتے ہیں:

"ذرا اندازہ کیجئے، اہل کفر کو بھی اس تاثر میں شامل کر لیا گیا جو خالص ایمان کا ثمرہ تھا، ظالمو اگر یہی حقیقت ہوتی تو تمام ہی لوگ اہل ایمان کی طرح مومن نہ ہو گئے ہوتے"۔

طرزِ کلام ملاحظہ فرمائیے! معلوم ہوتا ہے کہ کمالات رسالت کے خلاف عناد کا ایک طوفان ہے جو اُمڈا چلا آ رہا ہے، جس نے عقل و خرد، ہوش و حواس سب پر پردے ڈال دیئے ہیں، دانشمندو! اتنا نہیں سوچتے کہ یہ نورانیت محمدیہ اگر پائی جائے تو آیات الٰہیہ میں سے ایک آیت ہوگی، جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے وہ روشن سے روشن ترین آیات اور معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے، موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضاء، عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور معجزات احیائے موتیٰ وغیرہ، اور حضور ﷺ کا معجزہ شق القمر دیکھ کر بھی اگر کفار ایمان نہیں لائے اور اللہ تعالیٰ کی روشن آیات و معجزات کو جادو کہہ کر انکار کر دیا تو نورانیت محمدیہ کو دیکھ کر ایمان نہ لانا کون سے تعجب کی بات ہے، ظالمو قرآن کی یہ آیت بھی بھول گئے ہو:

وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ

"اور اگر کافر خدا کی قدرت کا کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو ایک ایسا جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے"۔

عامر صاحب نے ہمارے مسلک پر یہ اعتراض بھی کیا ہے:

"اگر حضور کا سورج اور چاند سے زیادہ روشن ہونا ظاہری اور طبعی معنی میں درست ہے تو پھر یہ لازماً ہونا چاہئے تھا کہ پورا عرب نہ سہی، مکہ یا مدینہ سہی، یہ بھی نہ سہی تو وہ راستے اور مکان سہی جن میں حضور موجود

ہوتے تھے اس طرح روشن رہا کرتے جس طرح دن میں ہوتے ہیں"۔ (تجلی دیوبند، بابت ماہ جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۲۸، ۲۹)

اس کا جواب ظل نمبر کے صفحات پر نہایت تفصیل اور پوری تحقیق کے ساتھ دیا جا چکا ہے جسے عامر صاحب سمجھ نہیں سکے یا جان بوجھ کر اس کے جواب میں لایعنی باتوں کا ایک طومار باندھ دیا، ہم نے جواباً عرض کیا تھا کہ نفیٔ ظہور نفیٔ وجود کو مستلزم نہیں، ظہور دو طرح سے ہوتا ہے، نفسِ ظہور اور ظہور عند الناظر، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، مگر عامر صاحب اس کو نہیں سمجھ سکے، انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بچکانہ اور بے مغز باتیں کہی ہیں جو قطعاً لائق التفات نہیں، لیکن ہم ان کے زعم باطل کو توڑنے کے لئے عرض کرتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ کے ظاہری معنی میں نور ہونے کے لئے یہ لازماً ہونا چاہئے تھا کہ پورا عرب یا مکہ اور مدینہ یا وہ راستے اور مکان جن میں حضور موجود ہوتے تھے سب روشن ہو جاتے تو ملائکہ کرام خصوصاً ملائکہ مقربین جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل علیہم السلام (جن کے ظاہری اور حقیقی نور ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں) کے نور حقیقی ہونے کے لئے لازماً یہ چاہئے تھا کہ زمین سے آسمان تک تمام جہان ظلمت اور تاریکی کے موقع پر اور رات کے وقت بھی دن کی طرح روشن رہتا، کیونکہ ہر انسان کے ساتھ فرشتے موجود رہتے ہیں، نیز زمین سے آسمان تک شب و روز فرشتوں کی آمد و رفت حقیقت ثابتہ اور مسلم بین الفریقین ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا، تو کیا ملائکہ کے نور یا اس کے فی نفسہٖ ظہور کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور کہا جائے گا کہ ملائکہ کے نور ہونے اور اس کے فی نفسہٖ ظہور کے باوجود دیکھنے والوں پر بھی اس کا ظہور ہمیشہ نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات دیکھنے والوں پر بھی فرشتوں کے نور کو ظاہر فرما دیتا ہے جیسا کہ بخاری شریف میں صریح حدیث وارد ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کے وقت سورۂ بقرہ کی تلاوت فرما رہے تھے کہ

اچانک ان کا گھوڑا بدکنے لگا، قریب تھا ان کے بیٹے یحییٰ کو پامال کردے، اچانک ان کی نظر آسمان کی طرف اٹھی، بادل کی طرح ایک سائبان نظر آیا جس میں بے شمار چراغ روشن دکھائی دیئے، صبح کو رسول اللہ ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اے اسید بن حضیر! تم جانتے ہو کہ یہ چراغ کیسے تھے؟ عرض کیا حضور مجھے معلوم نہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا! یہ ملائکہ تھے جو قرآن سننے کے لئے قریب ہو گئے تھے، اگر تم پڑھتے رہتے تو فرشتے غائب نہ ہوتے اور دوسرے لوگ بھی صبح کو انہیں اسی طرح دیکھ لیتے۔

(دیکھئے بخاری شریف، جلد ثانی، ص ۷۵۰)

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ ملائکہ کی نورانیت کا ظہور دیکھنے والوں کے لئے ایک وقت خاص میں ہوا، حالانکہ ملائکہ قطعاً نوری مخلوق ہیں اور ان کی نورانیت ہر وقت ظاہر ہے، ثابت ہوا کہ ظہور بنفسہٖ کے لئے ظہور للناظر ضروری نہیں، اسی طرح حضور ﷺ کے شفاف اور لطیف جسم اقدس سے نورانیت کا نفس ظہور ہر وقت متحقق ہے لیکن ناظرین کے لئے اس کا ظہور اوقات مخصوصہ میں ہوا جو نفسِ ظہور کے منافی نہیں، حضور کا سایہ نہ ہونے کے لئے نورانیت محمدیہ کا نفسِ ظہور کافی ہے، ظہور للناظر ضروری نہیں، اگر عامر صاحب کے دماغ میں فکر صحیح کی ادنیٰ صلاحیت بھی موجود ہے تو ہمارے اس بیان کو سمجھنے میں انہیں کوئی دقت واقع نہ ہوگی اور اگر وہ اب بھی نہ سمجھے تو ہم سمجھ لیں گے کہ وہ فکر سلیم اور طبع مستقیم سے بالکل عاری ہیں۔

ہمارے اس بیان کی روشنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس حدیث کا مفہوم بھی واضح ہو گیا کہ لم یقم مع الشمس الا غلب ضوءہ ضوءھا، الحدیث یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ نہیں فرما رہے کہ حضور ﷺ کی نورانی روشنی دیکھنے والوں کی نظر میں سورج کی روشنی پر غالب ہو گئی بلکہ نفسِ

واقعہ بیان فرمارہے ہیں، بایں طور کہ اگر غلبۂ نور محمدی کا ظہور دیکھنے والوں کے لئے ہو تو وہ یہی دیکھیں گے کہ نور محمدی کی روشنی سورج اور چراغ کی روشنی پر غالب ہے کیونکہ اصل واقعہ یہی ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی کو دیکھنا میسر نہ ہو۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق جب چاہتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اس پر غلبۂ نور کے ظہور کو مرئی فرمادیتا ہے۔

حضور سیّد عالم ﷺ کی نورانیت فرشتوں کی نورانیت سے بدرجہا افضل واعلیٰ اور برتر و بالا ہے، جس طرح ان کی نورانیت باوجود ظاہر ہونے کے ہر ایک کو ہر وقت محسوس نہیں ہوتی اسی طرح حضور ﷺ کی نورانیت بھی باوجود ظاہر ہونے ہر شخص کو ہر جگہ اور ہر وقت محسوس نہیں ہوتی، لیکن جس طرح یہ عدم احساس فرشتوں کی نورانیت اور ان کے ظہور کے منافی نہیں اسی طرح حضور ﷺ کی نورانیت اور اس کے نفس ظہور کے منافی نہیں۔

حضور ﷺ کے نور مبارک کے فی نفسہٖ ظہور کا ناظرین کے لئے محسوس نہ ہونا اور اس کے باوجود اس کا تسلیم کرنا اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ حضور ﷺ تاریکی میں اس طرح دیکھتے تھے جس طرح اُجالے میں دیکھتے تھے، یہ حدیث حسن ہے اور اسے بیہقی نے روایت کیا، دیکھئے زرقانی، جلد ۴، ص ۸۳۔

نیز صحاح کی اس حدیث سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے جسے حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا "واللہ انی لا راکم من وراء ظہری" الحدیث، یعنی خدا کی قسم میں تمہیں پیچھے سے اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے آگے سے دیکھتا ہوں، جماعت متقدمین سے تو یہاں تک منقول ہے کہ حضور ﷺ ہر طرف دیکھتے تھے۔

(زرقانی شرح مواہب، جلد ۴، ص ۸۴)

ظاہر ہے کہ یہ رؤیت نور کے بغیر ناممکن ہے اور ہر طرف سے رؤیت کا ہونا

اس بات کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ کے تمام جسم اقدس میں نور موجود تھا، جس کی وجہ سے حضور ہر طرف دیکھتے تھے لیکن ناظرین کے لئے یہ نور محسوس نہ تھا باوجود اس کے انہوں نے اس کو تسلیم کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک کو ہم اس معنی میں ہرگز نور نہیں سمجھتے کہ جسم اقدس بشریت اور عنصریت سے خالی تھا بلکہ ہمارا مسلک یہ ہے کہ جسم اقدس عناصر اربعہ سے مرکب ہونے کے باوجود عنصریت اور مادیت کے تمام نقائص اور بشریت کے جملہ عیوب سے مبرہ اور منزہ تھا، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے جسم اقدس کو اتنا صاف اور شفاف مخلوق فرمایا تھا کہ ذات مقدسہ کے باطنی نور کی چمک بدن مبارک سے ظاہر ہوتی تھی لیکن خارج میں اس کے ظہور کا احساس حکمت ومشیت ایزدی کے مطابق ہی ہوتا تھا۔

عامر صاحب نے میری پیش کردہ احادیث پر کلام کرتے ہوئے عجیب متضاد باتیں کی ہیں، ایک طرف تو وہ یہ مانتے ہیں کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک نورِ حسّی اور ظاہری سے بالکل خالی نہ تھا، دوسری طرف وہ تشبیہ کی آڑ لے کر اپنی تکذیب آپ فرما رہے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ طلعت رسالت کو نورِ حسّی مان کر پھر اسی طلعت کو نورِ حسّی سے تشبیہ دینا کس قدر لغو اور بے معنی ہے، پھر انہوں نے دیدہ و دانستہ دھوکا دینے کے لئے بعض شارحین مثلاً قسطلانی و زرقانی کے کلام سے تشبیہات کا لفظ بالکل بے محل نقل کر دیا، جن حدیثوں میں حضور ﷺ کے چہرہ انور کے متعلق "کان الشمس تجری فی وجه رسول الله ﷺ" اور "کانه قطعة من القمر" جیسے الفاظ میں تشبیہات وارد ہوتی ہیں، ان کی شرح کرتے ہوئے شارحین نے ان تشبیہات واردہ پر کلام فرمایا ہے جس کا ہمارے مستدل سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارا استدلال تو ان احادیث سے ہے جنہیں دیکھ کر عامر صاحب کو بھی کہنا پڑا کہ ہم حضور ﷺ کے جسم

مبارک کو حسی اور ظاہری نور سے خالی نہیں مانتے۔

پھر لطف یہ کہ عامر صاحب نے حافظ ابن حجر کی ایک عبارت نقل کر کے عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے، کہتے ہیں:

"حضور کو جب چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ صرف روشنی ہوتی ہے نہ کہ چاند کے دیگر خواص واوصاف"۔

(تجلی دیوبند، بابت جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۳۲)

دانشمند سے کوئی پوچھے کہ جب تم خود مان رہے ہو کہ چاند سے "حضور کی تشبیہ میں وجہ شبہ صرف روشنی ہوتی ہے" تو حضور ﷺ کے لئے روشنی ثابت ہوئی یا نہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ وجہ شبہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں مشترک ہوتی ہے اور جب روشنی یعنی نور حسی کو وجہ شبہ مان لیا گیا تو حضور ﷺ کے جسم اقدس میں اس کا پایا جانا ایسا ضروری ہو گیا جیسا کہ چاند میں ضروری ہے۔

حضور ﷺ کے جسمانی سایہ کے ثبوت میں عامر صاحب کی ایک اور گلفشانی ملاحظہ ہو، بخاری شریف کی طویل حدیث کا ایک جملہ نقل کیا ہے اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی لکھ دیا ہے جو حسب ذیل ہے:

"فلما قیل ان رسول اللہ ﷺ قد اظل قادما زاح عنی الباطل وعرفت انی لن اخرج منه ابدًا بشیء فیه کذب"۔

"پس جب خبر ملی کہ حضور مدینہ سے اس قدر قریب آچکے ہیں کہ ان کا سایہ ارض مدینہ پر پڑ سکتا ہے تو معا میرے دل سے غلط سلط بہانے بازی کا خیال کافور ہو گیا اور میں نے یقین کر لیا کہ حیلے بہانے مجھے میری موجودہ پوزیشن سے ہرگز عہدہ برآنہ کر سکیں گے"۔

(تجلی دیوبند، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۳۳)

عامر صاحب نے اظل قادما کا ترجمہ کیا ہے کہ "ان کا سایہ ارض مدینہ پر پڑ سکتا ہے" اور اسی فقرہ سے وہ حضور ﷺ کا سایہ ثابت کر رہے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ اس کے بعد متصلاً خود ہی لکھتے ہیں:

"ہم خوب جانتے ہیں کہ اظل قادمًا ایک اصطلاحی فقرہ ہے جس کے معنی فی الحقیقت یہ نہیں ہوتے کہ سچ مچ آنے والی شے کا سایہ پڑ رہا ہے بلکہ یہ بہت قریب آجانے کے معنی میں بولا جاتا ہے"۔

(تجلی دیوبند، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۳۳)

عامر صاحب کی ان دونوں عبارتوں کو ملائیے اور سر دھنئے

ع ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

اس کے بعد عامر صاحب چھچھوندر چھوڑنا کہ "جب منکرین ظل نے یہ اندھیر مچا رکھا ہے...... تو کیوں نہ ہمیں بھی اجازت ہو کہ تمثیل کو حقیقی معنی میں لے لیں"۔ گوز شتر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا! اگر آپ کے زعم باطل میں منکرین ظل دوزخ کی طرف جا رہے ہوں تو کیا آپ بھی جہنم کے گڑھے میں گرنے کی اجازت طلب کریں گے؟

حضور ﷺ کی نورانیت کے منکرین کا پرانا ہتھکنڈا یہ ہے کہ جہاں کسی آیت یا حدیث میں حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کے لئے لفظِ نور دیکھا، بلا تامل محض ہدایت کے معنی پر محمول کر دیا اور لفظِ نور کو ہدایت محضہ قرار دے دیا۔

السعید کے ظل نمبر (ظل النبی) میں منکرین کے اس پرانے ہتھکنڈے کا صفایا کیا گیا تھا اور نہایت تفصیل سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ استعارہ کے معنی تو یہ ہیں کہ مشبہ بہ بول کر علاقہ تشبیہ کی بنا پر مشبہ مراد لیا جائے۔

اس میں شک نہیں لفظِ نور قرآن وحدیث میں استعارہ کے طور پر کئی جگہ استعمال ہوا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حقیقی معنی میں کسی جگہ وارد نہ ہوا ہو۔

استعارہ وہیں ہو سکتا ہے جہاں اس لفظ سے مشبہ مراد لینا ممکن ہو لیکن جہاں اس لفظ کے ساتھ مشبہ بہ کے ایسے اوصاف مذکور ہوں جن کے ہوتے ہوئے تشبیہ مراد لے کر مشبہ پر حمل ناممکن ہو تو ایسی صورت میں وہ لفظ استعارہ نہیں ہو سکتا! اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کہا گیا تھا کہ اگر کوئی شخص رَاَیْتُ اَسَدًا کہے تو اسے استعارہ قرار دینا ممکن ہے لیکن جب کسی نے رَاَیْتُ اَسَدًا یَفْتَرِسُ کہا تو آپ اسے استعارہ نہیں کہہ سکتے۔

عامر صاحب کی ذکاوت طبع ملاحظہ کیجئے! دانشمند نے پورے مضمون سے آنکھ چرا کر صرف لفظ یَفْتَرِسُ کو مدنظر رکھ لیا اور یہ نہ سمجھا کہ اس سے وہ صفات مراد ہیں جو حقیقی وصفِ افتراس کو متعین کر دیں جس کے بعد حیوانِ مفترس کے سوا کسی دوسرے پر اس لفظ کا حمل ممکن نہ ہو، اس غلط فہمی کی بنیاد پر کئی غلط مثالیں لکھ گئے! لیکن بالآخر اس کا انجام کیا ہوا؟ وہی جو ہونا چاہئے تھا: یعنی

وہی کہنا پڑا آخر انہیں بھی ہم جو کہتے تھے
ہماری بات کی اوّل بڑی تردید ہوتی تھی

چنانچہ اسی استعارہ کی بحث میں "نور" سے نورِ حسّی مراد لینے کے لئے السعید میں جو دلائل پیش کئے گئے تھے ان کے جواب سے عاجز ہو کر عامر صاحب کو حضور ﷺ کے جسم اقدس میں نورِ حسّی ماننا پڑا، اور یہ کہ انہوں نے حضور ﷺ کے بعض اعضاء مبارکہ میں بعض اوقات اس نورِ حسّی کا ظہور تسلیم کیا، اسی استعارہ کی بحث میں "السعید" کی پیش کردہ روایات کے جواب میں فرماتے ہیں:

"دانتوں کی ریخوں سے نکلنے والا نور یا ناک کا نور یا انبساط کے وقت پیشانی کے خطوط کی چمک یا وہ نور جس کی جھلک کبھی دیوار پر دیکھی گئی اگر یہ استعارہ نہیں بلکہ حسّی طور پر ہی نور ہو تو اس سے پورے جسد اطہر کا مستقل طور پر ایسا نور حقیقی کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اس کا سایہ

بھی نہ پڑتا ہو"۔

چند سطر بعد لکھتے ہیں:

"لیکن روایات تو خود ہی بتا رہی ہیں کہ سراپا نور کا ذکر نہیں بلکہ ایک انسان کا تذکرہ ہے جس کے بعض اعضاء جسم سے خاص اوقات میں اخراج[1] نور کا مشاہدہ کیا گیا"۔ (تجلی دیوبند، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۳۹)

ناظرین کرام غور فرمائیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" اور کسے کہتے ہیں، جب ہماری پیش کردہ روایات کے بعد آپ مان چکے کہ حضور ﷺ کا جسم اقدس نور حِسّی سے بالکل خالی نہیں (جیسا کہ اس سے پہلے تجلی کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے) اور اب استعارہ کی بحث میں بھی آپ کا آخری فیصلہ یہ ہی ہے کہ حضور ﷺ کے اعضاءِ جسم اقدس سے نور کے نکلنے کا مشاہدہ کیا گیا، تو اب یہ کہنا کہ "اگر یہ استعارہ نہیں" الخ کس قدر بے معنی اور دوراز کار ہے، نور حِسّی مان کر "اگر" "مگر" کرنا عامر صاحب کی شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ صاف لفظوں میں اس کا اقرار نہ کریں اور ضد پر اڑے رہیں۔

اَب اتنی گفتگو باقی رہی کہ حضور ﷺ کا پورا جسم اقدس نورانی تھا یا صرف بعض اعضاء مبارکہ! تو اس کے متعلق سابقاً لکھ چکا ہوں، سردست اتنا اور عرض کروں گا کہ عامر صاحب جو بار بار فطرت کو سامنے لا کر حضور ﷺ کے کمالات نورانیت کا انکار کرتے ہیں، ذرا بتائیں کہ وہ کون سے قانون فطرت کی رو سے اپنے اس مسلے کو ثابت کریں گے کہ علوم ومعارف کا نور معنوی "حِسّی نور" کی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے، پھر اس تبدیلی کے بعد عالم وعارف کے بعض اعضاء سے اس کا ظہور ہو اور بعض سے نہ ہو سکے جب کہ تمام اعضاء اور پورا جسم ایک ہی نوعیت کا ہو۔

---

[1] خروج کی بجائے اخراج لاعلمی نہیں محض اختلال حواس کی وجہ سے ہے۔

لامحالہ آپ یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور خرق عادت اس نور معنوی کو حِسی حقیقی نور کی صورت میں تبدیل فرمادیا، جو حضور ﷺ کے جسم مبارک سے چمکا، جب بعض اعضاء مبارکہ سے اس کا چمکنا خرق عادت کے طور پر ثابت ہوگا تو کل اعضاء مقدسہ سے اس کے ثبوت میں کون سا امر مانع ہے جب کہ لفظ نور حضور ﷺ کے پورے وجود اقدس کے لئے دلائل شرعیہ اور کلام اکابر میں وارد ہوا۔

رہا یہ امر کہ جن روایات میں ظہور نور کا بیان ہے ان میں بعض اعضاء ہی کا ذکر ہے، تمام اعضاء مبارکہ مذکور نہیں، مثلاً چہرۂ انور، دندان مبارک، جبیں! پیشانی مقدسہ! لہٰذا ان اعضاء کے سوا دیگر اعضاء کا منور ہونا منفی رہے گا، تو عجیب مضحکہ خیز بات ہے، اگر کوئی شخص اپنے محبوب کا حسن بیان کرنے کے لئے یہ کہہ دے کہ میرے محبوب کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا ہے تو کیا اس چہرہ کا لفظ آجانے کی وجہ سے کوئی کہہ سکے گا کہ چہرے کے سوا باقی تمام جسم کالا سیاہ ہے، اگر عام انسانوں کے لئے چہرہ کا ذکر باقی اعضاء کے حسن کی نفی نہیں کرتا تو رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کا ذکر جمیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باقی اعضاء مقدسہ کے نور کی نفی کس طرح کرسکتا ہے؟ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ دیگر اعضاء مقدسہ کا ذکر بھی احادیث میں صراحۃً وارد ہے۔

نوٹ

یہ مکمل مضمون ماہنامہ "السعید" ملتان کے درج ذیل شماروں میں شائع ہوا

(۱) ماہنامہ السعید، شمارہ اپریل مئی ۱۹۶۰ء (۲) ماہنامہ السعید، شمارہ جولائی ۱۹۶۰ء
(۳) ماہنامہ السعید، شمارہ اگست، ستمبر ۱۹۶۰ء (۴) ماہنامہ السعید، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۰ء
(۵) ماہنامہ السعید، شمارہ نومبر ۱۹۶۰ء (۶) ماہنامہ السعید، شمارہ دسمبر ۱۹۶۰ء
(۷) ماہنامہ السعید، شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء (۸) ماہنامہ السعید، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء
(۹) ماہنامہ السعید، شمارہ مئی ۱۹۶۱ء (۱۰) ماہنامہ السعید، شمارہ نومبر ۱۹۶۱ء۔ (خلیل احمد رانا)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

(علوم شریعت و طریقت کے جامع تھے)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت نہ صرف برصغیر بلکہ دُنیائے اِسلام میں علم و عمل اور ظاہری و باطنی کمالات کے اعتبار سے مسلم ہے۔ ان کے کسی ایک کارنامے کو اگر موضوع قرار دیا جائے تو اس کی تفصیل کے لیے سینکڑوں صفحات بھی کافی نہ ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحب علوم شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ تمام علوم میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ دینی علوم بالخصوص علم حدیث سے آپ کو انتہائی شغف تھا اور آپ کی علمی خدمات علمی دنیا میں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہوں سے ہمیشہ دیکھی جاتی رہیں گی۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ آخر عمر میں وہ مسلک اہلسنت سے منحرف ہو گئے تھے جیسا کہ ان کی آخری تصنیفات مثلاً "تفہیمات الٰہیہ" وغیرہ کی بعض عبارات سے ظاہر ہوتا ہے لیکن فقیر کے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک و عقیدہ آخر تک وہی تھا جو انہوں نے اپنی تصنیفات "فیوض الحرمین انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" اور "انفاس العارفین" وغیرہ میں اپنے اکابر سے نقل فرمایا اور خود بھی اسی کی تائید فرمائی۔ شاہ صاحب کی ایسی عبارات کے اقتباسات ماہنامہ "السعید" ملتان میں فقیر شائع کرتا رہا ہے بلکہ دیوبندی مکتب فکر کا جریدہ "الفرقان" بریلی شاہ ولی اللہ نمبر میں اس قسم کا مواد شائع کر چکا ہے جس سے فقیر کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ تفہیمات وغیرہ کی جن عبارات سے بعض حضرات کو شبہ پیدا ہوا وہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک ایسے طبقے کے کثیر التعداد لوگ بھی تھے جو ان پڑھ، جاہل، کٹر مزاج ہندوؤں میں سے مسلمان ہو

گئے تھے اور ہندوانہ رسم و رواج ان کے رگ و پے میں راسخ تھے۔ ان کے عقائد میں بھی ہندوانہ جاہلیت کے اثرات کے ساتھ ان کی عقیدت میں جاہلیت کا رنگ پایا جاتا تھا۔ وہ ان کے مزارات پر جاتے اور استقلال ذاتی کے اعتقاد سے ان کی منتیں مانتے اور اسی انداز سے ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے اور اسی جاہلانہ عقیدے سے اپنی حاجتیں اور مرادیں ان سے طلب کرتے تھے اور اسلام لانے کے باوجود وہ مشرکانہ عقائد میں مبتلا تھے۔ انہی مشرکانہ عقائد کے ساتھ بزرگوں کی قبروں پر جانے اور استمداد وغیرہ کو شاہ صاحب نے شرک قرار دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شرک ہے۔ مشرکانہ عقائد کے بغیر بزرگوں کے مزارات پر جانے اور ان کو وسیلہ ماننے اور صحت اعتقاد کے ساتھ ان کی نذر و نیاز کو انہوں نے اپنے بزرگوں خصوصاً اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ سے جابجا اپنی کتابوں میں نقل فرمایا۔ اگر "تفہیمات" وغیرہ کی عبارات کو مسلک اہلسنت سے ان کا انحراف قرار دیا جائے تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کے والد ماجد سمیت ان کے وہ سب بزرگ مشرک قرار پائیں گے اور ایسی صورت میں ان کے وہ تمام سلاسل جو انہی لوگوں سے وابستہ ہیں سب جاہلیت قرار پائیں گے جو صراحۃً باطل ہے۔

بعض فقہی مسائل میں شاہ ولی اللہ صاحب کا تفرد ان کی ذاتی تحقیق پر مبنی ہے جس سے اہل علم کے لیے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس تفرد کو مسلک اہلسنت سے انحراف پر محمول کرنا صحیح نہیں۔

سید احمد سعید کاظمی امروہی

ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ العلماء پاکستان
مہتمم مدرسہ عربیہ انوار العلوم، ملتان

انفاس العارفین کا ایک ورق

شیخ اللہ دِیا کی دعوت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل واقعہ میں جو حضرات موجود تھے میں نے ان سے سنا کہ

میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ حضرت مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف پر زیارت کیلئے قصبہ ڈاسنہ تشریف لے گئے۔ رات کا وقت تھا۔ وہاں حضرت نے فرمایا کہ حضرت مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ ہماری دعوت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کچھ کھا کر جانا۔ سب حضرات نے توقف کیا۔ یہاں تک کہ رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے درگاہ شریف پر آنے جانے والے آدمیوں کا بھی کوئی نام ونشان باقی نہ رہا۔ تمام احباب سخت ملول اور نہایت پریشاں خاطر تھے کہ اچانک ایک عورت دودھ چاول کی پکی ہوئی کھیر کا ایک طبق سر پر اٹھائے ہوئے آئی اور کہنے لگی کہ میں نے نذر مانی تھی کہ میرا خاوند آجائے تو میں اسی وقت یہ کھانا پکا کر حضرت مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کے درگاہ نشینوں کو پہنچاؤں گی۔ میرا خاوند ابھی آگیا۔ میں نے اسی وقت نذر پوری کی۔ چونکہ رات زیادہ گزر چکی تھی اس لئے دِل میں یہ تمنا لئے ہوئے تھی کہ خدا کرے درگاہ شریف پر اس وقت کوئی موجود ہو جو یہ کھانا کھالے۔ ''الحمد للہ تمنا پوری ہوئی۔'' انفاس العارفین ص ۴۶ (مترجم ص ۱۱۲)

انفاس العارفین کا ایک ورق

(۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فرماتے تھے کہ اسم ذات کا شغل جو حضرت زکریا علیہ السلام سے میں نے پایا تھا مجھ پر غالب ہو جاتا تھا۔ میں اس سے بہت لذت پاتا تھا لیکن نفی اور اثبات نہ کر سکتا تھا۔ اگر کرتا تو لذت محسوس نہ ہوتی تھی۔ مجھے اس وجہ سے بہت شرمندگی تھی۔ حضرت سید عبداللہ قدس سرہٗ سے اس کے علاج کی درخواست کی۔ حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے چند بار توجہ فرمائی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فرمانے لگے جو چیز انبیاء کرام علیہم السلام کے انفاس طیبہ سے پختہ ہو گئی ہو ہم اس کو نہیں بدل سکتے۔ بارگاہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیجیے، وہیں سے اس کا علاج ہوگا۔ میں نے بارگاہِ محمدیت صلی اللہ علیہ وسلم میں التجا کی تو نفی اثبات کا شغل غالب آ گیا اور بہت ہی آسان ہو گیا اور ایسا آسان ہوا کہ میں اس عمر میں باوجود اشتغال تحصیل اور بے شمار رکاوٹوں کے ایک سانس کے اندر دو سو مرتبہ نفی اثبات کا ذکر کر سکتا ہوں۔ کسی طالب راہ سلوک میں ایسا انجذاب میں نے نہیں دیکھا۔ نہ ایسی کشش کسی میں پائی۔

(انفاس العارفین ص ۶)

اس بیان سے مندرجہ ذیل فوائد معلوم ہوئے۔

(۱) انبیاء سابقین علیہم السلام سے اب بھی فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں۔

(۲) اسم ذات کا شغل اور نفی و اثبات کا طریقہ پسندیدہ اور محمود ہے۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضور کے امتی بارگاہ نبوت میں التجائیں

پیش کرتے ہیں اور اپنی حاجات پاتے ہیں۔

(۲)

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ دراصل کھیڑی کے رہنے والے تھے جو بارہہ کے نواح میں ہے۔ ان کے والد ماجد نے وہیں اپنا وطن بنالیا تھا اور بچپن کی عمر میں ان کے والد وفات پا چکے تھے۔ حضرت سید عبداللہ کو اسی وقت سے خدا طلبی کا شوق تھا۔ جابجا اولیاء اللہ کی تلاش میں پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ پنجاب کے علاقہ میں ایک بزرگ کے پاس پہنچے جو فن قرأت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بیابان میں ایک مسجد تھی جس میں وہ رہتے تھے۔ آدمیوں کی آمدورفت اور اختلاط سے بے تعلق اور بہت ہی متوکل تھے۔ حضرت سید عبداللہ ان کی خدمت میں رہنے لگے اور سلوکِ معرفت کی راہ کے طالب ہوئے۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ تمہاری تلقین وارشاد ایک اور بزرگ کے سپرد ہے۔ ان شاء اللہ تم ان کی خدمت میں پہنچو گے لیکن حفظِ قرآن کی نعمت مجھ سے حاصل کرلو۔ حضرت سید عبداللہ اس جنگل میں مدتوں رہے۔ پورا قرآن مجید حفظ کرلیا اور اس بزرگ کی صحبت سے تجرید اور ترکِ دنیا کے آداب اور نفس و شیطاں کے مکروفریب سے بچنے کے طریقے سیکھ لئے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے تھے کہ ایک دِن وہ بزرگ اور حضرت سید عبداللہ دونوں قرآن مجید کا دور کررہے تھے کہ سبز پوش عربی شکل کے آدمی فوج درفوج ظاہر ہوئے۔ ان کا سردار مسجد کے قریب کھڑا ہوگیا اور قرأت سننے لگا۔ قرأت سننے کے بعد ان سبز پوش عربیوں کے سردار نے کہا ”بارك الله آدّيت حق القرآن“ اللہ برکت فرمائے تو نے قرآن کا حق ادا کردیا۔ یہ کہہ کر مراجعت فرمائی۔ ان بزرگ کی عادت یہ تھی کہ تلاوت قرآن مجید کے وقت وہ اپنی آنکھوں کو بند کرلیا

کرتے تھے اور کسی چیز کی طرف توجہ نہیں فرماتے تھے۔ جب قرآن مجید کی سورت پڑھ چکے تو انہوں نے سید عبداللہ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے۔ ان کی ہیبت سے میرا دِل لرزتا تھا مگر تعظیم قرآن کی وجہ سے میں اٹھ نہ سکا۔ سید عبداللہ نے بتایا کہ وہ ایسے ایسے آدمی تھے۔ جب ان کا سردار پہنچا تو میں بیٹھ نہ سکا۔ بے ساختہ اٹھا اور ان کی تعظیم کی۔ سید عبداللہ اور یہ بزرگ ابھی آپس میں باتیں کر رہی رہے تھے کہ ایک دوسرا آدمی اسی وضع کا آیا اور کہنے لگا کہ حضرت پیغمبر ﷺ گزشتہ رات اصحاب کے مجمع میں تشریف فرما تھے اور اس حافظ کی تعریف فرما رہے تھے جو اس جنگل میں رہتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے کہ علی الصباح ہم اس حافظ کو دیکھیں گے اور اس کی قرأت بھی سنیں گے۔ حضور ﷺ تشریف لائے تھے یا نہیں۔ اگر تشریف لائے تھے تو کہاں تشریف لے گئے۔ حضرت سید عبداللہ اور اس بزرگ نے جب یہ بات سنی تو دائیں بائیں دوڑے۔ مگر کوئی نشان نہ دیکھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے تھے مجھے گمان ہے کہ میرے حضرت نے بھی یہ فرمایا تھا کہ اس واقعہ کے بعد مدتوں تک اس جنگل میں خوشبو محسوس ہوتی رہی۔ میرے حضرت فرماتے تھے جب حفظِ قرآن سے فراغت ہوگئی تو اس بزرگ نے حضرت سید عبداللہ کو رخصت کر دیا اور فرمایا کہ جاؤ جہاں کوئی صاحب ولایت ہو اس کی خدمت میں رہ کر حصولِ مقصد کے لئے کوشش کرو۔ حضرت سید عبداللہ اس بزرگ کے فرمانے کے مطابق چل پڑے۔ یہاں تک کہ مقام سامانہ میں حضرت شیخ ادریس سامانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے۔ وہ ایک متوکل آدمی تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت کا دروازہ بند کئے ہوئے نہایت تنگی کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ سلسلہ قادریہ میں منسلک تھے۔ پہلی دفعہ جب حضرت شیخ کے پاس پہنچے تو شیخ نے فرمایا کہ بہت سے فقیر ہیں کسی اور کے پاس چلے جایئے۔ میرے پاس آپ نہیں رہ سکتے۔ ہاں اس شرط کے ساتھ رہ سکتے ہیں کہ طعام و لباس کی

خواہشات اور لوگوں کے ملنے جلنے سے بالکل منقطع ہو کر رہیں۔ بغیر حاجت ضروریہ کے میرے دروازے سے بھی باہر نہ جائیں۔ حضرت حافظ سید عبداللہ نے اس شرط کو قبول کرلیا اور ان کے پاس رہ کر سلوک حاصل کرنے لگے اور مردانِ خدا کی طرح اس موت اختیاری پر صابر بلکہ راضی رہے۔ شیخ نے جب ان کی ثابت قدمی دیکھی تو ان کے حال پر بہت توجہ فرمائی۔ اسی اثناء میں شیخ کا لڑکا ان سے قرآن مجید یاد کرنے لگا۔ اس وجہ سے شیخ کی توجہ اور بھی دوبالا ہو گئی۔ یہ بھی شیخ کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ حضرت حافظ سید عبداللہ فرماتے تھے کہ ان دنوں میں نے یہ عادت اختیار کر لی تھی کہ فقیروں کے استنجا کرنے کے ڈھیلے پتھروں سے رگڑا کرتا تھا۔ ایک دِن اپنی اس نیکی کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں خوشی اور خود پسندی کا اثر محسوس کیا۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ میرے دِل کے اس حال پر مطلع ہو گئے اور فرمایا کہ تم میرے چہرے اور بدن پر کچھ تغیر اور نشان دیکھتے ہو۔ میں نے کہا ہاں! فرمانے لگے ابتدائی دورِ طلب میں مَیں ایک بزرگ کے پاس پہنچا تو ان کے استنجا کرنے کے لئے مٹی کے ڈھیلوں کو اپنے چہرے اور بدن پر رگڑتا ملا کرتا تھا۔ اس رگڑنے اور ملنے کی بہت لذت پاتا تھا۔ یہ زخم کے نشانات وہی ہیں۔ پھر حضرت حافظ سید عبداللہ نے فرمایا کہ ان دنوں میری عادت تھی کہ شیخ اور ان کے اہل بیت کے کپڑے ہر جمعرات کو ایک ندی کے پانی پر لے جا کر اپنے ہاتھ سے دھویا کرتا تھا تا کہ سفید کپڑے پہن کر جمعہ کی نماز پڑھیں۔ ایک دِن جمعرات کو مجھے فاقہ تھا اور میں حسب دستور کپڑے لیکر ندی کے پانی پر پہنچا اور ایک کنارے پر جو آدمیوں سے خالی تھا بیٹھ کر کپڑے دھونے میں مشغول ہو گیا۔ جب سورج بہت گرم ہوا اور بھوک پیاس مجھ پر غالب ہو گئی تو میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس وقت ایک آدمی برقعہ پوش میرے پاس پہنچا اور مجھے ہوش میں لا کر برقع کے اندر سے گرم روٹیاں نکال کر مجھے دیں اور کہا کہ قرآن مجید میں تو نے

نہیں پڑھا "وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مَیں ڈرا کہ کہیں شیطان مجھے فریب دینے نہ آیا ہو۔ میں نے وہ روٹی قبول نہ کی۔ وہ بزرگ میرے دِل کے خیال پر مطلع ہوگیا اور فرمایا کہ اے فلاں یہ گمان نہ کر۔ یہ لفظ سنتے ہی وہ خیال میرے دِل سے دور ہوگیا۔ میں نے روٹی لے لی اور سیر ہوکر کھائی۔ پھر میرے دِل میں خیال آیا کہ ندی کا پانی بہت گرم ہے۔ کاش یہاں ٹھنڈا پانی ہوتا تو میں پی لیتا۔ میرے اس خیال پر بھی وہ بزرگ مطلع ہوگئے۔ اسی وقت برقع سے ٹھنڈا پانی نکال کر مجھے پلادیا۔ اس کے بعد میں نے کپڑے دھوئے اور دھلے ہوئے کپڑے شیخ کی خدمت میں لایا۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ سید صاحب آج آپ نے حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے روٹی لی ہے۔ محمدیوں کو چاہئے کہ خضر علیہ السلام کا احسان نہ اٹھائیں۔ (انفاس العارفین ص ۷۶، ۷۷، ۷۸)

اس بیان سے حسب ذیل فوائد معلوم ہوئے۔

(۱) اولیاء اللہ کی تلاش میں گھومنا عشقِ خداوندی اور اشتیاقِ معرفتِ ایزدی کا نشان ہے۔

(۲) بزرگانِ دین جو لوگوں کی آمد و رفت سے بے تعلق رہتے ہیں وہ صحیح معنی میں متوکل علی اللہ ہوتے ہیں۔

(۳) بزرگوں کی صحبت آدابِ معرفت کے حصول کا ذریعہ اور پاکیزگیٔ نفس کا وسیلہ ہے۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کے انوار و برکات سے صحابہ کرام بھی زندہ ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں اپنے رب کریم کے اذن سے اپنے وجودِ اقدس کے ساتھ اس عالم میں جاگتے ہوئے تشریف لاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روحانی و معنوی نسبت رکھنے والے غلام بحالتِ بیداری حضور

ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیض پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات حضور ﷺ کے وجودِ مبارک کی خوشبو بھی اس عالم رنگ و بو میں محسوس ہوتی ہے۔

(۵) توکل بزرگ کی نشانی ہے۔ بزرگانِ دین طالبانِ حق کو اپنے فیوض و برکات اس وقت عطا فرماتے ہیں جب ان کی ثابت قدمی اور اہلیت ظاہر ہو جائے۔ فقراء اور اہل اللہ کی خدمات بجالانا خواہ وہ بظاہر حقیر نوعیت کی کیوں نہ ہو موجب سعادت ہے۔

(۶) ریاضت اور مجاہدہ تکمیل سلوک کا زینہ ہے۔

(۷) شیخ کی خدمت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(۸) اولیاء اللہ لوگوں کے دِلوں کے حالات کو جانتے ہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں کو یہ قدرت دی ہے کہ وہ جنگلوں میں بھوکے پیاسے فقراء کو خرق عادت کے طور پر کھلاتے پلاتے اور باذن اللہ ان کی دستگیری فرماتے ہیں۔

(ماہنامہ ''السعید'' ملتان ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء، جلد ۱، شمارہ ۱۵، ص ۲۰ / ۲۳)

انفاس العارفین کا ایک ورق

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ:۔

میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میں حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ العزیز کے روضۂ منور کی زیارت کے لئے دوبارہ حاضر ہوا تو ان کی روح مبارک ظاہر ہوئی، اور فرمایا کہ تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام قطب

الدین احمد رکھنا۔ یہاں تک کہ میری بیوی سن ایاس کو پہنچ گئی تھیں۔ اس لئے میں نے گمان کیا کہ شاید پوتا مراد ہوگا۔ حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ میرے دِل کے خیال پر مطلع ہوئے اور فرمایا کہ یہ میری مراد نہیں جو تو نے گمان کیا، یہ لڑکا بلا واسطہ تیری صلب سے پیدا ہوگا، ایک عرصہ کے بعد نکاح ثانی کا سبب پیدا ہوا، اور اس کے بعد راقم الحروف فقیر ولی اللہ متولد ہوا۔ میری پیدائش کے بعد ابتداء میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ واقعہ فراموش ہوگیا۔ اس لئے میرا نام ولی اللہ رکھ دیا۔ پھر ایک مدت کے بعد آیا اور میرا نام قطب الدین احمد مقرر فرمایا۔

(انفاس العارفین ص ۴۴۔۴۵ مطبع مجتبائی)

فا بیان ہذا کی روشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل مسلک واضح ہوا:۔

(۱) قبور اولیاء اللہ رضی اللہ عنہم کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے۔

(۲) ارواحِ اولیاء کرام بعد الوصال اس عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۳) اولیاء کرام کو بعد الوفات بھی علم ہوتا ہے، بلکہ علم مافی الارحام ہوتا ہے، اور یہ علم استقرارِ حمل سے بھی پہلے ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس علم کی نفی غیر اللہ سے جو قرآن و حدیث میں وارد ہے وہ علی الاطلاق نہیں بلکہ ذاتی کی قید سے مقید ہے۔

(۴) اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ ایسا علم عطا فرماتا ہے کہ وہ بعد الوفات لوگوں کے دِلوں کا حال بھی جانتے ہیں۔

(۲) نیز اسی انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:
میر والد ماجد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہٗ کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وضو فرما کر نماز کی تیاری کر رہے

ہیں، میں نے عرض کیا یہ عالم تکلیف نہیں ہے، وضو اور نماز کیا معنی رکھتا ہے۔ فرمایا، جب دنیا میں ہم بکثرت اس سے لذت اندوز ہوتے تھے تو اب ان کاموں کا ادا کرنا لذت کی خاطر ہے، تکلیف کے باعث نہیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ارواح جمع ہو گئیں اور مجلس منعقد فرمائی۔ مجھ سے بھی فرمایا کہ تم بھی بیٹھو، میں نے عرض کیا حضور میں مجلس میں نہیں بیٹھا کرتا۔ ارشاد فرمایا کہ ہماری مجلس دوسروں کی مجلسوں کی طرح نہیں۔ بالآخر میں اس مجلس میں حاضر ہوا، وہاں وجد بھی تھا... ہم کیف اندوز ہوئے)

(انفاس العارفین ص ۴۵)

ف۲ بیان ہذا کی روشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل مسلک واضح ہوا۔

(۱) اولیاء اللہ بعد الوفات وضو اور نماز و دیگر عبادات بجالاتے ہیں۔

(۲) برزخ میں ان کی عبادات مکلف ہونے کی جہت سے نہیں بلکہ لذت وسرور کی بناء پر ہیں۔

(۳) عالم برزخ میں اولیاء کرام کی مجالس مبارکہ منعقد ہوتی ہیں اور ان پر وجد و کیف طاری ہوتا ہے۔

(۳) نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ

میرے والد ماجد شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت سیر کرتے ہوئے میں ایک نہایت مصفا مقبرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر ٹھہرا۔ اس وقت میرے دِل میں خیال آیا کہ یہاں میرے سوا کوئی بھی خدا کا ذِکر کرنے والا نہیں۔ اس خیال کے آنے کے فوراً بعد ایک مرد دو گیسوؤں والا کوزہ پشت ظاہر ہوا اور اس نے پنجابی زبان میں گانا شروع کیا۔ جس کا اصل یہ تھا کہ دیدار یار کی آرزو مجھ پر

بہت غالب ہے۔ میں اس کے نغمہ سے متاثر ہو کر اس کی طرف دوڑا۔ ہر چند میں اس سے نزدیک تر ہوتا تھا لیکن وہ مجھ سے دور تر جاتا تھا۔ اس وقت اس نے کہا کہ آپ کے دِل میں یہ خیال آیا کہ یہاں آپ کے سوا اللہ کا ذِکر کرنے والا کوئی نہیں۔ میں نے کہا، میری مراد یہ تھی کہ جو لوگ زندہ ہیں ان میں ذِکر کرنے والا صرف میں ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ اس وقت تو آپ کا خیال مطلق تھا۔ اب آپ زندوں کی قید لگا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ (انفاس العارفین ص ۴۶)

ف بیان ہذا کی رشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل مسلک واضح ہوا۔

(۱) اولیاء کرام عالمِ برزخ میں دنیا والوں کے دِلوں میں آنے والے خیالات کو جانتے ہیں۔

(۲) اولیاء کرام کی ارواح دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں، ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ نغمہ سرائی بھی کرتی ہیں اور دنیا میں اہل کمال ان کی آوازیں بھی سنتے ہیں۔

(۳) ارواحِ اولیاء کی یہ شان ہے کہ دنیا والوں کے دِلوں میں جو خیالات آتے ہیں ان کے مقید و مطلق ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔

(۴) نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ:۔

میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت شیخ بایزید "اللہ گو" رحمۃ اللہ علیہ نے حرمین طیبین کا ارادہ کیا۔ ان کے ساتھ بہت سے بوڑھے، بچے، عورتیں بھی شامل ہو گئے۔ کسی کے پاس کوئی زادِ راہ نہ تھا، نہ سواری۔

میرے برادرم مخدوم اور میں نے مل کر چاہا کہ انہیں واپس لے آئیں۔ جب ہم تغلق آباد کے قریب پہنچے تو سورج بہت گرم ہو چکا تھا۔ ہم ایک درخت کے سائے کے نیچے اترے، سب ساتھی سو گئے۔ میں ان کے کپڑوں کی حفاظت کی خاطر جاگ رہا تھا۔ اس اثناء میں مَیں نے قرآن پاک کی چند سورتیں تلاوت کیں۔ وہاں چند قبریں تھیں۔ ایک قبر والا بولنے لگا کہ ایک زمانہ دراز سے قرآن نہ سنا تھا اور مجھے قرآن سننے کا بہت اشتیاق تھا۔ اگر آپ کچھ اور پڑھیں تو بہت ہی احسان ہوگا۔ میں نے پھر تلاوت قرآن کی۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے پھر کہا۔ میں نے پھر قرآن پڑھا۔ اس کے بعد میرے برادر مخدوم کی خواب میں وہ صاحب قبر ظاہر ہوا اور کہا کہ میں نے آپ کے عزیز بھائی سے قرآن پڑھنے کی دو دفعہ درخواست کی، اس نے دونوں دفعہ میری درخواست قبول کر کے مجھے قرآن مجید سنایا، اب تیسری دفعہ ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور شوق ابھی باقی ہے، آپ ان سے کہیں کہ یہ پہلے سے کچھ زیادہ قرآن مجید مجھے سنائیں۔ میرے برادر مخدوم بیدار ہوئے اور مجھ سے فرمایا، میں نے کچھ زیادہ قرآن مجید پڑھا، یہاں تک کہ میں نے اس صاحب قبر میں انتہائی خوشی اور مسرت دیکھی۔ اس نے کہا جزاک اللہ عنی خیر الجزاء۔ اس کے بعد اس صاحبِ قبر سے عالمِ برزخ کے واقعات پوچھے۔ اس نے کہا کہ میں باقی قبروں والوں کے حالات سے تو واقف نہیں، لیکن اپنا حال بیان کرتا ہوں، کہنے لگا کہ میں نے جب سے دنیا سے انتقال کیا ہے، اگرچہ انتہائی خوش عیشی میسر نہیں ہے، لیکن کوئی عتاب اور عذاب بھی یہاں نہیں دیکھا۔ میں نے کہا کہ کچھ جانتے ہو کس عمل کی برکت سے عتاب وعذاب سے تم نے نجات پائی۔ اس نے کہا میں ہمیشہ یہ نیت رکھتا تھا کہ دنیاوی تعلقات اور موانع سے خالی ہو کر اللہ تعالیٰ کی طاعت اور ذِکر جاری رکھوں، اگرچہ تمام عمر اپنی نیت کے مطابق مجھے طاعت و ذِکر کا موقع نہیں ملا، لیکن حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے

اپنی عنایت سے میری اس نیت کو قبول فرما کر مجھے نجات دے دی۔ قیلولہ سے فارغ ہو کر ہم شیخ بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو واپس لے آئے۔ (انفاس العارفین ص ۴۶)

ف ۴ بیان ہذا کی روشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل مسلک واضح ہوا۔

(۱) اہل قبور سنتے ہیں اور دنیا والوں سے ہم کلام بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل قبور کا کلام اپنے محبین اہل دنیا کو سنا دیتا ہے۔

(۲) اہل برزخ دنیا والوں سے بلا واسطہ بھی کلام کر سکتے ہیں اور خواب میں آ کر بھی اپنا منشاء ظاہر کرنے کی قدرت بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔

(۳) اہل قبور صالحین سماع قرآن سے لذت حاصل کرتے ہیں، اس لئے قبور مومنین پر کلام مجید خوش آوازی سے تلاوت کرنا صالحین مقبورین کے لئے لذت وسرور کا موجب ہے۔

(۴) مومنین کی نیک اور پاکیزہ نیت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ اگرچہ موانع کی وجہ سے اس کے مطابق عمل کا موقع نہ ملا ہو۔

(۵) نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ:-

میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک دِن میں خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ العزیز کے مزار شریف کے قریب سیر کر رہا تھا، وہاں مجھے ایک قبر نظر آئی جس کے ذِکر سے زمین کے تمام اجزاء ساتویں آسمان تک اور فضائے آسمان کے تمام اجزاء عرشِ عظیم تک سب ذاکر ہیں۔ میں سخت متعجب ہوا۔

فضائل دستگاہ حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ اس وقت میرے ساتھ تھے، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ بھی اس قبر میں تامل فرمائیں۔ تامل کے بعد انہوں نے بھی وہی فرمایا جو میں نے دیکھا تھا۔ وہاں ایک بوڑھا دہقان تھا، میں نے اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہ ایک بزرگ کی قبر ہے، وہ دہقان کہنے لگا کہ میری عمر اسی سال ہے، اور میرے باپ کی عمر سو سال تھی اور میرے دادا کی عمر ایک سو بیس یا اس کے قریب تھی۔ میں نے اپنے باپ سے سنا، اور میرے باپ نے اپنے باپ سے سنا کہ اس قبر پر آدمیوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور آدمی بہت سی نذریں لاتے تھے اور زیارت کے لئے دور دور سے آتے تھے، اور اس مزار پر مزوّر (زیارت کرنے والے) لوگ بھی رہتے تھے، جیسا کہ آج خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر رہتے ہیں، اس زمانہ کے بعد اب ایسا وقت آیا کہ اس صاحب قبر ولی اللہ پر خمول (یکسوئی) کا حال غالب آ گیا، جس کی وجہ سے لوگوں کی توجہ بھی ادھر نہ رہی۔

(انفاس العارفین ص ۴۶۔ ۴۷)

فٓ ۵ بیان ہذا کی روشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل مسلک واضح ہوا:۔

(۱) اہل اللہ اپنے مزارات میں ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور ان کے انوار وبرکات زمین وآسمان حتیٰ کہ عرشِ عظیم تک پہنچتے ہیں۔

(۲) اولیاء اللہ دنیا میں ہوتے ہوئے مقبورین صالحین کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔

(۳) مزارات اولیاء اللہ پر زائرین کا دور دور سے آنا اور ان کی نذریں لانا مسلمانوں میں قدیم الایام سے رائج ہے۔ اسی طرح مزارات اولیاء اللہ پر خدام ومزوّرین ومجاورین کا ٹھہرنا بھی

پرانے زمانے سے صالحین کا طریقہ ہے۔

(۴) اولیاء اللہ پر بعد الوفات بھی مختلف حالات طاری ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ اہل دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور ان کی توجہ لوگوں کے لئے ان کے مزارات کی طرف کشش کا موجب ہوتی ہے، اور بعض اوقات وہ خود عالم استغراق میں یکسو ہوتے ہیں۔ جب ان پر یکسوئی کا حال طاری ہوتا ہے، تو اہل دنیا کے لئے موجب کشش نہ رہنے کے باعث ان کے مزارات پر آمد و رفت نہیں رہتی۔

(پندرہ روزہ ''السعید'' ملتان یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء، جلد ۱، شمارہ ۱۲ / ۱۳، ص ۴۰ تا ۴۳)

انفاس العارفین کا ایک ورق

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے والد علیہ الرحمۃ شہید ہو گئے تھے۔ وہ میرے لئے کبھی کبھی جسمانیت کے ساتھ ظاہر ہوتے تھے اور موجودہ اور آئندہ واقعات کی خبریں دیتے تھے۔ ایک میری بھتیجی کریمہ بیمار ہو گئی اور اس کی بیماری لمبی ہو گئی۔ میں ان دِنوں دوپہر کے وقت حجرے میں تنہا سو رہا تھا کہ اچانک والد موصوف ظاہر ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں کریمہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس جگہ عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس لئے وہاں جانا مجھے بارِ خاطر محسوس ہوتا ہے۔ ان عورتوں کو وہاں سے اٹھا دو۔ میرے لئے ان کا اٹھانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے وہاں ایک پردہ ڈال دیا۔ حضرت والد صاحب ممدوح کریمہ کے سرہانے اس طرح

تشریف لائے کہ انہیں میرے اور کریمہ کے سوا کوئی اور نہ دیکھتا تھا۔ کریمہ حضرت کو دیکھ کر ہوشیار ہوئی اور کہنے لگی۔ بڑا تعجب ہے۔ لوگ انہیں شہید کہتے ہیں۔ یہ تو زندہ موجود ہیں۔ فرمانے لگے۔ ان باتوں کو چھوڑو پیاری بیٹی! تم نے بہت بیماری اٹھائی ہے۔ ان شاء اللہ علی الصبح اذانِ فجر کے وقت شفائے کلی پاؤ گی۔ یہ فرما کر اٹھے اور دروازہ کا راستہ لیا۔ میں بھی پیچھے چلا۔ فرمایا تم ٹھہرو۔ یہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو کریمہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ قصبہ پھُلت میں تھے۔ کسی بزرگ کے عرس کی تاریخ آ گئی۔ قوالوں نے سرور بجانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے کہ شیخ ابوالفتح قدس سرہٗ کی روح مبارک ظاہر ہو کر رقص کر رہی ہے۔ قریب ہے کہ اس کا اثر اس مجلس میں بھی سرایت کرے۔ ابھی ایک لحہ نہ گزرا تھا کہ اہل مجلس کا حال متغیر ہو گیا اور ہائے ہو کا عجب شور بلند ہوا۔ (ص ۴۷)

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ جب مخدومی شیخ محمد قدس سرہٗ کی قبر کے پاس بیٹھتے تھے تو فرماتے تھے کہ ان کی روح نماز میں میری اقتداء کرتی ہے اور مجھ سے معارف سنتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد ماجد نے ایک مرتبہ میری طرف متوجہ ہو کر مجھ سے بعض معارف بیان فرمائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان کی روح نے کہا تھا کہ فلاں (یعنی شاہ ولی اللہ) کو کچھ معارف تعلیم کیجئے۔ لا محالہ تعمیل ارشاد کی خاطر معارف کی یہ باتیں تم سے کہی گئیں۔

(انفاس العارفین ص ۷۴ مطبع مجتبائی دہلی)

نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی انفاس العارفین میں فرماتے

ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک دِن میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اچانک ایک آدمی بہت ہی دراز قامت، نہایت باہیبت ہاتھ میں کمان اور چند تیر لئے ہوئے آیا اور سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ کہنے لگا ہم وباء پر مؤکل ہیں۔ آپ کی ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا۔ ہماری فوج اسی راستہ سے جارہی تھی۔ ہمارا دِل چاہا کہ آپ کو دیکھ لیں۔ آج ہم لوگ فلاں جگہ سے اٹھ کر فلاں جگہ جانے پر مامور ہوئے ہیں۔ آپ کو خوشخبری سناتے ہیں کہ آپ کے دوستوں اور مخلصوں میں سے کوئی شخص اس وباء میں نہ مرے گا۔

اس کے بعد اس نے سلام کیا اور چلا گیا۔ بعدازاں وباء کا منتقل ہونا وہیں پر ظاہر ہوا جہاں کی اس نے نشان دہی کی تھی۔ نیز دوستوں اور مخلصوں کا اس بلا سے محفوظ رہنا بھی ظہور پذیر ہوا۔ (انفاس العارفین، ص ۴۸)

(پندرہ روزہ ''السعید'' ملتان یکم ستمبر ۱۹۵۹ء، جلد ۱، شمارہ ۱۰/۱۱، ص ۴۶)

انفاس العارفین کا ایک ورق

(۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ابتدائی حال میں مجھے (اپنے نانا جان) حضرت شیخ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف سے الفت پیدا ہوگئی۔ میں وہاں جاتا اور ان کی قبر مبارک کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا۔ اکثر بیشتر غیب کا ایسا حال طاری ہوتا کہ گرمی سردی کا بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

(انفاس العارفین ص ۳، ۴)

فائدہ: معلوم ہوا کہ مزارات اولیاء اللہ پر جانا اور ان کی طرف متوجہ ہونا اور اس توجہ کے حال میں مستغرق ہو جانا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اسلاف کے معمولات سے تھا۔ اس کو ناجائز اور بدعت کہنا غلط ہے۔

(۲)

نیز شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میرے والد بزرگوار فرماتے تھے کہ (میرے نانا جان) حضرت شیخ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا اثاث البیت (گھر کا سامان) جمع کر کے اپنے ورثاء کو تقسیم فرمایا۔ اولاد میں سے ہر ایک کو اس کے حسب حال دیا۔ جب شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کی باری آئی جو سب اولاد میں چھوٹی تھیں تو انہیں کاغذ کے چند اجزاء دیئے جن میں فوائد طریقت اور اپنے پیروں کے اوراد اور ان کے شجرے تھے۔ حضرت شیخ کی اہلیہ مکرمہ نے فرمایا کہ یہ لڑکی کنواری ہے۔ اسے شادی کا سامان جہیز وغیرہ دیجئے۔ یہ کاغذات اس کے کیا کام آئیں گے؟ فرمایا یہ اوراق ہمارے بزرگوں سے ہمیں میراث میں ملے ہیں۔ اس لڑکی سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو ہماری معنوی میراث کا مستحق ہوگا۔ یہ اوراق اسے دینا۔ رہا جہیز اور شادی کا سامان تو ہمیں اس کی فکر نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود کارساز ہے۔ وہ آسان کر دے گا۔ عرصۂ دراز کے بعد جب میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری نانی مکرمہ کے دل میں بات ڈالی اور انہوں نے ہماری امانت ہمیں سپرد فرمائی جس سے ہمیں بہت نفع ہوا۔ (انفاس العارفین ص ۴)

فائدہ: معلوم ہوا کہ اپنا اثاث البیت اپنی زندگی میں ورثاء کو تقسیم کر دینا اور امانتیں ادا کر کے فارغ البال اور ذمہ داریوں سے بری ہو کر اپنے رب کے حضور پیش ہونے کی تیاری کرنا بزرگان دین کے آداب سے ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء کرام کو آنے والے واقعات کا علم ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اولیاء کرام کو

مدتوں پہلے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں عورت کے شکم میں لڑکا ہوگا! نیز فوائد طریقت اور بزرگانِ دین کے اوراد و شجروں کا مفید ہونا بھی معلوم ہو گیا۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نو یا دس سال کا تھا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک بزرگ خواجہ ہاشم نامی بخارا سے تشریف لائے۔ وہ ہمارے محلہ میں ساکن تھے۔ مجھ پر بہت التفات فرماتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا میں ایسا درود جانتا ہوں جو اسے پڑھے بہت مالدار ہو جائے۔ میرا دِل اس وقت تمام تعلقات سے منقطع تھا۔ میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ میرے والد کی وساطت سے ضرورت کے موافق مجھے رزق عطا فرما دیتا ہے۔ زائد کی مجھے حاجت نہیں۔ وہ بزرگ میری یہ بات سن کر چپ ہو رہے۔ پھر چند دِن کے بعد فرمایا مجھے ایسی دُعا یاد ہے کہ اگر اسے کوڑھی پر دَم کیا جائے تو اس کا کوڑھ جاتا رہے۔ میں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر کوئی جذامی ملا تو اسے آپ کی طرف رہنمائی کر دوں گا۔ حضرت خواجہ پھر خاموش ہو گئے۔ چند دِن کے بعد فرمایا صاحبزادے! درود اور دُعا سے ہمارا مقصد تو صرف یہ تھا کہ آپ جیسے بلند استعداد حضرات کو قابو کیا جائے لیکن آپ بڑے ہی بلند ہمت ہیں۔ دراصل ہم چاہتے ہیں کہ اشغال صوفیہ میں سے آپ کوئی شغل حاصل کر لیں۔ میں نے عرض کیا حضور! بسر و چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسم ذات کا شغل مجھے تلقین فرمایا۔ الخ

(انفاس العارفین ص ۵)

فائدہ: معلوم ہوا کہ درود شریف اور دُعاؤں سے فوائد اخرویہ کے علاوہ دنیوی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مال و دولت، شفاء امراض کا حصول، دُعاؤں اور

درود سے ہوتا ہے۔ اس کا انکار جہالت اور بے دینی ہے۔

نیز یہ کہ استقامت اور قناعت بہت بڑا کمال ہے اور اشغال صوفیہ برحق ہے۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین صفحہ ۸ میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ ادریس سامانی رحمۃ اللہ علیہ حجرہ میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول تھے۔ ان کے گھر والوں کی عادت تھی کہ جانوروں کا چارہ و بھوسا وغیرہ اس حجرہ میں ہر سال ذخیرہ کر دیا کرتے تھے۔ اتفاقاً اسی وقت چارہ بھرنا شروع کیا اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس حجرہ میں مشغول ہونے کی کسی کو خبر نہ تھی۔ حضرت شیخ کو بھی ایسی قوی غیبت تھی کہ انہیں اس حجرہ میں چارہ وغیرہ بھرے جانے کا کچھ احساس نہ ہوا۔ گھر والوں نے چارہ بھر کر حجرہ کا دروازہ بند کر دیا۔ بہت دیر کے بعد شیخ کو ڈھونڈا۔ مسجد میں تلاش کیا لیکن نہ پایا۔ آنے جانے والوں سے دریافت کیا، کچھ پتہ نہ چلا۔ بالآخر مایوس ہو گئے اور تلاش چھوڑ دی۔ چھ مہینے کے بعد جانوروں کا چارہ نکالنے کی جب ضرورت ہوئی تو حجرہ کھول کر چارہ نکالا۔ چارہ نکالنے والے کا ہاتھ حضرت شیخ پر پڑ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہاں کوئی ہے۔ جب اچھی طرح دیکھ بھال کی تو شیخ مل گئے اور انہیں پہچان لیا گیا۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا اور اس وقت شیخ کو بھی غیبت سے افاقہ حاصل ہوا۔ مگر انہیں چھ مہینہ کی طویل مدت بالکل محسوس نہ ہوئی اور اتنے عرصہ تک نہ کھانے پینے کی وجہ سے جسم پر ضعف و ناتوانی کا کوئی اثر بھی نہ پایا گیا۔ یہ واقعہ نوادر واقعات سے ہے۔

(انفاس العارفین ص ۸)

فائدہ: معلوم ہوا کہ بزرگوں پر مشغولی بحق تعالیٰ ایسی قوی ہوتی ہے کہ ماسوا اللہ کی

طرف التفات نہیں رہتا۔ نیز یہ کہ جسمانی غذاؤں کی حاجت روحانی لوگوں کو نہیں ہوتی۔ جب اولیاء امت کی روحانیت کا یہ حال ہے کہ چھ مہینہ تک کھانے پینے اور دیگر ضروریات بشری ولوازمات سے بالکلیہ بے نیاز ہو جاتے ہیں تو سید عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی کیا شان ہوگی، جن کی روحانیت اور نورانیت تمام اولیاء بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام حتیٰ کہ ملائکہ مقربین سے بھی افضل اور اعلیٰ ہے۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انفاس العارفین میں فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جن دِنوں اورنگزیب اکبر آباد میں تھے میں مرزا زاہد ہروی کوتوال لشکر کے پاس علم دین حاصل کیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ میں اکبر آباد گیا۔ حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی سید عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت کی وجہ سے وہاں تھے۔ انہیں اس جگہ ایک شدید مرض عارض ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ وصال فرما گئے۔ وصال سے پہلے حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے وصیت فرمائی کہ مجھے گورِ غریباں میں دفن کیا جائے تاکہ کوئی نہ پہچانے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں بھی ان دِنوں سخت بیمار ہونے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا اور جنازہ کے ساتھ نہ جا سکا۔ جب تندرست ہوا اور چلنے کی قوت حاصل ہوگئی تو ایک دوست کو ساتھ لیا جو حضرت سید عبداللہ کے دفن میں حاضر تھا اور ان کے مزار شریف پر حاضر ہوا۔ ان کا روحانی تصرف ایسا تھا کہ میرے ہمراہی نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک ہر چند تلاش کیا اور تامل سے کام لیا لیکن نہ پایا۔ بالآخر اس نے اندازہ سے ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا اور قرآن پاک پڑھتا رہا۔ اسی اثناء میں حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے میری پشت کے پیچھے اپنی قبر مبارک سے ندا فرمائی کہ فقیر کی قبر اس جگہ ہے لیکن جو کچھ شروع کیا ہے اسی جگہ ختم کرو

اور اس کا ثواب اسی صاحب قبر کو دو اور جلدی نہ کرو۔ میں نے جو شروع کیا تھا وہیں ختم کیا اور اپنے ساتھی سے کہا اچھی طرح غور کرو حضرت عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر اسی جگہ ہے جہاں تو نے اشارہ کیا یا میری پیٹھ کے پیچھے ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے غلطی کی۔ ان کی قبر مبارک واقعی آپ کی پیٹھ کے پیچھے ہے۔ میں اسی طرف بیٹھ گیا اور میں نے قرآن پڑھا۔ میں اس وقت صدمہ اور غم کی وجہ سے اکثر قواعدِ قرأت کی رعایت نہ کر سکا۔ حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے قبر کے اندر سے فرمایا کہ فلاں فلاں جگہ آپ نے اپنی قرأت میں سستی سے کام لے کر آدابِ تجوید میں کوتاہی کی ہے۔ قرأت قرآن میں پوری احتیاط کے ساتھ قواعد تجوید و قرأت کی پوری رعایت کرنی چاہیے۔

(انفاس العارفین ص ۱۴۔۱۵)

فائدہ: معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کا روحانی تصرف برحق ہے اور اولیاء اللہ اپنی قبور میں زندہ ہیں اور وہ دنیا والوں کو ندا بھی فرماتے ہیں اور انہیں علم و ادراک بھی ہے۔ منکرین سماع موتی اس واقعہ کو غور سے پڑھیں۔

(ماہنامہ "السعید" ملتان ماہ مارچ ۱۹۶۰ء، جلد ۱، شمارہ ۱۸، ص ۲۴ تا ۲۶)

اولیاء اللہ کا بیک وقت کئی مقامات پر پایا جانا

ترجمہ: الحاوی للفتاویٰ:- از مدیر مسئول

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "المنجلی فی تطور الولی" میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک سوال آیا کہ ایک شخص نے حلف بالطلاق کے ساتھ کہا کہ حضرت شیخ عبدالقادر طشطوطی فلاں رات میرے پاس رہے۔ دوسرے آدمی نے بھی طلاق کی قسم کھا کر کہا کہ رات حضرت عبدالقادر طشطوطی میرے پاس رہے ہیں۔ تو کیا ان دونوں میں سے کسی کی عورت پر طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟

میں نے اپنا قاصد حضرت شیخ عبدالقادر طشطوطی کے پاس بھیج کر اس واقعہ کی تحقیق طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر چار آدمی بھی کہیں کہ عبدالقادر طشطوطی ایک ہی رات الگ ہمارے گھر رہے تو وہ سب سچے ہوں گے۔ یہ جواب سن کر میں نے فتویٰ دے دیا کہ ان دونوں میں کوئی بھی اپنی قسم میں جھوٹا نہیں۔ لہٰذا کسی کی عورت پر بھی طلاق واقع نہ ہو گی۔

اور اس کی تقریر از روئے فقہ یہ ہے کہ یہ صورت واقعہ تین حال میں سے کسی ایک سے خالی نہ ہو گی۔ یا یہ کہ ان دونوں میں سے ہر شخص اپنے دعوے پر عینی شہادت پیش کر دے یا دونوں میں سے کوئی بھی شہادت شرعیہ پیش نہ کر سکے یا کوئی ایک پیش کر دے اور دوسرا پیش نہ کرے۔

پہلے دونوں حال ایسے ہیں کہ ان میں ہر دو قسم کھانے والوں کا ایک ساتھ جھوٹا ثابت نہ ہونا ظاہر ہے۔ اس لئے کہ دونوں کا معاً جھوٹا ہونا ممکن نہیں، شہادت شرعیہ قائم کرنے کی صورت میں تو اس لئے کہ اقامۃ بینہ اور شہادت شرعیہ موجب تصدیق ہے۔ تصدیق کا موجب ہوتے ہوئے تکذیب کیسے ہوسکتی ہے؟ اور عدم اقامہ بینہ کی صورت میں اس لئے کہ دونوں میں سے کسی کی تکذیب کا موجب نہیں پایا جاتا اور بغیر موجب تکذیب کے مسلمان کی تکذیب شرعاً جائز نہیں اور اگر ایک کی تصدیق اور دوسرے کی تکذیب کی جائے تو یہ تحکم ہوگا اور ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی جو باطل ہے۔ البتہ تیسرا حال جس میں ایک نے اپنے دعوے پر شہادت شرعیہ قائم کردی اور دوسرا نہ کرسکا۔ اس میں ایسے لوگوں کو نزاع کا موقع ہاتھ آئے گا جو شخص واحد کے وجود کو بیک وقت دو جگہ پائے جانے کو ناممکن اور محال کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ کہنا محض ایک توہم ہے۔ اس لئے کہ ائمہ اعلام نے تصریح کی ہے کہ یہ جائز اور ممکن ہے۔ لہٰذا جب شخص واحد کے وجود کا بیک وقت ایک سے زیادہ مقامات میں پایا جانا ازروئے تصریحات ائمہ اعلام جائز و ممکن ہو تو ان دونوں میں سے جو اقامۃ بینہ نہ کرسکا۔ اپنی قسم میں کیونکر جھوٹا قرار دیا جاسکتا ہے اور محض شک کی بناء پر اس کی عورت کس طرح مطلقہ ہوسکتی ہے؟ اور یہ ایسا امر ہے جس کے اثبات کی حاجت نہیں۔ امر محلوف علیہ کا صرف امکان ثابت ہوجانا کافی ہے اور وہ تصریح ائمہ سے ثابت ہے۔ یہ ایسا سوال ہے جو قدیم زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور علماء نے اس میں عدم حنث کا وہی فتویٰ دیا جو میں نے دیا ہے۔

اور علماء نے جو اپنے اس قول میں ایک شخص کے بیک وقت بہت سے مقامات پر پائے جانے کے امکان کی طرف استناد کیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس امکان پہ جن ائمہ اعلام نے تصریح فرمائی ہے ان میں علامہ علاؤ الدین قونوی شارح

حاوی ہیں اور شیخ تاج الدین سبکی اور کریم الدین مکی اور شیخ الخانقاہ الصلاحیہ سعید السعداء اور صفی الدین بن ابی المنصور اور عبدالغفار بن نوح القوصی صاحب الوحید اور عفیف الیافعی اور شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ اور سراج بن الملقن اور برہان الابناسی اور شیخ عبداللہ المتوفی اور ان کے شاگرد شیخ خلیل المالکی صاحب المختصر اور ابوالفضل محمد بن ابراہیم التلمسانی المالکی اور ان کے علاوہ بہت سے بندگانِ خدا ہیں جنہوں نے تصریح فرمائی ہے کہ ایک شخص کا بیک وقت کئی جگہ پایا جانا ممکن ہے۔

(الحاوی للفتاوی جلد اول ص ۲۱۷ للامام الجلال الدین السیوطی

(ماہنامہ ''السعید'' ملتان ماہ مارچ، اپریل ۱۹۶۱ء، جلد ۲ / ۳، شمارہ ۱۲، ص ۱۳ / ۱۱)

خطبہ استقبالیہ

(کل پاکستان سنی کانفرنس ۱۹۷۸ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی

ابتدائیہ

صدرِ محترم! حضرات علمائے کرام ومشائخ عظام اور جملہ حاضرین کرام و برادرانِ اہل سنّت، السلام علیکم ورحمۃ اللہ! اِس عظیم الشان تاریخ ساز آل پاکستان سُنّی کانفرنس میں آپ کی شرکت اور تشریف آوری پر نہایت ادب واحترام کے ساتھ میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور کمال فرحت ومسرت کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ حضرات نے اِس بے مثال سُنّی کانفرنس کے ساتھ جو تعاون فرمایا اور اپنی تشریف آوری سے اس کانفرنس کی رونق بڑھائی، میں اِس پر آپ کا تہِ دِل سے ممنون ومتشکر ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ یہ کانفرنس اِس پُرآشوب دور میں اِسلام کی سر بلندی، مسلک اہلسنّت کے تحفظ، پاکستان کے استحکام اور نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے سنگ میل ثابت ہو۔ اٰمین۔ اِس نازک دور میں کمیونزم اور سوشلزم جیسے لا دینی فتنوں کا سیلاب اُمنڈتا چلا آ رہا ہے، نیز جماعت اہلسنّت اور مسلک اہلسنّت کے خلاف خوفناک سازشیں کی جارہی ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف بھی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ سارے ملک کے سُنّی حضرات اپنے اسلاف کی سابقہ روایات کے مطابق اپنے دِین ومذہب اور ملک وملت کے تحفظ وسلامتی اور نظامِ

مصطفےٰ کی ترویج کے لیے پوری طرح منظم اور مستحکم ہو کر اِن تمام فتنوں کو ناکام بنا دیں۔

بزرگانِ محترم! کل پاکستان کے سنّیوں کی یہ عظیم اور تاریخی کانفرنس صرف مذہبی بنیادوں پر منعقد ہو رہی ہے۔ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں نہ اس کی بنیاد فرقہ واریت پر ہے۔ آپ سب حضرات کسی گروہی تعصب یا سیاسی غرض کو لے کر نہیں آئے بلکہ آپ سب حضرات محض سنّی ہونے کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ جماعت اہلسنّت جس کے پلیٹ فارم پر یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، خالصتاً مذہبی جماعت ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد اور منشور کا خلاصہ صرف اِسلام کی سربلندی، مسلک اہلسنّت کا تحفظ اور مذہبی بنیادوں پر سنّیوں کی تنظیم و تبلیغ ہے۔

نظریہ پاکستان کی حفاظت اور پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کی جدو جہد اور اِسی بنیاد پر پاکستان کا استحکام جماعت اہلسنّت کا نصب العین ہے۔ اِس ضمن میں اِسلام اور نظامِ مصطفےٰ، سنّت و جماعت کا مفہوم، اہلسنّت کا تشخص اور نظریہ پاکستان اور اس کے استحکام کے عنوانات پر مجھے کچھ عرض کرنا ہے:

اِسلام اور نظامِ مصطفےٰ

اِسلام دِینِ فطرت ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (اللہ تعالیٰ کے دِین کو لازم پکڑو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اس کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ (الحدیث)۔ (ہر بچہ فطرت یعنی دین اِسلام پر پیدا ہوتا ہے اُس کے ماں باپ اُسے یہودی بنا لیں یا نصرانی یا مجوسی بنا لیں)۔

دین فطرت ہی انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے۔ انسانی فطرت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلقت و جبلت کے جس بنیادی نقطے پر پیدا کیا ہے اُس نقطے سے انحراف نہ پایا جائے۔ مثلاً بہیمیت یا سبعیت (حیوانیت یا درندگی) اُس پر غالب نہ ہو یعنی انسانی فطرتِ سلیم پر قائم ہو، ایسی صورت میں انسان کی فطرت سلیمہ جس چیز کو پسند کرے گی یقیناً وہی چیز ہوگی جو اِسلام میں پسندیدہ ہے۔

بنی نوعِ انسان میں جتنے افراد سلیم الفطرت پیدا ہوئے بلا تخصیص سب نے اسلام کی پسندیدہ چیزوں کو پسند کیا اور جن چیزوں کو اسلام نے ناپسندیدہ قرار دیا اُن سب نے اُن تمام چیزوں کو قبیح اور ناپسندیدہ مانا۔

اسلام کے پیش کردہ نظام سے اگر کسی شخص نے کسی وقت روگردانی کی، خواہ وہ روگردانی کرنے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلامی نظام میں کوئی خرابی تھی یا وہ قابل عمل نہ تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسلامی نظام سے رُوگردانی کرنے والوں کی فطرتِ سلیمہ پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہو چکا تھا اِس لئے وہ اس پر عمل کرنے سے منحرف اور گریزاں رہے۔

ادنیٰ شعور رکھنے والا شخص بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی وقت عام طور پر لوگ نیکی کرنا چھوڑ دیں اور جان بوجھ کر برائی اختیار کرلیں جیسا کہ صدیوں سے لوگ ایسا کرتے چلے آرہے ہیں، خصوصاً موجودہ دور میں ایسا ہی ہو رہا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نیکی قابل عمل نہیں رہی۔ لوگوں نے سچ بولنا چھوڑ دیا تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سچ قابل عمل نہیں رہا بلکہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خود لوگوں میں ایسی خرابی پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے نیکی اور سچائی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اگر کوئی معدہ صالح غذا ہضم نہ کرسکے تو یہ غذا کی خرابی نہیں بلکہ خود معدہ کی خرابی ہے۔ نیکی اور اچھائی سے روگردانی اِس امر کی دلیل نہیں کہ نیکی اور اچھائی قابل عمل

نہیں رہی بلکہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ لوگ اس فطرتِ سلیمہ پر قائم نہیں رہے جو ان کی حقیقت کا بنیادی نقطہ تھا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ فطرت کی خلاف ورزی خلق اللہ کی تبدیلی نہیں بلکہ اصل فطرت کے موجود ہوتے ہوئے اس فطرت سے انحراف اور کجروی ہے۔

دین اسلام کا اصل مفاد ہی یہ ہے کہ اسے قبول کر کے انسان اپنی فطرتِ سلیمہ پر قائم رہے اور کسی حال میں اس سے منحرف نہ ہو۔ اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تنبیہ نازل فرمائی۔

اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بھی غیر اسلامی نظاموں کی طرف مائل ہیں۔ کاش وہ "دین قیم" کے معنی کو سمجھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کے تقاضوں کی تکمیل کا ضامن یہی دین اسلام ہے جسے "دین قیم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسانوں کے جو افراد اللہ تعالیٰ کے نبی پر ایمان لائے اور انہوں نے دین اسلام کو قبول کیا وہ غیر مسلم افرادِ انسانی سے صرف دین اسلام کی بنیاد پر ممتاز ہو گئے جس طرح انسان، ناطق کی خصوصیت کی بنا پر غیر ناطق حیوان سے ممتاز ہو کر جنس حیوان کے تحت مستقل نوع کی حیثیت اختیار کر گیا بالکل اسی طرح مسلمان، خصوصیتِ اسلام کی وجہ سے غیر مسلم انسانوں سے ممتاز ہو کر گویا جنس انسان کے تحت مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک مستقل نوع قرار پا گیا۔ یوں کہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے انسان کو بمنزلہ جنس اور مسلمان و کافر اور منافق کو اس کے تحت تین انواع قرار دے دیا۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ہر نوع کے اسبابِ بقا اور ضروریاتِ زندگی اس کے حسب حال ہوتے ہیں۔ مچھلیاں اور پرندے دونوں جنس حیوان کی الگ الگ نوع ہیں۔ پرندوں کا پانی میں اور مچھلیوں کا پرندوں کے آشیانوں میں ہونا ان کے حسب حال

نہیں، بالکل اسی طرح مسلمانوں کا غیر اسلامی نظام کے تحت ہونا ان کے طبعی تقاضے کے خلاف ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ایسی صورت میں غیر مسلمان کا اسلامی نظام کے تحت ہونا اس کے طبعی تقاضے کے منافی قرار پائے گا تو یہ شبہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ انسان مسلم ہو یا غیر مسلم، بحیثیت انسان ہونے کے اس کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا عین تقاضائے اِسلام ہے اور ظاہر ہے کہ کفر ونفاق کی بنیاد فطرتِ سلیمہ سے انحراف کے سوا کچھ نہیں اور یہ انحراف غیر طبعی ہے۔ معلوم ہوا کہ غیر مسلم کا اِسلام کو اپنی طبیعت کے ناموافق سمجھنا فطرتِ سلیمہ سے انحراف کی بنا پر ہے ورنہ اس میں شک نہیں کہ یہی نظام اس کی اصل فطرت کے عین مطابق اور حسبِ حال ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کے لیے اسلام امن و عافیت کا حقیقی ضامن ہے۔ اسلام نے عام ہندو، سکھ اور عیسائی جیسی غیر مسلم اقلیتوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی مستحکم ضمانت دی اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی حکومتوں کے ادوار میں غیر مسلموں کو وہ شاندار حقوق و مراعات دیئے گئے جن کی مثال کسی غیر اسلامی حکومت میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسلام ہی بنی نوعِ انسان کے لیے امن و عافیت اور رحمت و رافت کا گہوارہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مومن و کافر کے اسی نوعی اختلاف کی بنا پر دونوں کا قانونِ حیات مختلف ہو گیا۔ حلال و طیب چیزیں مومن کے حصے میں آئیں اور خبیث و ناپاک چیزیں کافر کے لیے رہ گئیں۔ مومن کی غذا حلال اور کافر کی غذا حرام۔ مسلمان کی طبیعت کا مقتضاء طیبات ہیں اور کافر کی طبیعت کا تقاضا خبیثات۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط (اے ایمان والو! ہم نے جو پاک رزق تمہیں دیا اس سے کھاؤ)۔ نیز سورۂ نور میں فرمایا: اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ط (خبیث

چیزیں خبیث لوگوں کے لیے ہیں اور پاک چیزیں پاک لوگوں کے لیے)۔ دُوسری جگہ سورۂ اعراف میں فرمایا: وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ط (اللہ تعالیٰ کے رسول ایمان والوں کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں)۔ شراب، خنزیر، سود، رشوت اور ہر قسم کی نجس و حرام اشیاء کو غیر مسلم شوق سے استعمال کرتا ہے لیکن مسلمان ان کے قریب جانا پسند نہیں کرتا۔ جس طرح بکری بھیڑیئے کی غذا قبول نہیں کرتی اسی طرح مومن کافر کی غذا کو پسند نہیں کرتا کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایسا ہی فرق ہے جیسا بکری اور بھیڑیئے کے درمیان ہے۔ ان میں سے ہر ایک مختلف النوع ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ مسلمان کا حال غیر مسلم سے مختلف ہے۔ اس لیے کوئی مسلمان غیر اسلامی قانون کے تحت اسلامی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اصل فطرت انسانی کے تقاضوں کی تکمیل صرف اسلامی نظام کے تحت ہوسکتی ہے جس کا نام "نظامِ مصطفےٰ" ہے۔

نظامِ مصطفےٰ کی جامعیت

واضح رہے کہ چند اعمال و عبادات ہی کا نام "نظامِ مصطفےٰ" نہیں بلکہ یہ ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو پیدائش سے موت تک اور مہد سے لحد تک انسان کو پیش آنے والے ہر مرحلے پر حاوی ہے۔ عقائد و اعمال، عبادات و معاملات، اخلاق و آداب سب کو شامل ہے۔ معاشیات و اقتصادیات، حدود و قصاص، تعزیرات، عدل و مساوات، قوانین و احکام سب کچھ نظامِ مصطفےٰ میں احسن و اکمل طریق پر موجود ہیں اور وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا منبع کتاب و سنت ہے اور اس کی تفصیلات سنتِ خلفائے راشدین و سلفِ صالحین اور ائمہ مجتہدین کی فقہ واجتہادات اور تعامل مومنین میں محفوظ ہیں۔ سورۂ نساء میں باری تعالیٰ عزاسمہٗ کا ارشاد ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي

الْاَمْرِ مِنْكُمْ ط (اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور اہل ایمان میں سے اولوا الامر کی)۔ مسند احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں وارد ہے: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ (الحدیث)۔ (تم اپنے اوپر میری سنّت اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنّت کو لازم پکڑو)۔ آیۂ کریمہ میں "اولوا الامر" سے مراد بھی خلفائے راشدین اور سلف صالحین ائمہ مجتہدین ہیں۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ سورۂ نساء میں فرمایا: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ط (جس نے ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول سے اختلاف کیا اور مومنین کے علاوہ کسی دوسرے کے راستے کی اتباع کی ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا اور اسے جہنم میں پہنچا دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)۔ اس آیت کریمہ میں اتباعِ رسول کے ساتھ مومنین کی راہ پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ترمذی کی حدیث میں وارد ہے: انّ اللہ لا یجمع امّتی علی ضلالۃ۔ (بے شک اللہ تعالیٰ میری اُمت کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا)۔ نیز ابن ماجہ کی حدیث میں وارد ہے: اتبعوا السواد الاعظم۔ (تم لازم پکڑو اپنے اُوپر سوادِ اعظم یعنی بڑی جماعت کو)۔

اِن آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نظامِ مصطفیٰ کا اصل منبع اور اس کی تفصیلات کا سرچشمہ کتاب وسنّت، خلافت راشدہ، ائمہ سلف، تعامل مومنین اور اجماعِ اُمت ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ اسلامی ضابطہ حیات کا کوئی پہلو ان سے باہر نہیں۔

عدلیہ

قرآن مجید کی سورۂ مائدہ میں ہے: اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (تم عدل کرو،

عدل تقویٰ سے بہت قریب ہے)۔ یہ آیت کریمہ عدل و انصاف کی روشن شمع ہے اور سنت و اجماع اور قیاس ائمہ مجتہدین اس کی تفصیلات سے پُر ہیں۔

ظلم

عدل کے برعکس ظلم ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں فرمایا: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (ظلم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے)۔ اور حدیث شریف میں ہے: الظلم ظلمات یوم القیامة۔ متفق علیہ۔ (قیامت کے دن ایک ظلم کے کئی ظلمات ہوں گے)۔

انتظامیہ

انتظامی اُمور کی نگہداشت کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران میں فرمایا: تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)۔ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے: من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ (الحدیث)۔ (تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے اُسے چاہیے کہ اُسے ہاتھ سے روک دے)۔

۱۔ **حدود**... اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی جرم پر مقرر کی ہوئی سزا کو "حد" کہتے ہیں۔ جیسے سورۂ مائدہ میں ہے: فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹے جائیں)۔ اور سورۂ نور میں ہے: فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)۔

۲۔ **قصاص**... جان، عضو یا زخموں کے بدلے کو قصاص کہتے ہیں۔ مثلاً جان کے بدلے جان، عضو کے بدلے عضو اور زخموں کے بدلے زخم۔ قرآن کریم کی سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ط (تمہارے لیے قصاص میں حیات ہے اے عقل والو!)

نوٹ: حدود و قصاص سے متعلق بے شمار احادیث وارد ہیں جو اہلِ علم حضرات سے مخفی نہیں۔

۳۔ **تعزیرات**... حد سے کم درجے کی سزا کو "تعزیر" کہتے ہیں۔ ہر وہ جرم جس پر مقررہ سزا شرع میں وارد نہیں مُوجب تعزیر ہے۔ مثلاً زنا موجب للحد کے علاوہ فحش کے ارتکاب پر جو سزا دی جائے گی وہ تعزیر ہوگی۔ علماء نے تعزیر کی دلیل میں سورۂ نساء کی اِس آیت کو پیش کیا: وَالَّذٰنِ یَأْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ط (اور تم میں سے دو مرد جو (آپس میں) فحش کے مرتکب ہوں تو انہیں تکلیف پہنچاؤ)۔ یہ تکلیف پہنچانا تعزیر ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حکم تعزیر کے بغیر ممکن نہیں۔ اِسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، صحیح مسلم میں ہے: من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ (الحدیث)۔ (تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے اُسے چاہیے کہ اُس برائی کو اپنے ہاتھ سے روکے)۔ اِس حدیث سے بھی حکمِ تعزیر پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض علماء نے اجماع کو دلیل تعزیر قرار دیا۔

اِسلامی حدود اور تعزیرات کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس مہذب دور میں رجم اور کوڑوں جیسی شدید سزائیں نہایت غیر مناسب بلکہ ناقابلِ عمل ہیں۔ نیز یہ کہ اِس دور میں جرائم کی اِتنی کثرت ہے کہ اقامتِ حدود ممکن نہیں۔ لاکھوں اِنسانوں کے ہاتھ کاٹنے پڑیں گے اور لاکھوں افراد کو رجم کرنا پڑے گا جو ناقابلِ عمل ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ جس دور میں جرائم کی اِس قدر کثرت ہو اُسے مہذب کہنا کہاں کی تہذیب ہے؟ پھر یہ کہ سزا ہمیشہ جرم کے مطابق ہوتی ہے۔ جن جرائم پر اِسلام نے شدید سزاؤں کا حکم دیا ہے آپ یہ دیکھیں کہ وہ جرائم کتنے شدید ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے شدید جرائم کے ثبوت کے لیے اِسلام نے جو معیارِ شہادت رکھا ہے اور ان سزاؤں

کے لیے جو کڑی شرائط مقرر فرمائی ہیں ان کے پیشِ نظر ان سزاؤں کے ناقابل عمل ہونے کا تصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔

لوگوں کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ لاکھوں کے ہاتھ کاٹنے پڑیں گے اور لاکھوں کو رجم کرنا پڑے گا۔

میں عرض کروں گا کہ اگر نظامِ مصطفیٰ رائج کر کے اُس کے مطابق چند مجرموں کو یہ سزائیں مل جائیں تو جرائم کا انسداد ہو جائے گا۔ سعودی عرب میں اسلامی سزائیں نافذ ہیں۔ وہاں کا حال سب کو معلوم ہے۔ اِس قسم کے جرائم کا صدور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

حقوقِ نسواں

جاہلیت کے دور میں عورت کی جو تذلیل کی جاتی تھی اور جس قدر مظالم کا تختہ مشق عورتوں کو بنایا جاتا تھا اِسلام نے اس تذلیل اور جملہ مظالم سے عورتوں کو نجات دِلائی، اُن کے حقوق مقرر فرمائے، اُن پر مظالم اور زیادتیوں کو روکا اور اُنہیں عوت کا مقام عطا فرما کر اُن کے ساتھ بہترین معاشرت اور حُسنِ سلوک کا حکم دِیا۔ سورۂ نساء میں فرمایا:
وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط یعنی عورتوں کے ساتھ حُسنِ معاشرت اور بہترین سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ ماں کا اَدب، بہن سے شفقت، بیوی سے حُسنِ سلوک قرآن مجید کی تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی۔ خیر کم خیر کم لاهله۔ فرما کر عورتوں کے ساتھ نیکی، بھلائی اور احسان کی تلقین فرمائی۔ یہ حدیث ترمذی، نسائی و ابن ماجہ میں ہے۔ یعنی تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ بہترین سلوک کرنے والا ہو۔ آج کے دَور میں عام طور پر عورتوں کی جو حق تلفی ہو رہی ہے کہ اُنہیں میراث کے حقوق سے بھی محروم کر دِیا جاتا ہے اور ازدواجی زندگی میں بھی وہ ظلم وستم کا نشانہ بنی رہتی ہیں، معاشرے میں اُنہیں عوت کا کوئی مقام نہیں دِیا جاتا اور اُن کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دِیا جاتا ہے، نظامِ مصطفیٰ کے بغیر اُن کی حق رسی اور مظالم سے نجات ناممکن ہے۔

معاشیات

قرآن کریم کی اصطلاح میں "معاش" سے مراد روزگار اور اسبابِ زندگی ہیں۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ؕ (بے شک ہم نے تمہیں زمین پر جگہ دی اور ہم نے تمہارے لیے اس میں زندگی کے اسباب بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو)۔

چونکہ معاش اور روزگار کے بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبے سے متعلق بکثرت احادیث وارد ہیں۔ ہر طریق معاش کے لیے کتاب و سنّت و دیگر ادلّہ شرعیہ میں بے شمار احکام موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے: اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سُود کو حرام فرمایا)۔ سُود کی مذمّت میں قرآن و حدیث کی اتنی نصوص ہیں کہ ان کی تفصیلات کو اس مختصر وقت میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک بدترین قسم کی لعنت ہے اور بے شمار برائیوں کی بنیاد، سُودی نظام کو ختم کیے بغیر ہمارے معاشی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اقتصادیات

کتاب و سنّت کی روشنی میں "اقتصادیات" سے ہماری مراد مالیات میں میانہ روی ہے۔ اگرچہ اعتدال پسندی اور میانہ روی مالیات کے علاوہ دیگر اُمور میں بھی مطلوب عند الشرع ہے لیکن مالیات میں اس اعتدال اور میانہ روی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مال کو روک لینا جسے ارتکازِ دولت سے تعبیر کیا جاتا ہے، شرعاً سخت مذموم ہے۔ اسی طرح اسے بیجا خرچ کرنا یا ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا بھی سخت گناہ ہے۔ اسی کے متعلق سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ؕ (اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ)۔ اور میانہ روی کے متعلق تعلیم دیتے ہوئے سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا

تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ؕ (اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اُسے پورا کھول دے کہ تُو بیٹھ رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہوا)۔ یعنی مال کا روکنا اور اُسے بلا امتیاز جا بجا صرف کرنا دونوں ممنوع ہیں۔

جس مال سے زکوٰۃ اور متعلقہ حقوق ادا نہ کیے جائیں، اصطلاحِ شرح میں وہ کنز ہے۔ دیکھیے مجمع بحار الانوار جلد: ۳، ص: ۲۳۰۔ اسی کنز کو آج کل معاشی اصطلاح کے طور پر لفظ "سرمایہ" سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح زکوٰۃ ادا کرنے اور متعلقہ حقوق کی ادائیگی کے بعد وہ مال کنز نہیں رہتا اِسی طرح جس مال سے زکوٰۃ اور حقوقِ متعلقہ ادا کر دیئے جائیں وہ "سرمایہ" کی تعریف میں نہیں آتا۔ بشرطیکہ اُسے جائز طور پر حاصل کیا گیا ہو ورنہ وہ مالِ حرام، مالک کے لیے وبالِ عظیم اور عذابِ الیم کا مُوجب ہے۔

اِس دور میں اکثر بڑے بڑے امیروں اور مال داروں کے اموال سے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد متعلق ہیں اگر نظامِ مصطفےٰ کے تحت اِن حقوق کی ادائیگی ان اموال سے کر دی جائے تو کنز و سرمایہ کا وجود ہی ملک میں باقی نہ رہے اور اموالِ حرام کی کثرت کے باعث ملک میں جس قدر جرائم اور معصیت کا دور دورہ ہے پاکستان اس سے پاک ہو جائے۔

دراصل دولت اور اسبابِ معیشت کا حصول اِتنا مشکل نہیں جتنا کہ اِن کی ہمواری اور موزونیت کا قائم رکھنا مشکل ہے۔ دولت کی ناہمواری ہمیشہ اقتصادی اور معاشی نظام کی خرابی کا مُوجب رہی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں فرمایا: كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ (تاکہ وہ اموال، مال داروں کے درمیان گردش نہ کرتے رہیں)۔ اس آیت نے دولت کی ناموزوں تقسیم کو روکا ہے۔ غریب کا غریب تر ہونا اور امیر کا امیر تر ہو جانا اِسی غیر مناسب تقسیم دولت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ازالہ

اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ امیر و غریب سب کے لیے حصولِ دولت کے ذرائع ہر ایک کے حسبِ حال مساوی طور پر مہیا کیے جائیں۔ قرآنِ مجید کی آیت منقولہ بالا کی روشنی میں "نظامِ مصطفےٰ" اقتصاد و معاش میں اسی ہمواری اور موزونیت کا داعی ہے۔

سوشلزم اور مساوات

سب جانتے ہیں کہ "سوشلزم"، "کمیونزم" ہی کی ایک شاخ ہے جس کی بنیاد خدا کی ہستی کا انکار ہے۔ اس میں شخصی ملکیت بھی منفی ہے۔ یہ دونوں نظریئے اسلام کی نفی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگوں نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح ایجاد کرلی۔

"اسلامی سوشلزم" کی ترکیب بالکل ایسی ہے جیسے "اسلامی شراب خانہ"۔ مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے ان لوگوں کا بنیادی سہارا قرآن مجید کی ایک آیت اور حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا زُہد ہے۔ آیتِ قرآنیہ سورۂ بقرہ میں ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ۔ (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجیے کہ "عفو")۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ "عفو" کے معنی ہیں وہ چیز جو انسانی حاجت سے زیادہ ہو۔ اس بنا پر وہ آیت کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ضرورت سے زائد انسان کے پاس جو کچھ ہو وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا فرض ہے۔

میں عرض کروں گا کہ منکرین خدا کو راہِ خدا کا نام لینا زیب نہیں دیتا پھر یہ کہ لفظ "عفو"، "مجہد" کی نقیض ہے۔ جہد کے معنی مشقت کے ہیں اسی لیے جس نرم زمین کو چلنے کے لیے تیار کیا جائے لغت میں اُسے "عفو" کہتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ خرچ کرنا تمہارے لیے سہل اور آسان ہو وہ اللہ کے لیے خرچ کرو۔

ضرورت سے زائد چیز کا خرچ کرنا چونکہ ہر شخص کے لیے آسان ہے، اس لیے

اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔ جن علماء نے "عفو" کا ترجمہ "ما فضل عن الحاجة" کیا یعنی "ضرورت سے زائد" ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ جس مال کی اِنسان کو ضرورت ہو اُس کے خرچ کرنے میں اُسے تکلیف اور مشقت ہوتی ہے اور جو ضرورت سے زائد ہو اُس کا خرچ کرنا آسان ہوتا ہے۔ اِس سے یہ بات ظاہر ہے کہ "سہولت" اور "زیادة عن الحاجة" میں کوئی فرق نہیں۔ دراصل اس آیتِ کریمہ کا مفاد یہ ہے کہ جس مال کے تم خود محتاج ہو اگر اُسے خرچ کرو گے تو خود محتاج ہو کر دُوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے لہٰذا ایسا نہ کرو۔ حدیث شریف میں اِسی کی تائید وارد ہے۔ بخاری شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الصدقة عن ظهر غنى" صدقہ ایسی چیز کا ہو جو ضرورت سے زائد ہے۔ کیونکہ اسی میں اِنسان کے لیے سہولت ہے۔ یہ کہیں نہیں فرمایا کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب خرچ کر دو اِسی لیے قرآن میں لفظ "عفو" ہے۔ "کل العفو" نہیں۔

ہاں غلبہ زُہد کی وجہ سے اگر کوئی زاہد مومن ضرورت سے زائد کُل مال بلکہ اپنی ضرورت کو بھی پس پشت ڈال کر سارا مال راہِ خدا میں قربان کر دے تو یقیناً موجب فضیلت ہے بشرطیکہ ایسا کرنے والا خود محتاج ہونے کی وجہ سے دُوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں اہل بیتِ نبوت اور مہاجرین و انصار کی تعریف میں فرمایا: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط یعنی وہ اپنی جانوں پر دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اُنہیں شدید محتاجی ہو)۔ نیز جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سارا مال پیش کر دیا تھا جس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ما ابقيت لاهلك يا ابا بكر؟ اے ابو بکر! تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ابقيت لهم الله ورسوله

حضور! میں نے اُن کے لیے صرف اللہ اور اُس کے رسول کو باقی رکھا۔ لیکن اسے فرض نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ فرض ہوتا تو جن صحابہ نے کچھ مال پیش کیا خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے آدھا مال اپنے اہل و عیال کے لیے باقی رکھا وہ سب حکم خداوندی "قل العفو" کے بموجب نافرمان اور گنہگار قرار پائیں گے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ پر بھی حرف آئے گا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں ہدایت نہ فرمائی۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

ثابت ہوا کہ مدعیانِ سوشلزم کا "قُلِ الْعَفْوَ" اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے غلبہ زُہد سے سوشلزم کو ثابت کرنا محض دھوکہ دہی اور فریب ہے۔

مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہر مستحق آدمی کو اس کے استحقاق کے مطابق اُس کا حق ادا کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی قسم کے متعدد مستحقین کی ادائیگی حقوق مساوی طور پر نہ ہو ان میں کمی بیشی اسلامی مساوات کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک شخص کے چار لڑکے ہیں، دو لڑکیاں اور دو بیویاں۔ اس شخص کی میراث میں جو حصہ لڑکوں کا ہے وہ چاروں کو برابر ملے گا اور جو حصہ لڑکیوں کا ہے وہ دونوں لڑکیوں کو مساوی طور پر دیا جائے گا اور جو حصہ بیویوں کا ہے وہ دونوں بیویوں پر برابر تقسیم ہو گا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ لڑکوں، لڑکیوں اور بیویوں میں سے ہر ایک کا حصہ برابر ہو۔ قرآن مجید کی واضح نصوص اس مساوات کے ثبوت میں موجود ہیں اور بے شمار احادیث اس مفہوم میں ناطق ہیں۔ یہ وہ مساوات ہے جو اِنسان کی عقلِ سلیم اور طبع مستقیم کا مقتضی ہے اور اسی مساوات کا داعی نظامِ مصطفےٰ ہے۔

تجارت

تجارت کے معنی ہیں اصل مال میں نفع حاصل کرنے کے لیے تصرف کرنا۔ اور بیع کے معنی قیمت والا مال دے کر قیمت لینا۔ قرآن مجید میں مسلمان تاجر کی شان میں

سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ط (سوداگری اور خرید وفروخت ان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی)۔ یعنی وہ تجارت اور بیع وشرا میں احکامِ خداوندی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں اور خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔

تجارت وبیع کے بھی کئی اقسام ہیں اور ہر قسم کے لیے قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی میں بے شمار احکام وارد ہیں۔ ان کی تفصیلات اس وقت بیان نہیں کی جا سکتیں۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دیانت وصداقت اسلامی تجارت کی رُوحِ رواں ہے۔ سنن دارمی میں ہے: التاجر الصدوق مع النبیّین (سچا تاجر قیامت کے دِن نبیوں کے ساتھ ہوگا)۔ افسوس ہے کہ اس دور میں تجارت بھی اکثر وبیشتر غیر اسلامی اُصولوں پر ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے نظامِ مصطفےٰ کے تحت لایا جائے۔

زراعت

زراعت کے معنی ہیں کھیتی باڑی کرنا اور مختلف اجناس کا غلہ اُگانا۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ط (کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل دار ہو اور کٹائی کے دِن اس کا حق ادا کرو)۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پھلوں اور کھیتی کے نعمت ہونے کا اظہار فرمایا اور شکرِ نعمت کے طور پر اس کی پیداوار سے عشر ادا کرنے کا حکم دِیا۔

زراعت کو ملکی معیشت میں جو مقام حاصل ہے محتاجِ تشریح نہیں۔ انسانی زندگی کسان کی کارکردگی کی رہینِ منت ہے۔ کسان کی حوصلہ افزائی زرعی پیداوار کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

زراعت کا شعبہ بھی بڑا وسیع ہے۔ بے شمار احکام اس کے متعلق ہیں جو کتاب و سنت، اجماعِ اُمت اور قیاس وتعامُلِ ناس سے ماخوذ ہیں اور نظامِ مصطفےٰ میں وہ بڑی

اہمیت رکھتے ہیں۔

مزدوری

بدلے پر کام کرنا مزدوری ہے۔ قرآن پاک کی سورۂ قصص میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاجزادی کا مقولہ مذکور ہے۔ اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡكَ لِیَجۡزِیَكَ اَجۡرَ مَا سَقَیۡتَ لَنَا ط (میرا باپ تمہیں بلاتا ہے کہ تمہیں ہمارے جانوروں کو پانی پلانے کی مزدوری دے)۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ مزدور کے طلب کرنے سے پہلے اُس کی مزدوری ادا کر دی جائے۔ مزدوری کا پیشہ نہایت معزز پیشہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام نے آٹھ سال مزدوری پر بکریاں چرانے کی پیش کش کی۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے کسب سے اور محنت کر کے بسر اوقات فرماتے تھے۔

قرآن مجید کی روشنی میں مزدور کو قوت، محنت اور امانتداری کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جیسا کہ سورۂ قصص میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاجزادی کا مقولہ اپنے والد ماجد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں مذکور ہے: اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ط (بے شک بہترین مزدوری کرنے والا وہ ہے جو طاقتور (محنت کش) اور امانت دار ہو)۔

آجر کو بھی مزدور کے ساتھ شفقت اور اس کی محنت کی قدر دانی کا حکم دِیا گیا ہے۔ ابن ماجہ میں حدیث ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، "مزدور کو اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کر دو۔"

آج دنیا میں ہر طبقے سے زیادہ مزدور کی تعداد پائی جاتی ہے اگر مزدور محنت و قوت اور امانتداری کے ساتھ کام نہ کریں نیز آجر کی طرف سے مزدوری کے حقوق کا تحفظ نہ ہو اور اُس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو ملک کا تمام کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

لہٰذا آجر اور اجیر دونوں کا فرض ہے کہ وہ ہدایاتِ ربانی پر عمل کریں۔

مزدوری اور اُجرت کا باب بھی بڑا وسیع ہے اور "نظامِ مصطفےٰ" اس کے بھی ہر پہلو پر حاوی ہے۔

تعلیم

اسلام نے علم کو سب سے اعلیٰ مقام دیا ہے۔ علم ہی ایمان و عمل کی بنیاد اور فضیلت کا معیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں فرمایا: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ط اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کُل اسماء کا علم دیا۔ نیز سورۂ زمر میں ارشاد فرمایا: قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے)۔ ایک اور جگہ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (آپ کہیے اے میرے رب! میرے علم کو بڑھا)۔ بے شمار احادیث بھی علم کی فضیلت میں وارد ہوئیں۔

تعلیم سے مراد انسان کو زیورِ علم سے آراستہ کرنا ہے۔ علم اگرچہ فی نفسہٖ محمود ہے مذموم نہیں لیکن اپنے متعلق کے اعتبار سے اس میں برائی کا پہلو بھی نکل آتا ہے جیسے برائی کا سکھانا برا ہے اور اچھائی کا سکھانا اچھا۔

اسلام خدا کی معرفت و محبت، تقویٰ و طہارت اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اوّلین اور آخرین اور جملہ حقائق کائنات کے علوم موجود ہیں۔ آج تک جس قدر علوم مروج ہیں سب کا منبع قرآن کریم ہے لیکن علومِ قرآن کا انداز یہ ہے کہ ہر علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس لیے معرفتِ خداوندی کے مقصد کو باقی رکھتے ہوئے ہر علم کا حصول قرآنی مقاصد کے عین مطابق ہے۔ اسلامی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے۔ لیکن انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں اس مقصد کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ایسا نصابِ تعلیم رائج کیا جس کے ذریعے خدا پرستی کی جگہ خالص مادہ پرستی کا رجحان پیدا

ہوا۔ اِسلامی اخلاق واقدار پامال ہونے لگے اور اس تعلیم کو اپنا کر مسلمان اِسلام سے دُور ہونے لگے۔ چنانچہ آج تک ہمارے تعلیمی اداروں میں وہی نصابِ تعلیم رائج ہے۔ اگر کسی وقت کچھ تبدیلی ہوئی بھی تو برائے نام۔ وہی لادینی نظریات اور ملحدانہ رجحانات پھیلتے جارہے ہیں۔ پھر ایک المیہ یہ ہے کہ برائے نام تبدیلی کرنے والوں نے "سوادِ اعظم" کو قطعی طور پر نظرانداز کر دیا۔ ان کے اسلافِ کرام کے زرّیں علمی و عملی مجاہدانہ کارناموں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کے نام تک کو صفحہ قرطاس پر لانا گوارا نہ کیا بلکہ تاریخی حقائق کو بے دردی سے مسخ کر کے جن لوگوں نے انگریزوں سے جہاد کے ناجائز ہونے کے فتوے دیئے تھے انہیں مجاہد بنا کر دِکھایا گیا اور اصل مجاہدین کا ذکر تک نہ کیا گیا۔

"نظامِ مصطفےٰ" اس تعلیم میں بنیادی تبدیلی کا داعی ہے۔ وہ ایسی تعلیم کا علمبردار ہے جس کے ذریعے ہماری نسل اسلامی رُوح سے آشنا ہو، اس کے اخلاق واعمال اسلامی سانچے میں ڈھل جائیں، خدا کی ہستی پر کامل ایمان کے ساتھ تمام اسلامی عقائد واعمال کا انہیں صحیح علم حاصل ہو، تاریخی حقائق اور اپنے اسلافِ کرام کے مجاہدانہ اور علمی و عملی کارناموں سے واقف ہوں اور اُن کے نقشِ قدم پر چل کر پاکستان اور ملت اِسلامیہ کی صحیح خدمت انجام دے سکیں۔

علماءِ سُوء

حدیث شریف میں علماءِ سُوء یعنی بدترین عالموں کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ امام بیہقی نے بروایت مولائے کائنات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم روایت کی کہ حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا، "ایسا زمانہ آئے گا جس میں ایسے عالم بھی ہوں گے جو آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے۔ اُنہی سے فتنہ نکلے گا اور اُنہی کی طرف لوٹ جائے گا۔

اس حدیث پاک کا مصداق وہی علماء ہیں جو سبیل مؤمنین اور سلفِ صالحین، ائمہ مجتہدین کے منہاج سے رُوگردانی کر کے اپنی ناقص رائے اور "نام نہاد اجتہاد" سے کام لے کر، دین میں فتنے پیدا کریں گے، دُنیا کے بدلے دِین بیچیں گے۔ ان کے ذہن میں ہر وقت اقتدار کی کنجیوں کا تصور ہوگا۔ یہی لوگ نظامِ مصطفےٰ کی راہ میں سنگِ گراں ہوں گے لیکن اگر سوادِ اعظم منظم ہو کر مستحکم ہو جائے تو یہ بھاری پتھر اُن کی طاقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ان کے تمام فتنے اُنہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔

پسندیدہ حاکم

نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کے لیے حاکم بھی ایسے ہونے چاہئیں جو اپنی پسندیدہ صفات کی بنا پر عوام میں مقبول اور پسندیدہ ہوں۔

ترمذی شریف میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان وارد ہے، "کیا میں تمہیں بہترین اور بدترین حکام کی خبر نہ دُوں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا، کیوں نہیں یارسول اللہ! ضرور ہمیں خبر دیجیے۔ فرمایا، بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ اور تم اُن کے لیے دُعا کرو، وہ تمہارے لیے دُعا کریں۔ اور بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو، وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم اُن پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔"

نظامِ مصطفےٰ کے دامن میں اُنہی حکام کے لیے گنجائش ہے جو اس حدیث پاک کی روشنی میں بہترین ہوں۔ ورنہ بدترین حکام کے لیے حدیث پاک کی روشنی میں نظامِ مصطفےٰ میں کوئی گنجائش نہیں۔

حرمت مومن

اِسلام میں مسلمان کے خون کی عظمت و حرمت، کثرتِ جرائم کے اِس دور میں بے

گناہ مسلمانوں کے قتل کی وارداتیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اِسلام نے مسلمان کے خون کو بڑا محترم قرار دِیا ہے۔ قرآن و حدیث میں قتل ناحق کی سخت مذمت اور اس پر وعید شدید وارد ہے۔ ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کو دیکھ کر فرمایا، "اے کعبہ! تو بڑی عزت و حرمت والا ہے والذی نفس محمد بیدہ لحرمۃ المؤمن اعظم عند الله حرمۃ منک۔ (قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں مجھ محمد رسول اللہ کی جان پاک ہے یقیناً مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے کہیں زیادہ ہے)۔

اسی طرح ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اُنہوں نے بھی خانہ کعبہ کو دیکھ کر یہی فرمایا کہ "اے کعبہ! بے شک اللہ کے نزدیک تیری بڑی عزت و حرمت ہے لیکن مومن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

اس دور میں مسلمان کا خون جس بے دردی سے بہایا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اُسے لالچ دے کر خودکشی پر آمادہ کیا جاتا ہے، اِسلامی احکام کی روشنی میں کس قدر گناہِ عظیم ہے۔ یہی حال مسلمان کے مال اور اُس کی عزت و آبرو کا ہے، حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک لاکھ صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا، "مسلمان پر مسلمان کا مالِ ناحق اور اُس کی ہتکِ عزت حرام اور سخت گناہ ہے۔" نظامِ مصطفیٰ کی ترویج کے بغیر مسلمان کی جان، مال، عزت و آبرو سب معرضِ خطر میں ہے۔

نظامِ مصطفیٰ کا فوری نفاذ

سوادِ اعظم اہلِ سنّت ملک میں فوری طور پر نظامِ مصطفیٰ کا نفاذ چاہتی ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ نظامِ مصطفیٰ کا فوری نفاذ ممکن نہیں، قطعاً غلط اور نظامِ مصطفیٰ کے خلاف نفرت پھیلانا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فوری نفاذ میں کوئی

دشواری نہیں۔

اس مسئلہ میں یہ سمجھنا کہ مسلمان نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں لہٰذا صلوٰۃ و زکوٰۃ کا نظام نافذ ہے، صحیح نہیں کیونکہ نفاذ کے معنیٰ یہ نہیں کہ جس کا دِل چاہے خود بخود نماز پڑھ لے اور زکوٰۃ ادا کردے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ تارکِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے لیے سزا مقرر کر دی جائے اور بلا اِمتیاز ہر ایک کے لیے یہ قانون نافذ ہو۔ اسی طرح حکومت کی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کے کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے روکنے کا محکمہ قائم کر دیا جائے اور اس کی تعمیل نہ کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس راہ میں کوئی رُکاوٹ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج میں فرمایا:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ؕ (وہ لوگ کہ اگر ہم اُنہیں زمین میں قوت و سلطنت عطا فرمائیں تو وہ نماز برپا رکھیں اور زکوٰۃ دیں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور اللہ ہی کے لیے سب کاموں کا انجام ہے)۔

اس حکم قرآنی میں صاحب قوت نافذہ کے لیے جس خوبی کے ساتھ دین برپا کرنے کا حکم دِیا گیا ہے، ہر مسلمان کے سامنے ہے۔ جو لوگ زمامِ اقتدار ہاتھ میں لے کر نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ میں تساہل کریں گے اُنہیں قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کی یہ وعیدیں سامنے رکھنی چاہئیں: وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ؕ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازِل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔

میں سوادِ اعظم اہلِ سنت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلد سے جلد نظامِ مصطفیٰ

کے نفاذ کے لیے میدانِ عمل میں آجائیں۔

واضح رہے کہ نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کی صورت میں فقہ حنفی کو اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ پاکستان کے رہنے والے جمہور مسلمان حنفی المذہب ہیں۔ نیز حنفی فقہ اپنی وُسعت اور جامعیت کے لحاظ سے ہر طبقے کے اِنسانوں کی تمام ملکی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوئی ہے۔ انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ہندوستان میں یہی فقہ حنفی رائج رہی۔ ماضی میں بھی اِسلامی سلطنتیں فقہ حنفی کی پابند رہیں۔ خاندانِ سلجوق، سلاطین ترکی، محمود غزنوی، نورالدین زنگی، سب فقہ حنفی اور اس کے قانون کے پابند تھے۔ خلافت عباسیہ کے مایہ نورِ چشم و چراغ خلیفہ ہارون الرشید کی وسیع سلطنت بھی حنفی اُصول پر قائم تھی۔ اس عالمگیر حدودِ مملکت میں فقہ حنفی کے امامِ ثانی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ عدلیہ کے چیف جسٹس رہے۔

پاکستان کے ملکی قانون میں فقہ حنفی کی قید لگنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن مجید کی غلط تشریح کر کے الحاد اور بد مذہبی کو ملکی قانون میں شامل کرنے کا راستہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ پاکستان میں رہنے والے غیر حنفی فرقوں کے مذہبی معاملات کیونکر طے ہوں گے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر حنفی حضرات جن مسائل میں فقہ حنفی سے اختلاف رکھتے ہیں ان تمام مسائل و معاملات میں انہی کے مذہب کے قاضی مقرر کیے جا سکتے ہیں جو ان مخصوص مسائل و معاملات میں اپنی اپنی فقہ کے مطابق پیش آمدہ مقدمات کا فیصلہ کریں لیکن ملکی قانون وہی ہونا چاہیے جو ملک کے جمہور مسلمانوں اور سوادِ اعظم کا مسلک ہے۔

سنّت کا مفہوم

لفظ "سنّت" کی تشریح میں علماء محدثین و فقہاء کرام اور علماء اصولیین نے جو مخصوص

اصطلاحات مقرر فرمائی ہیں، اپنے اپنے مقام پر وہ سب درست ہیں۔ "لکلٍّ ان یصطلح بماشاء"۔ لیکن سلف صالحین نے لفظ "سنّت" کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ سب کو شامل ہے۔ علامہ حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ "جامع العلوم والحکم" میں فرماتے ہیں، "سنت کے معنی ہیں، الطریق المسلوك۔ جس سے مراد وہ راستہ ہے جو دین پر چلنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔"

سنّت بدعت کا مقابل ہے۔ جیسا کہ حدیث مرفوع سے ثابت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، "لوگوں نے کوئی بدعت پیدا نہیں کی مگر اس کی مثل سنّت اٹھالی گئی۔" سنّت کے ساتھ بدعت کا جمع نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ سنّت بدعت کی ضد ہے۔ "الاشیاء تعرف باضدادها" چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ لہٰذا بدعت کی وضاحت سے سنّت کے معنی اچھی طرح واضح ہو جائیں گے۔ بدعت وہ ہے جس کی اصل شریعت میں نہ ہو۔ معلوم ہوا جس چیز کی اصل شریعت میں پائی جائے وہ سنّت ہے اور اس کے مفہوم میں وہ سب امور شامل ہیں جو شرع میں ثابت الاصل ہیں خواہ ان کی ہیئت کذائیہ خیر القرون میں نہ پائی جائے۔ جیسے تراویح باجماعت کا التزام، تراویح میں ختم قرآن وغیرہ۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی اور اپنے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنّت کو دین میں چلنے کا راستہ قرار دیا اور فرمایا: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ۔ اس لیے وہ طریق مسلوک ان سب امور کو شامل ہوگا جو حضور علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے خلفاء راشدین کے اعتقادات و اعمال اور اقوال سے ثابت ہوں۔ سلف صالحین قدیم زمانے سے اسی معنیٰ پر لفظ "سنّت" کا اطلاق کرتے تھے۔ اھ

(ملخص از: جامع العلوم والحکم)۔

اس بیان سے "سنّت" کے معنی اچھی طرح واضح ہو گئے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اعتقادات اور اعمال واقوال سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ سب "سنّت" ہے۔

جماعت کا مفہوم

سنّت کے بعد لفظ "جماعت" کا مفہوم بھی سمجھ لیجیے:۔

امام کی قیادت میں منظم مسلم قوم جماعت ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے: "ید اللہ علی الجماعۃ۔" اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ ابو داؤد و ترمذی کی حدیث مرفوع: "ما انا علیہ واصحابی۔" بھی سنّت و جماعت کے مفہوم کو شامل ہے۔ لفظ "ما انا علیہ" سنّت اور لفظ "واصحابی" سے جماعت کے معنیٰ مفہوم ہوتے ہیں۔ اور آیتِ کریمہ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ط کی روشنی میں تابعین بھی "جماعت" کے معنیٰ میں شامل ہیں۔

اسی بنا پر علمائے اُمت کی اصطلاح میں گروہِ صحابہ و تابعین کو "جماعت" کہتے ہیں۔ نبراس شرح شرح العقائد وغیرہ کتب عقائد میں اس کی تصریح موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ و خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے مقدس دامن سے وابستہ ہو کر ان کے اعتقادات، اعمال واقوال سے تمسک کرنے والے اور اُن سے ثابت شدہ اُمور کو "سنّت" ماننے والے مسلمان "اہلسنّت و جماعت" ہیں۔ یہ مقدس گروہ عہدِ رسالت سے لے کر آج تک "سوادِ اعظم" کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے جس کے ثبوت میں بے شمار احادیث وارد ہیں۔ البتہ بطورِ امتیاز یہ لقب (اہلسنّت و جماعت) حضرت امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ۳۰۰ھ سے شروع ہوا۔

تشخص اہلِ سنّت

اس تحقیق کے بعد میں عرض کروں گا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین کے عقائد و اعمال اور اقوال کا منبع قرآن و حدیث ہے۔ توحید و رسالت اور

جملہ ضروریاتِ دِین پر مشتمل عقائد سب قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ اِسلامی افعال و اعمال اور اسی طرح اِن مقدسین کے جملہ دِینی اقوال سب قرآن وحدیث ہی سے مستنبط ہیں۔

اعمال واقوال تو اُمورِ ظاہرہ سے ہیں لیکن عقائد، باطنی اُمور سے تعلق رکھتے ہیں جن پر وحیِ الٰہی اور الہامِ خداوندی کے بغیر مطلع ہونا ممکن نہیں۔

منافقین کا گروہ اقوال واعمال کے اعتبار سے مومنین کے ساتھ شامل تھا لیکن ان کے اعتقادات اور قلبی اُمور کا حال قرآن وحدیث کی روشنی میں سب کو معلوم ہے۔ اس لیے اقوال واعمال کو ایمان کا معیار قرار نہیں دِیا جا سکتا۔ اسی حکمت کی بنا پر جس طرح اقوال واعمال کو عقائد کی بنیاد پر قائم کیا گیا بالکل اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے عشق و محبت اور تعظیم وتوقیر کو عقائد کی بنیاد بنایا گیا۔ مومن ومنافق کے درمیان یہی چیز حَدِ فاصل اور امتیازی نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن مجید میں کسی جگہ منافق کے لیے عشق ومحبت اور تعظیم وتوقیرِ رسالت کا ذِکر نہیں آیا۔ اس کے برعکس منافق کی توہین وتنقیصِ رسالت اور رسول اللہ ﷺ سے محبت کی بجائے نفرت اور آنحضرت ﷺ سے بُعد کا ذِکر منافقین کے حق میں وارد ہے۔ سورۂ نساء میں ہے: رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ط آپ منافقین کو اِس حال میں دیکھیں گے کہ وہ آپ سے منہ موڑ کر پھر جاتے ہیں۔ دُوسری جگہ سورۃ منافقون میں منافقین کا مقولہ بیان فرمایا: لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ط یعنی اگر ہم مدینہ لوٹے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے، بڑی ذِلت والے کو مدینے سے نکال دے گا۔

منافقین نے مومنین کے گروہ کو بڑی ذِلت والا کہا اور گروہِ مومنین میں خود رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے شامل ہیں۔ اس مقولہ میں "اَعَزّ" کے مقابل "اَذَلّ" مذکور

ہے۔ منافقین نے لفظ مومنین اور لفظ رسول کی تصریح کیے بغیر سب کو لفظ "اَذَلّ" سے تعبیر کر کے اللہ کے پیارے رسول ﷺ اور مومنین و رُسل کرام کی تصریح نہیں کی لیکن اس کے عموم میں تمام مومنین کا شامل ہونا اظہر من الشمس ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مومن کو منافق سے ممتاز کرنے والی چیز صرف عشق و محبت اور تعظیم و توقیر نبوی ہے۔

منافقین کے برخلاف مومنین کی شان یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں نہایت کثرت کے ساتھ ایمان والوں کے لیے محبت اور تعظیم و توقیرِ رسالت کا ذکر وارد ہے۔

سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا: "پیارے حبیب! فرما دیجیے (ایمان والو!) اگر تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور تمہاری کمائی کا مال اور وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے پسندیدہ مکان یہ سب چیزیں تمہیں اللہ اور اُس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم یعنی عذاب لائے اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دِکھاتا۔"

اس آیت کریمہ میں "اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ" کے الفاظ محبت رسول ﷺ کو عذابِ الٰہی سے بچنے کا ضامن اور ایمان کی رُوح قرار دے رہے ہیں۔

نیز سورۂ شوریٰ میں ارشادِ خداوندی وارد ہے: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى ؕ الاٰیۃ۔ میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اُجرت طلب نہیں کرتا، بجز محبت ذوی القربیٰ کے)۔ آلِ پاک کی محبت عین محبت رسول ہے، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جس کی طلب کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے اس محبت کی عظمت شان کا اظہار فرمایا ہے۔

سورۂ احزاب میں ازواجِ مطہرات کو مخاطب فرما کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَالدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ

اَجْرًا عَظِيمًا (اور اگر تم اللہ اور اُس کا رسول اور آخرت کا گھر چاہتی ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم میں نیکی کرنے والیوں کے لئے اجر عظیم تیار کیا ہے)۔ اِس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی چاہت اور محبت پر اجر عظیم کا وعدہ فرمایا جو محبت رسول ﷺ کے لئے کمال عظمت و اہمیت کی دلیل ہے۔

اہل مدینہ اور کل انصار و مہاجرین کے لیے سورۂ توبہ میں ارشادِ خداوندی نازل ہوا کہ مدینے والوں اور مہاجرین و انصار کو ہر گز لائق نہیں کہ وہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہیں اور نہ یہ کہ ان کی جان سے اپنی جان پیاری سمجھیں یعنی اپنی جانوں کو حضور ﷺ کی جان پر فدا کر دیں۔ یہ کمال محبت رسول ہے، ﷺ۔

اس آیت کریمہ کے مضمون سے متفق علیہ حدیث کے مضمون کی واضح تائید ہوتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: "لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین۔" اور صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں "من نفسه" کے الفاظ بھی وارد ہیں۔ یعنی تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس کے باپ اور بیٹے اور سب لوگوں سے اور اُس کی اپنی جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ "حضور! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ پیارے ہیں سوائے میرے جان کے۔" تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک میں کسی کی جان سے بھی زیادہ اُس کا محبوب نہ ہو جاؤں وہ ہر گز کامل مومن نہیں ہو سکتا۔" تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، "حضور! اُس ذات پاک کی قسم جس نے آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا، آپ میری جان سے بھی زیادہ مجھے محبوب ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا، "اے عمر! اب تمہارا ایمان کامل ہوا۔" معلوم ہوا کہ ایمان کی بنیاد حب رسول ہے، ﷺ۔ بے شمار احادیث صحیحہ سے یہ

مضمون ثابت ہے۔ بخوفِ طوالت اِسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس کے بعد تعظیم و توقیر کی طرف آئیے۔ سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ط (اے مسلمانو! تم اللہ تعالیٰ کے رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور اللہ کی پاکی بیان کرو صبح و شام)۔ اس آیت کے مضمون کا تعلق بھی مومنین سے ہے، منافقین سے نہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح ہوا کہ ایمان اور نفاق کے درمیان حدِ فاصل، رسول اللہ ﷺ کی محبت اور تعظیم و توقیر ہے۔

رہا یہ امر کہ محبت و تعظیم کا تعلق قلب سے ہے اس کا اظہار بھی قول و عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ "فَاتَّبِعُوْنِيْ" سے ظاہر ہے۔ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ صرف اقوال و اعمال علامتِ محبت نہیں ہوتے ورنہ منافقین بھی اہلِ محبت میں شامل ہو کر مومن قرار پائیں گے۔ منافقین نے ہمیشہ ایمان و محبت کے دعوے کے ساتھ ساتھ ظاہری اقوال و اعمال پر زور دیا مگر محبت کی کوئی صحیح علامت اُن میں نہیں پائی گئی۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء میں اور دیگر علمائے اعلام نے حضور ﷺ کی محبت کی علامات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضور کا نامِ پاک سُنتے ہی خشوع اور خضوع کی کیفیت طاری ہو جانا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضائل و محامد سن کر خوش ہونا اور سننے والے پر خوشی و مسرت کے آثار ظاہر ہونا، حضور ﷺ کے محبّین اور آل و اصحاب سے محبت کرنا، حضور ﷺ کی لقاء کا مشتاق ہونا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نورانی شہر بلکہ ہر اُس چیز سے جس کی نسبت ذاتِ مقدسہ سے ہے، محبت کرنا، ہر حال میں اپنے آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولایت میں جاننا بلکہ اپنی جان کو حضور ﷺ کی مِلک سمجھنا، حضور ﷺ کے ساتھ محبت کی علامات ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں آپ کی محبت کی عظیم ترین علامت یہ ہے کہ

دیکھنے والے کی آنکھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ میں کوئی عیب نہ دیکھے اور سننے والے کا کان حضور پاک ﷺ کا کوئی عیب نہ سنے، محبت والی آنکھ محبوب میں کوئی عیب نہیں دیکھ سکتی اور محبت والا کان محبوب کا کوئی عیب نہیں سن سکتا۔ مسند احمد، ابو داؤد اور تاریخ بخاری میں مرفوع حدیث وارد ہے: حبك الشي يعمي ويصم یعنی محبت، محبوب کا عیب دیکھنے سے آنکھ کو اندھا اور کان کو بہرا کر دیتی ہے۔

بے شک حضور ﷺ کی اطاعت اور اتباع آپ کی محبت کی قوی دلیل ہے لیکن صرف ظاہری قول و عمل اس کے لیے کافی نہیں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایسی صورت میں تمام منافقین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطیع اور متبع سنت قرار پائیں گے جو صراحۃً باطل ہے۔ معلوم ہوا کہ اطاعت اور اتباع کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ محبت سے سرشار ہو کر محبوب کی اداؤں کے سانچہ میں ڈھل جائے اور بہ تقاضائے محبت محبوب کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے۔ محبت کے بغیر کسی کے قول و فعل کے مطابق عمل کرنا صرف نقالی ہے، اتباع نہیں۔

اس تفصیل سے اہلِ سنت کا تشخص واضح ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے عشق و محبت اور تعظیم و توقیر کی بنیاد پر طریق مسلوکِ فی الدین پر استقامت، سُنّیت کا امتیازی مقام ہے۔ تمام صحابہ، تابعین، آئمہ مجتہدین، محدثین، اولیائے کرام اور علمائے اعلام و جملہ سلف صالحین سب کا یہی مسلک تھا اور اِسی لیے وہ سب اہلِ سنت تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی راہِ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین!

نظریہ پاکستان اور اس کا استحکام

کسی پاکستانی سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ صرف اِسلام ہی نظریہ پاکستان کی اساس ہے جس کا استحکام نظامِ مصطفیٰ کو نافذ کیے بغیر ناممکن ہے۔

قائد اعظم اور قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں کے متعلق ہمارا حسن ظن یہی ہے کہ

اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو وہ ضرور نظامِ مصطفےٰ نافذ کر دیتے۔ قائداعظم نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد صرف اِسلام اور قرآن ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے "قراردادِ مقاصد" پیش کر کے زرّیں کارنامہ انجام دیا، وہ قراردادِ مقاصد جسے پوری قوم ہدایت کا مینار سمجھتی ہے، مگر افسوس کہ قائد ملت کے بعد زمامِ اقتدار سنبھالنے والوں میں سے آج تک کسی نے اس ہدایت کے مینار سے روشنی حاصل نہیں کی۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ ہماری اِس سُنّی کانفرنس کا پہلا دِن "یومِ قائد ملت" ہے۔ میں اپنی قوم سے مخلصانہ گزارش کروں گا کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے اِسلامی مشن کی تکمیل کے لیے کامیاب کوشش کریں اور اربابِ اقتدار سے دردمندانہ اپیل کروں گا کہ قائد ملّت کے اس قائم کردہ مینارِ ہدایت (قراردادِ مقاصد) سے روشنی حاصل کریں۔

علماءِ اہلِ سنّت کا کردار

جب بھی قوم پر کوئی نازک وقت آیا اِسلام و مسلمین کے تحفظ کی خاطر علماء و مشائخ اہلِ سنّت سربکف میدانِ عمل میں نکل آئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جن اکابر علماء و مشائخ اہلِ سنّت نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا اُن میں علامہ فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا کفایت علی کافی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی اور مولانا فضل رسول بدایونی پیش پیش تھے۔ یہی وہ بزرگانِ دِین تھے جن کی یلغار سے ایوانِ فرنگ میں تہلکہ مچ گیا۔ ان حضرات کا انگریز کے خلاف فتوائے جہاد صادر کرنا ہی تھا کہ انگریزوں نے اُنہیں سخت تکالیف پہنچانا شروع کر دِیں۔ مولانا کافی مراد آبادی اور مولانا فضل رسول بدایونی کو سرِعام تختہ دار پر کھینچ دِیا گیا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی اور مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی کو قید کر کے جزیرہ انڈیمان (کالے پانی) بھیج دِیا گیا اور ان کی حمایت کرنے

والوں کو صرف اِس جرم کی پاداش میں گولیوں سے بھون دیا گیا کہ انہوں نے اِن پیکرانِ حق وصداقت کا ساتھ دِیا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کو اِس تحریک آزادی میں بظاہر ناکامی ہوئی مگر آگے چل کر انہی مبارک ہستیوں کی قربانیاں قیامِ پاکستان کا باعث بنیں۔

فاضل بریلوی اور دوقومی نظریہ

تحریکِ ترکِ موالات کے پردے میں "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ لگانے والوں نے جب ہندو مسلم اتحاد اور باہمی موَدّت واشتراک کا ڈھونگ رچا کر "ایک قومی نظریہ" کا پرچار کیا تو اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے خلاف "الحجۃ المؤتمنہ" کے عنوان سے ایک تاریخی فتویٰ جاری فرما کر اس گمراہ کن نظریئے کا رَدِّ بلیغ فرمایا۔ اعلیٰحضرت کے طویل فتویٰ کا خلاصہ یہ ہے:

"ہندو کی غلامی، مسلمان کے لیے انتہائی بے غیرتی ہے۔ ہندو ناپاک ہے، مسلمان پاک۔ اِن دونوں کا آپس میں اتحاد واشتراکِ عمل کیونکر ہوسکتا ہے۔"

اعلیٰحضرت نے اِس فتویٰ میں نہایت حُسن وخوبی اور جامعیت کے ساتھ "دوقومی نظریہ" پیش فرمایا اور اسی نظریئے کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔

بنارس سنی کانفرنس

ہندو کے ساتھ اتحادِ عمل رکھنے والے "ایک قومی نظریئے" کی حمایت اور قیامِ پاکستان کی مخالفت میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اِسی بنا پر وہ "قائد اعظم" اور "مسلم لیگ" کے بھی سخت مخالف تھے۔

اِس نازک مرحلے پر اعلیٰحضرت فاضل بریلوی کے دیئے ہوئے "دوقومی نظریئے" کو لے کر علماء ومشائخ اہلِ سنّت اپنے بزرگوں کی سابقہ روایات کے مطابق میدانِ عمل میں نکل آئے اور قیامِ پاکستان کی حمایت کے لیے ۱۹۴۶ء میں اُنہوں نے "بنارس

آل انڈیا سنّی کانفرنس" منعقد کی۔ اِس کانفرنس کے سرپرست امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری تھے اور محرک حضرت علامہ سید محمد محدث کچھوچھوی، ناظم اعلیٰ صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی اور اُس کے رُوح و رواں حضرت شاہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی و مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مصطفےٰ رضا خان بریلوی، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، مولانا محمد عمر نعیمی، مولانا عبد الغفور ہزاروی، علامہ سید ابو البرکات اور مفتی ظفر علی نعمانی تھے۔ حضرت پیر بھر چونڈی کی معیت میں فقیر بھی اس تاریخی کانفرنس میں حاضر تھا۔ اس کانفرنس میں پانچ ہزار سے زیادہ علماء و مشائخ اہلِ سنّت نے شرکت فرما کر "مطالبہ پاکستان" کی زبردست حمایت کی اور برصغیر پاک و ہند کے دور دراز علاقوں کا طویل دورہ کر کے قوم میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ سب نے قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہہ کر مسلم لیگ کی حمایت کے لیے شب و روز کام کیا۔ بالآخر پاکستان کی صورت میں ایک عظیم اِسلامی مملکت دُنیا کے نقشے پر اُبھر آئی۔

تحریکِ ختمِ نبوت

تحریکِ ختمِ نبوت کا سہرا بھی جماعت اہلِ سنّت کے سر ہے۔ آل پاکستان مجلسِ عمل کے صدر علامہ سید ابو الحسنات، اُن کے صاحبزادے مولانا امین الحسنات سید خلیل احمد، مولانا محمود احمد رضوی، مولانا عبد الحامد بدایونی اور مولانا عبد الستار خاں نیازی کا مرکزی کردار، اِن عاشقانِ بارگاہِ ختمِ نبوت کی قید و بند کی صعوبتیں، عوامِ اہلِ سنّت کا سینوں پر گولیاں کھا کر شہید ہونا اور جیلوں میں جانا کسی سے مخفی نہیں۔ اِس تحریک کا ایک عظیم مرکز ملتان بھی جس کی مجلسِ عمل کی صدارت کے فرائض خود اس فقیر نے انجام دِیئے۔ دیگر مکاتبِ فکر کے اکابر بھی اس تحریک میں شامل تھے لیکن اس تحریک کی قیادت اور عوامی قوت کی سعادت سوادِ اعظم اہلِ سنّت ہی کو نصیب ہوئی۔ بظاہر اُس وقت کامیابی نہ ہوئی لیکن بالآخر مرزائیوں کا "غیر مسلم اقلیت" قرار پانا اسی تحریک کا نتیجہ

ہے۔

ٹوبہ کانفرنس

سنہ ۱۹۷۰ء میں ایک کمیونسٹ لیڈر نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جب نام نہاد "کسان کانفرنس" سے خطاب کرتے ہوئے ملک میں "سرخ انقلاب" لانے اور "گھیراؤ جلاؤ" کی تحریک چلانے کی دھمکی دے کر ملکی امن و امان کو درہم برہم کرنے کی ناکام کوشش کی اور دوسری طرف مٹھی بھر لوگوں کی "اسلامی سوشلزم" کی گمراہ کُن اصطلاح نے جلتی پر تیل کا کام کیا تو نتیجے میں علماء و مشائخ نے اپنے اسلاف کی روایات کے مطابق سرخ سامراج کو شکست دینے کے لیے دارالسلام (ٹوبہ) میں آل پاکستان سنّی کانفرنس منعقد کر کے ملت کی صحیح رہنمائی کی۔ اس تاریخی کانفرنس نے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا زور توڑ دِیا۔

تحریک نظامِ مصطفیٰ

قوم کو "نظامِ مصطفیٰ" کا نعرہ جماعت اہلِ سنّت نے دِیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں دوسری جماعتیں بھی اپنے مقاصد کو لے کر شامل ہوئیں مگر صرف اور صرف "نظامِ مصطفیٰ" کی بنیاد پر اس ملک گیر تحریک کو چلانا اور تائیدِ ایزدی سے اسے کامیابی کے مرحلے پر پہنچانا سوادِ اعظم اہلِ سنّت ہی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے تاریخِ پاکستان میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی سے قائد اہلسنّت علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، پروفیسر شاہ فرید الحق، ظہور الحسن بھوپالی اور مولانا محمد حسن حقانی کی زیرِ قیادت نظامِ مصطفیٰ کی یہ تحریک جس زور و شور سے اُٹھی اور سارے ملک میں پھیل گئی، روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اس ہمہ گیر تحریک میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مشوری، مولانا عبدالستار خاں نیازی، پیر محمد کرم شاہ بھیروی، علامہ سید عبدالقادر گیلانی، ملک محمد اکبر ساقی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مفتی محمد مختار احمد گجراتی، حافظ مولانا محمد عالم

(سیالکوٹی)، قاضی محمد فضل رسول اور الحاج مولانا فضل کریم، حاجی لطیف احمد چشتی اور اُن کے صاحبزادے امجد چشتی، قاری عبدالحمید، مفتی محمد حسین، مولانا سید اقبال حسین صاحبان نے مجاہدانہ شان سے مرکزی کردار ادا کیا۔

جہاں تک تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کی قوت و شدت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے ملتان کو منفرد مقام حاصل رہا۔ جس کی قیادت حضرت پیر طریقت مولانا حامد علی خان صاحب نے فرمائی اور موصوف کی قیادت میں تمام مقامی و مہاجر اور ہر طبقہ کے اہلِ سنّت علماء، وکلاء، طلباء، مزدور اور تاجر وغیرہم، سب نے نظامِ مصطفیٰ کی بنیاد پر اس تحریک میں عظیم قربانیاں دیں، بہت سے لوگ شہید ہوئے اور جیلوں میں گئے بالخصوص رُہتک کے جانباز اور جیالے سُنّیوں نے بے مثال کردار ادا کیا، سینوں پر گولیاں کھائیں اور جیلوں کو بھر دیا۔ سوادِ اعظم اہلسنّت کے ان تمام مجاہدین کا یہ مثالی کردار پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اختتامیہ

آج ہمارا ملک بحران سے دوچار ہے۔ ایک طرف الحاد و لادینیت کا سیل رواں اسلامی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے، دُوسری طرف تحریکِ پاکستان کے مخالفین نے اپنے سیاہ ماضی کی روایات دُہرا کر ملک و ملت اور مسلکِ اہلسنّت کو نقصان پہنچانے میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اِن تمام سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے "بنارس" اور "دارالسلام" ٹوبہ سُنّی کانفرنس کی نہج پر ملتان میں یہ "کُل پاکستان سُنّی کانفرنس" منعقد کی گئی ہے۔

وقت کے تقاضے

ملّت کی تعمیر اور قوم کی فلاح و بہبود کے ضمن میں ہماری نظر صرف ماضی تک محدود رہی۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور پیش آنے والے مسائل کی طرف

ہماری توجہ آج تک مبذول نہیں ہوئی۔ موجودہ دور کے تغیرات ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم پوری علمی بصیرت سے حالات کا تجزیہ کریں۔ حال و مستقبل کے تقاضوں کو سمجھیں اور اُن کو پورا کرنے کی کامیاب جدوجہد کریں۔

علماء اہلِ سنّت کی خدمت میں مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ علماء سلف کی سیرت کو سامنے رکھیں۔ وہ دیکھیں کہ کس طرح علماء سابقین نے دُنیوی شہرت اور مال و منال کی طمع سے بالاتر ہو کر علومِ دِین کی خدمت انجام دی۔ کسی نے تجارت کر کے روزی کمائی، کسی نے کمبل اور پوستین بنا کر، کسی نے مٹی کے برتن تیار کر کے، کسی نے سرکہ بیچ کر اور بعض نے جوتے سی کر اپنا پیٹ پالا اور بے لوث ہو کر علم کو پھیلایا اور اُس کی نشر و اشاعت کی۔ اِس دَور میں اُن حضرات کی مثال نہیں ملتی۔ میں خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر شرمندہ ہوتا ہوں، تاہم یہ ضروری ہے کہ ہر عالمِ دِین اپنے دِل میں خوف و خشیتِ الٰہیہ پیدا کرے اور ذاتی و دُنیوی مفادات سے بے نیاز ہو کر تعلیمِ دِین کے فرائض سرانجام دے۔ سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط اور صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان وارد ہے: انا اعلمکم باللہ واخشٰکم منہ۔

حسد اور باہمی منافرت علماء کے طبقے میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہی، افتراقِ اُمت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جس کی بنیاد "انانیت" ہے۔ سُنّی علماء ان اولیائے کرام کے مشن کو قوم کے سامنے رکھنے کے مدعی ہیں جنہوں نے "انانیت" کو فنا کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں انہیں لازم ہے کہ وہ اپنی "انا" کو فنا کر کے آپس میں کمالِ محبت و اخلاص کا جذبہ پیدا کریں۔

حضرات مشائخ کرام جن اولیائے کرام کے سجادہ نشین ہیں اُن کے فقر و زُہد، علم و معرفت، تقویٰ و طہارت، عبادت و ریاضت، رُوحانیت اور خدمتِ خلق کو اپنائیں، اس

کے بغیر اولیائے کرام کی نیابت اور اُن کی سجادگی کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوسکتا۔

سجادگانِ کرام، مال و دولت اور دُنیوی عزت کو اپنے عظیم منصب کا بنیادی نقطہ نہ سمجھیں۔ اپنے اسلاف کو دیکھیں، ان کے پاس علم و معرفت اور زُہد و فقر کی دولت کے سوا کیا تھا؟ تاریخ شاہد ہے کہ امراء سلاطین زمانہ اُن کی غلامی کو اپنے لیے باعث عزّ و شرف سمجھتے تھے۔ آپ حضرات کو بھی اُنہی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔

قدیم و جدید ماہرینِ تعلیم اور دانشورانِ اہلسنّت کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اس دور میں اُن کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ نصابِ تعلیم میں اِسلامی رُوح پیدا کریں۔ علومِ جدیدہ کو اِسلامی علومِ قدیمہ سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش فرمائیں۔ اس کام میں اپنی پوری علمی بصیرت سے کام لیں۔ اس بنیاد پر قوم کے تعاون سے تصنیف و تالیف کے ادارے قائم کریں۔

اہلِ ثروت تاجروں، زمینداروں، امیروں اور تمام مخیّر اہلسنّت حضرات کا فرض ہے کہ وہ تمام تعمیری کاموں میں مخلصانہ طور پر بھرپور مالی تعاون فرمائیں کیونکہ اس کے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے۔

اِسلام نے اِنسانی معاشرہ میں عورت کو بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ نسل اِنسانی کی فلاح و بہبود کی ضامن عورت ہے۔ بچے کی تعلیم و تربیت کا پہلا مرحلہ آغوشِ مادر ہے، اس کے بعد گھریلو ماحول، ان دونوں کے بعد مکتب یا مدرسہ ہے۔

شرم و حیا، عفت و عصمت عورتوں کے بنیادی محاسن ہیں۔ ازواجِ مطہرات، اہلِ بیتِ اطہار، اور خیر القرون میں خواتین اِسلام نے پردہ میں رہ کر خدا اور اُس کے رسول کی رضا کے لیے اِسلام کی جو بے مثال خدمات انجام دیں، تاریخ اِسلام ان پر شاہد ہے۔ اِس لیے خواتین اہلسنّت اور بناتِ اِسلام کے لیے میرا یہ پیغام ہے کہ وہ اپنی سابقہ روایات کو زندہ کریں۔

اس موقع پر میں اپنے اہلسنت عزیز طلبہ کو نہیں بھول سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلبہ پوری قوم کا متاعِ عزیز ہیں۔ ان کے لیے میرا یہ پیغام ہے کہ وہ بے سُود ہنگامہ آرائی سے بچیں۔ تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں، علم و عمل کے میدان میں زبان سے زیادہ قلم میں زور پیدا کریں۔ مسلک کی بنیاد پر اپنی تنظیم کا دائرہ وسیع کریں اور اسے بہت زیادہ مستحکم بنائیں۔

راہنمایانِ اہلِ سنّت کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ سوادِ اعظم اہلسنت کا مکمل اعتماد آپ کو حاصل ہے۔ ہر منٹ، ہر وقت آپ کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آپ حضرات نے اب تک اہلسنت کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی لیکن اس کے باوجود نہایت ادب سے عرض کروں گا، جو سُنّی صاحب فہم و فراست آپ کی رفاقت میں دیانت و اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، آپ ضرور اُسے اعتماد میں لیں اور ایسے سب رفقاء کار کی عقل و خرد کی روشنی میں وقت کے تقاضوں اور مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا صحیح جائزہ لیں اور پوری قوت و ہمت اور کامل بصیرت کے ساتھ اہلسنت کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ کی معمولی سی لغزش پوری جماعت اور کُل سوادِ اعظم کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اِس لیے کمالِ حزم و احتیاط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں اور اپنی ذمہ داریوں کی اہمیت کے احساس سے کسی وقت بھی غافل نہ ہوں۔

نیز یہ کہ پاکستان بنانے والے بھی آپ ہیں اس لیے اِس کی حفاظت کا احساس سب سے زیادہ آپ ہی کو ہو سکتا ہے۔ ملک کو ایسے حالات سے بچائیے جو ملکی سالمیت کے لیے مضر ہوں۔ حکومت کے اچھے کاموں کے ساتھ تعاون کیجیے اور اس کی غلط روی پر گرفت سے ہرگز دریغ نہ فرمائیے لیکن تنقید برائے تنقید کسی حال میں مفید نہیں۔

آخر میں اربابِ اقتدار کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اقتدار آنے جانے والی چیز ہے اس کے نشے میں سرشار ہو کر ملک کی اکثریت عظیمہ کو نظر انداز کر دینا قرین مصلحت ہے نہ مقتضائے انصاف۔ میں پورے وثوق کے ساتھ اربابِ حکومت سے عرض کرتا ہوں کہ سوادِ اعظم اہلسنّت پاکستانی مسلمانوں کی اسی فیصد آبادی ہے۔ اگر اس کے مذہبی حقوق کو پامال کیا گیا مثلاً "الصلاۃ والسلام علیك یا رسول الله" کہنے پر کسی قسم کی پابندی لگائی گئی یا خطباء و علماء اہلسنّت کو ٹھیس پہنچائی گئی تو سوادِ اعظم اہلسنّت ہرگز اس کو برداشت نہ کریں گے اور اس کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری اربابِ اقتدار پر ہوگی۔

اپیل

میرے محترم سنّی بھائیو!

میں آپ سب کا ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ ملک کے گوشے گوشے میں جماعت اہلسنّت کی تنظیموں کو مستحکم کیجیے، ہر تنظیم کی مجلسِ شوریٰ کا کم از کم پندرہ روزہ اجلاس منعقد کر کے مرکز کو اس کی رپورٹ بھیجیے اور مرکز کی ہدایات و تجاویز کو عملی جامہ پہنائیے۔ مرکز سے آپ کا مستحکم رابطہ نہایت ضروری ہے۔

عہدِ واثق

آپ سب اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کا نظام اپنے اوپر جاری کرنے یعنی پابندی کے ساتھ نماز پڑھنے اور صحیح طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کا پکا عہد کریں۔ اور حُسنِ اخلاق کو اپنائیں، اپنے مسلک اور ملک و ملت کی فلاح کے لیے کسی قسم کی قربانی اور ایثار سے دریغ نہ کریں اور ہر ایک کو یہی پیغام نرمی اور حُسن و خوبی کے ساتھ پہنچائیں۔ خود بھی برائی سے بچیں اور دوسروں کو بھی برائی سے بچائیں۔ آپ بھی نیکی کریں اور دوسروں کو بھی بھلائی کی ترغیب دیں۔ میں خود بھی آپ کے ساتھ اِس عہد میں شریک ہوں۔ اللہ

تعالیٰ ہم سب کو یہ عہد پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

بزرگانِ ملت اور سُنی بھائیو! اگر ہم سب نے اِس عہد کو پورا کیا اور "جماعت اہلسنّت" کی تنظیم کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور اس کے استحکام میں پوری طرح کامیاب ہو گئے تو یقین کیجیے کہ اِن شاءاللہ تعالیٰ آپ کی یہ خالص مذہبی تنظیم لوگوں کی سیاسی تنظیموں سے بہت زیادہ ملک و ملت کے لیے مفید ثابت ہو گی اور "اہلسنّت سوادِ اعظم" کی یہ خالص مذہبی جماعت پاکستان میں سب سے زیادہ عظیم طاقت بن کر ابھرے گی اور اس وقت آپ دُشمنانِ نظریہ پاکستان کو للکار کر کہہ سکیں گے ؏

دُور ہٹو اے دُشمن ملت پاکستان ہمارا ہے

اسلام زندہ باد پاکستان پائندہ باد

سید احمد سعید کاظمی

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمہ طیبہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ترجمہ: نہیں ہے کوئی معبود اللہ کے سوا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

توحید: یہ کلمہ طیبہ توحید پر مشتمل ہے۔ توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو معبود برحق، وحدہٗ لاشریک لہٗ ماننا اور یہی دین کی بنیاد ہے۔

الوہیت: استحقاقِ عبادت[1] یا وجوب[2] کو الوہیت کہتے ہیں۔ جو ذات مستحق واجب الوجود کے لیے مستحق عبادت ہونا ضروری ہے۔

مشرکین کی سفاہت[3] ہے کہ وہ اپنے بتوں اور معبودوں کو ممکن الوجود[4] مان کر معبود اور مستحق عبادت سمجھتے ہیں۔

عبادت: غایت[5] تعظیم اور انتہاء تذلل[6] کو عبادت کہتے ہیں جس کی اصل یہ ہے کہ عبادت کرنے والا جس کی عبادت کرتا ہے اس کے لیے ذاتی اور مستقل صفت مانتا ہے جس میں کسی کی قدرت و مشیت کو کسی قسم کا کوئی دخل نہ ہو۔

اصل عبادت اسی اعتقاد کو کہتے ہیں۔ اس اعتقاد کے ساتھ کسی کی اطاعت و

---

[1] عبادت کا مستحق ہونا [2] وجود کا ضروری ہونا کہ اس کا عدم نہ ہو سکے [3] بیوقوفی [4] جو معدوم ہو سکتا ہے [5] انتہائی تعظیم [6] انتہائی عاجزی

محبت یا اس کے لیے کوئی عمل کرنا اس کی عبادت ہے۔ بغیر عمل کے کسی کے لیے صرف اعتقاد کا ہونا بھی اس کی عبادت قرار پائے گا۔

استعانت: الوہیت اور عبادت کے معنی واضح ہونے کے بعد استعانت[1] کے معنی خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں اور وہ یہ کہ کسی کے لیے عون[2] کی ایسی صفت[3] مستقلہ مان کر جو مقہوریت[4] اور مغلوبیت[5] سے بالاتر ہو اس سے طلب عون کو استعانت (حقیقیہ) کہا جاتا ہے ایسی استعانت صرف معبود حقیقی کی شان کے لائق ہے، لہٰذا مستعان[6] وہی ہو سکتا ہے اس کے غیر سے استعانت دراصل اس کی الوہیت و معبودیت کے اعتقاد کے منافی ہے۔

فائدہ: چوں کہ الوہیت اور معبودیت استقلال ذاتی[7] کے بغیر متصور نہیں، اس لیے کسی کو مجازی معبود و الٰہ نہیں کہہ سکتے بخلاف استعانت، محبت اور اطاعت وغیرہ کے کہ یہاں مستعان مجازی[8] اور محبوب مجازی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ مظاہر کائنات میں خالق حقیقی نے یہ اوصاف پیدا کیے ہیں اور جو چیز پیدا کی ہوئی ہو اس میں استقلال ذاتی ممکن نہیں جس طرح استقلال ذاتی میں حدوث[9] و امکان کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا الٰہ اور معبود کو مجازی کہنا بالکل ایسا ہوگا جیسے واجب الوجود کو حادث کہہ دیا جائے۔

مختصر یہ کہ الوہیت کے مفہوم کا خلاصہ، غلبہ اور استقلال ذاتی ہے جو ذات اس سے متصف ہوگی اس کے لیے استحقاق عبادت و استعانت اور وجوب وجود بداہۃً[10] ضروری ہوگا اور یہ ملازمت و ضرورت[11] کا سلسلہ ایسا ہے کہ معبود برحق کے تمام

---

[1] مدد۔ [2] امداد [3] وہ صفت کہ صاحب صفت اس صفت میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ [4] مجبوری [5] مغلوب ہونا [6] جس سے مدد طلب کی جائے۔ [7] کسی کا محتاج نہ ہو [8] جس سے مجازی طور پر مدد طلب کی جائے۔ [9] حدوث کا معنی ہے عدم کے بعد موجود ہونا اور امکان کا معنی ہے قابل عدم ہونا۔ [10] واضح طور پر۔ [11] لازم اور ضروری ہونا

اوصاف واقعیہ کو اعتقاد کے سامنے لے آتا ہے اور ایک مومن و مصدق اس کی روشنی میں معبودِ حقیقی کے تمام اوصاف کو بلا تامل تسلیم کر لیتا ہے۔

مثلاً استحقاق عبادت کے لیے ضروری ہے کہ معبود سب سے بڑا اور عظمت والا ہو نیز اس کے لیے واجب الوجود ہونا بھی ضروری ہو کیوں کہ امکان کی صورت میں احتیاج لازم آئے گی اور محتاج غایت تعظیم کا مستحق نہیں ہو سکتا، اسی طرح واجب الوجود ہونے کے لیے صانع عالم[1] ہونا لازم ہے کیوں کہ سلسلہ ممکنات[2] کا غیر متناہی ہونا محال ہے، لامحالہ کسی واجب پر ختم ہو گا وہی صانع قرار پائے گا۔ پھر صانع کا تعدد امکان تمانع[3] کو مستلزم[4] ہے اور امکان تمانع اجتماع نقیضین کو مستلزم ہے اور ظاہر ہے کہ اجتماع نقیضین[5] ممکن نہیں بلکہ محال ہے اور مستلزم محال یقیناً محال ہوتا ہے۔ اس لیے امکان تمانع[6] باطل قرار پائے گا اور تعدد صانع ممتنع ہو گا۔ معلوم ہوا کہ صانع کا ایک ہونا ضروری ہے۔ جب صانع کا وجود ضروری ہو تو اس کے لیے حیات علم و قدرت، سمع و بصر، کلام ارادہ اور حکمت و مشیت تمام اوصاف کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ صانع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صانع کے لیے کائنات کا رب ہونا اور ربوبیت کے لیے رحمان و رحیم ہونا سب کچھ ضروریات و لوازمات سے ہے کہ لزوم[7] و ضرورت کا یہ سلسلہ ایسا ہے کہ ایک صفت کے ساتھ دوسری اور دوسری کے ساتھ تیسری اور اسی طرح ہر صفت ملزومہ کے ساتھ صفت لازمہ ثابت ہوتی چلی جائے گی۔

شرک: توحید کی نقیض شرک[8] ہے، چونکہ توحید امر واجب[9] لذاتہٖ کا اعتقاد ہے اور واجب لذاتہٖ کا نقیض ممتنع لذاتہٖ[10] ہے۔ لہٰذا جب تک کسی امر ممتنع لذاتہٖ کا

---

[1] جہان کا بنانے والے [2] قابل عدم چیزوں کا سلسلہ [3] تصادم کا ممکن ہونا [4] ملزوم جسے کوئی چیز لازم ہو [5] دو انتہائی بعید چیزوں کا جمع ہونا [6] نا ممکن [7] لازم ہونا [8] مقابل [9] جس کی ذات وجود کو چاہے اور عدم کے قابل نہ ہو [10] جس کی ذات قابل وجود نہ ہو

اعتقاد نہ ہو اس وقت تک شرک مستحق نہ ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا مستقلاً بالذات قادر مطلق ہونا واجب لذاتہٖ ہے اور اس کا اعتقاد توحید ہے اور اللہ تعالیٰ کے غیر کا مستقلاً بالذات قادر[1] مطلق ہونا ممتنع لذاتہٖ ہے تو جو شخص غیر خدا کے حق میں ایسا اعتقاد رکھے وہ شرک ہے اور اس کا یہ اعتقاد شرک قطعی ہے۔ خواہ وہ ایسی قدرت بعطاء خداوندی ہی کیوں نہ مانتا ہو۔ کیوں کہ صفت مستقلہ اوصاف الوہیت سے ہے اور وصف الوہیت کی عطاء ممتنعات[2] ذاتیہ سے ہے۔ لہٰذا اعطائے الوہیت کا معتقد بھی امر ممتنع لذاتہٖ کا اعتقاد رکھنے کی وجہ سے مشرک قرار پائے گا لیکن اگر کسی غیر خدا کے حق میں کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام ممکنات پر غیر مستقل قدرت عطا کر دی ہے تو یہ اعتقاد شرک نہ ہوگا کیوں کہ غیر مستقل قدرت عطا کرنا تحت قدرت ہے اور جو چیز تحت قدرت ہو ممکن بالذات ہے اور کسی ممکن بالذات کا ممتنع لذاتہٖ ہونا محال ہے اور جب تک کسی امر ممتنع لذاتہٖ کا اعتقاد نہ ہو مشرک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تمام ممکنات پر اللہ تعالیٰ کا اپنے کسی محبوب کو غیر مستقل قدرت عطا کرنے کا اعتقاد ہرگز شرک نہ ہوگا۔

قدرت کی طرح علم، سمع، بصر کو بھی سمجھ لیجیے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی محبوب کو تمام مخلوقات کا غیر مستقل یعنی ممکن اور حادث علم عطا کر دیا ہے یا دور و نزدیک کی ہر شے اور ہر آواز کے سننے دیکھنے کی غیر مستقل صفت کا عطا کرنا تحت قدرت ہونے کی وجہ سے ممکن ہے اور امر ممکن کا اعتقاد شرک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا استقلال ذاتی ہی کا عقیدہ شرک ہوگا۔ کیوں کہ استقلال والوہیت کی اعطا ممتنع لذاتہٖ ہے اور اسی کا اعتقاد شرک ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ توحید و الوہیت او عبادت و شرک کے ان مفاہیم کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ الٰہ برحق صرف وہی

---

[1] قادر ہونے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ [2] وہ چیزیں جو ہو ہی نہیں سکتیں۔

ذات واجب الوجود ہے جو ہر صفت کمال سے متصف اور ہر عیب و نقص سے پاک ہو اور اسی ذات مقدسہ کا نام "اللہ" ہے اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ یہ معنی ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے اور اصل دین بھی یہی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ (تعالیٰ) کے رسول ہیں۔

محمد: لفظ "محمد" کا مادہ حمد ہے اور التحمید مصدر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک اور اسمائے مبارکہ میں سے اسم ذات ہے اس کے معنی ہیں بہت زیادہ بار بار حمد کیا ہوا، بے شمار تعریف کیا ہوا، مطلقاً سراہا ہوا۔

مواہب اللدنیہ میں امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث کا مضمون ارقام فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آسمانوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور نام مبارک احمد ہے اور زمین میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

احمد: لفظ "احمد" کا مادہ بھی حمد ہے۔ احمد مصدر سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ حمد کرنے والا۔ حمد کرنے والا ضرور قابل تعریف ہوتا ہے اور جو قابل تعریف ہو وہ یقیناً مستحق حمد کی تعریف کرتا ہے۔ لہٰذا احمد ہونے کے لیے محمد ہونا ضروری ہے اور محمد ہونے کے لیے احمد ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے "احمد و محمد" دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء ذاتیہ سے شمار کیا ہے اور بعض نے دونوں کو ہم معنی بھی قرار دیا ہے۔

بشارت عیسیٰ علیہ السلام اور ایک شبہ کا ازالہ

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک بشارت ان الفاظ میں مذکور ہے:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی
اسْمُهٗ اَحْمَدُ

ترجمہ: میں بشارت دیتا ہوا آیا ہوں اس
رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام
احمد ہے۔

اس مقام پر ایک شبہ وارد ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں چار جگہ حضور ﷺ کا نامِ مبارک محمد آیا ہے (ﷺ)۔ اسی طرح اذان، نماز، کلمہ اور درود سب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک محمد ہی وارد ہے تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسمہٗ احمد کی بجائے اسمہٗ محمد کیوں نہیں فرمایا۔ لفظ "احمد" کے ساتھ بشارت میں یہ خدشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے "احمد" کے آنے کی بشارت دی ہے اور حضور "محمد" ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کا مصداق کوئی اور ہو جس کا نام "احمد" ہو۔

اس کے متعدد جواب ہو سکتے ہیں لیکن سرِ دست ہم صرف ایک جواب پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانی الاصل ہیں اور وہ اس طرح کہ ان کی تخلیق نفخ جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی یعنی اس کے بغیر کہ نفخ جبرائیل علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مادہ تسلیم کیا جائے بلکہ محض سبب اولین ہونے کی حیثیت سے اور اس اعتبار سے کہ جبرائیل علیہ السلام کا نفخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے حاملہ ہونے کا ذریعہ بنا۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی اصل نفخ جبرائیل علیہ السلام قرار پایا اور نفخ جبرائیل ذاتِ جبرائیل علیہ السلام سے متعلق ہے اور ذاتِ جبرائیل علیہ السلام آسمانی ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانی الاصل قرار پائے۔

اور ہم سابقاً عرض کر چکے ہیں کہ حضور ﷺ کا نام مبارک احمد آسمانی

ہے، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام نے اسی نام پاک کے ساتھ بشارت دی تا کہ اس بشارت سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانی الاصل ہونے پر روشنی پڑ جائے کیوں کہ بہترین کلام وہی ہوتا ہے جس سے متکلم کی حیثیت نمایاں ہو جائے تو گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ "احمد" کے ساتھ بشارت دے کر بتادیا کہ میں آسمانی الاصل ہوں۔ اسی لیے آسمانی بولی بول رہا ہوں۔ جو جہاں کا ہوتا ہے وہیں کی بولی بولتا ہے۔

اب لفظ "محمد" کی طرف آئیے اور کلمہ طیبہ میں اس کے وارد ہونے پر غور کیجئے۔ کلمہ طیبہ دراصل دین متین کی بنیاد ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہاں لفظ "محمد" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت کس قدر عظیم و جلیل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کلمہ طیبہ کا جزو اول جو توحید اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت و معبودیت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ بمنزلہ دعویٰ کے ہے جسے تسلیم کرنے کے لیے ہر انسان دلیل کا محتاج تھا اور وہ دلیل کلمہ طیبہ کا جزِ ثانی "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ہے۔

ابھی عرض کر چکا ہوں کہ "محمد" کے معنی ہیں بہت زیادہ تعریف کیا ہوا اور تعریف ہمیشہ خوبی اور حسن و جمال کی ہوتی ہے۔ عیب کی تعریف نہیں ہوتی بلکہ اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس ذات پاک کو "محمد" کہا گیا ہے وہ عیب و نقص اور برائی و ذم سے پاک ہے اور مجسمہ حسن و جمال ہے اور یہ اس لیے کہ وہ دلیل ہے دعویٰ توحید کی، توحید کا دعویٰ بالکل بے عیب ہے اس لیے اس کی دلیل بھی بے عیب ہونی چاہیے۔ اسی بے عیب دلیل کا نام "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرقہ ناجیہ
سوادِ اعظم اہلسنت و جماعت

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

عن انس بن مالك قال سمعت رسول الله ﷺ
يقول ان امتی لا تجمع علی ضلالة فاذا رأيتم
اختلافاً فعليكم بالسواد الاعظم [1]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔
انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔
حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "میری امت گمراہی
میں جمع نہ ہوگی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے
بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔"

بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ اسلام میں فرقہ بندی کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور سیدِ عالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اس اختلاف وافتراق کی بابت پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

والذی نفس محمد بیدہ لتفرقن امتی علی
ثلث وسبعین فرقة فواحدة فی الجنة

[1] رواہ ابن ماجہ

وثنتان وسبعون فی النار (ابن ماجہ)

ترجمہ: اس ذات پاک کی قسم جس کے دستِ قدرت

محمد ﷺ کی جان پاک ہے کہ میری امت ۷۳

فرقوں میں منقسم ہوجائے گی (ان میں سے) ایک

جنت میں جائے گا۔ اور ۷۲ دوزخ میں جائیں گے۔

حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئی انسانی فطرت کے عین مطابق تھی۔ نظامِ کائنات اور رفتارِ زمانہ بھی اس پر شاہد ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نسلِ انسانی ابتداءً چند اصول کو تسلیم کرلیتی ہے۔ پھر مرورِ زمانہ کی وجہ سے اس کے بعض افراد کے خیالات میں ان مانے ہوئے اصول کے متعلق تفاوت اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے بلکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد وہ اختلاف کچھ ایسی نوعیت اختیار کرلیتا ہے کہ اس جماعت میں سے ایک فرد بھی مسلمہ اصول پر قائم نہیں رہتا لیکن آسمانی اور الہامی اصول اور سچے دین کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس دین کو قبول کرنے والوں میں سے ضرور ایک جماعت ایسی ہوتی ہے جو اس کثرت اختلاف کے باوجود بھی حق وصداقت پر قائم رہتی ہے اور فرقہ بندی کا طوفان اس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکتا۔

مختصر یہ کہ غلط اصول کا ذِکر ہی کیا؟ جب ان کی بنیاد ہی باطل پر ٹھہری تو ان میں حقانیت وصداقت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ الہامی اور آسمانی تعلیمات میں بھی نسلِ انسانی نے اس قدر اختلاف کیا کہ مدت مدید کے بعد ان کو قبول کرنے والوں کی اتنی قلیل تعداد حق وصداقت پر باقی رہی کہ اسے ۷۱ یا ۷۲ یا ۷۳ حصوں میں سے ایک حصہ کہا جاسکتا ہے۔ انسان کی اس فطرت کے ساتھ گردشِ کائنات کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ رفتارِ زمانہ کے اثر سے زمانیات

میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کا انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ زمانیات کے بہت تھوڑے افراد ایسے ہوتے ہیں جو اس گردشِ لیل و نہار سے متاثر ہو کر مختلف اور متفاوت نہیں ہوتے اور اپنے پہلے حال پر قائم رہتے ہیں۔

بہر حال اس فطری اصول کے موافق ہادئ اعظم نور مجسم ﷺ کی پیشین گوئی عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضور ﷺ نے اختلافِ امت کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ عین حق و صواب پر مبنی تھا۔

لیکن اس مقام پر جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اس دورِ اختلاف و افتراق میں حق پسند اور نجات پانے والے گروہ کا کیسے پتہ چلے اور کیوں کر معلوم ہو کہ موجودہ فرقوں میں حق پر کون ہے۔

اس حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ

فاذا رأيتم اختلافا فعليكم بالسواد الاعظم

ترجمہ: جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔

یہاں اختلاف سے مراد اصولی اختلاف ہے جس میں "کفر و ایمان" اور "ہدایت و اختلاف" کا فرق پایا جائے۔ فروعی اختلاف ہرگز مراد نہیں، کیونکہ وہ تو رحمت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں "اختلاف اُمتی رحمة" میری امت کا (فروعی) اختلاف رحمت ہے۔

اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر موجودہ اسلامی فرقوں میں اس بڑے فرقے کو تلاش کیجئے جو باہم اصولاً مختلف نہ ہو تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کو ایسا فرقہ اہلسنت و جماعت کے سوا کوئی نہ ملے گا۔ جس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، قادری،

چشتی، سہروردی، نقشبندی، اشعری، ماتریدی سب شامل ہیں، یہ سب اہلسنّت ہیں اور ان کے مابین کوئی ایسا اصولی اختلاف نہیں جس میں کفر و ایمان یا ہدایت و ضلالت کا فرق پایا جائے۔

حنفی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اختلافی مسائل میں خطا اجتہادی پر تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کے مسائل کو (خطا اجتہادی پر مبنی ہونے کے باوجود) ان کے حق میں ہدایت سے خالی نہیں سمجھتے۔ بخلاف معتزلہ، مرزائیہ، روافض و خوارج وغیرہم کے کہ ان میں بعض گروہ ایسے ہیں جو اہلسنّت کے نزدیک دائرہ اسلام و ایمان سے خارج ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ہدایت سے بے بہرہ ضلالت میں مبتلا ہیں۔

لہٰذا اس دورِ پُرفتن میں حدیث مذکور کی رو سے سوادِ اعظم و اہلسنّت و جماعت کا حق پر ہونا ثابت ہوا جیسا کہ شیخ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ انجاح الحاجہ حاشیہ ابن ماجہ میں اسی حدیث پر ارقام فرماتے ہیں۔

فهذا الحديث معيار عظيم لاهل السنة والجماعة شكر الله سعيهم فانهم هم السواد الاعظم وذلك لا يحتاج الى برهان فانك لو نظرت الى اهل الاهواء باجمعهم اثنتان وسبعون فرقة لا يبلغ عددهم عشر اهل السنة واما اختلاف المجتهدين فيما بينهم و كذالك اختلاف الصوفية الكرام والمحدثين العظام والقراء الاعلام فهو إختلاف لا يضلل احدهم الآخر الخ[1]

---

[1] ابن ماجہ ص ٢٩٢

یعنی یہ حدیث اہلسنت و جماعت (اللہ تعالیٰ ان کی
سعی کو مشکور فرمائے) کے لیے معیارِ عظیم ہے۔ بے
شک وہی سوادِ اعظم ہیں اور یہ امر کسی برہان کا محتاج
نہیں۔ تمام اہل ہوا باوجودیکہ بہتر فرقے ہیں ان کو
اگر تم دیکھو تو وہ اہلسنت کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچ
سکتے۔ رہا مجتہدین اور اسی طرح صوفیائے کرام اور
محدثین عظام اور قراء اعلام کا باہمی اختلاف تو وہ ایسا
ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کی تضلیل
نہیں کرتا۔

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ان میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق ہیں۔ نیز ارشاد فرمایا "اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ" عمل کرو اے آلِ داؤد (علیہ السلام) شکر کا اور کم ہیں میرے بندوں سے شکر کرنے والے۔

ان کے علاوہ اور آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مومن اور نیک بندے قلیل ہیں۔ اس لیے یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے۔ لہٰذا قابل قبول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مدار نجات ایمان پر ہے۔ ایمان رکھنے والوں میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو حسب استطاعت اللہ تعالیٰ کی پوری شکر گزاری کرنے والے اور کامل مومن ہوں۔

دوسرے یہ کہ جن آیتوں میں مومنین کو قلیل اور کفار کو کثیر فرمایا گیا ہے وہاں کفار سے وہ بہتر فرقے بالخصوص مراد نہیں جو مدعی اسلام ہیں بلکہ وہاں کفار سے عام

کفار مراد ہیں جن میں اسلام کے مدعی اور منکر سب شامل ہیں اور یہ امر واضح ہے کہ اسلام کے مدعی اور منکر تمام جہان کے کافروں کے مقابلہ میں سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت کو لایا جائے تو یہ ضرور قلیل ہوں گے اور وہ کفار یقیناً کثیر ہوں گے۔ لہٰذا قرآن وحدیث میں کوئی اختلاف نہیں۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرقہ ناجیہ کے متعلق فرمایا کہ "ما انا علیہ واصحابی" ناجی گروہ وہ ہے جو میرے اور میرے صحابہ کرام کے مسلک پر ہو۔ اس حدیث میں سوادِ اعظم کا ذکر نہیں۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ حدیث سوادِ اعظم والی کے خلاف نہیں بلکہ اس کو اور واضح کر رہی ہے۔ کیوں کہ "ما انا علیہ واصحابی" والی حدیث میں یہ اجمال باقی ہے کہ حضور ﷺ اور حضور کے صحابہ کے موافق کون ہے؟

۷۳ فرقوں میں سے ہر فرقہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا عقیدہ اور مذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے اس صورت میں ناجی گروہ کا پتہ نہیں چل سکتا۔ "علیکم بالسواد الاعظم" والی حدیث نے اس اجمال کو دور کر دیا اور اس امر کو واضح کر دیا کہ جتنے فرقے اس امر کے مدعی ہوں گے کہ ہمارا دین ومذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے وہ سب جھوٹے ہوں گے۔ میرے دین پر جو جماعت صحیح معنی میں قائم رہے گی وہ سوادِ اعظم ہو گی۔ لہٰذا تم سوادِ اعظم ہی کو لازم پکڑنا۔

اس مقام پر ایک اعتراض کا جواب دینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ حدیث مبارکہ میں مذکور ہے کہ میری امت میں ۷۲ فرقے ناری ہوں گے اور ایک ناجی ہوگا۔ حالانکہ اگر ان فرقوں کو دیکھا جائے جو ہمارے نزدیک ناری ہیں تو ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو چکی ہے۔ پھر اہلسنت کا وہ ایک فرقہ ہمارے نزدیک ناجی ہے اس میں بھی متعدد گروہ پائے جاتے ہیں۔ جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، علیٰ ہذا

القیاس صوفیاء کرام اور علماء متکلمین وغیرہم میں بہت سے گروہ ہیں۔ حالانکہ ہم ان سب کو ناجی سمجھتے ہیں۔ اس حدیث سے تو یہ ثابت ہے کہ ناجی فرقہ صرف ایک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں ۷۲ ناری فرقوں سے وہ فرقے مراد ہیں جو کفر و الحاد اور گمراہی و بے دینی کا سرچشمہ اور جڑ ہیں۔ اسی طرح ایک ناجی گروہ سے وہ نجات پانے والا فرقہ مراد ہے جو اسلام اور ایمان ہدایت و رحمت کا منبع اور اصل و بنیاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک جڑ سے کئی شاخیں نکلتی ہیں مگر ان کی اصل وہی جڑ ہے جس سے وہ نکلتی ہے۔ شاخوں کی کثرت سے جڑوں کی کثرت لازم نہیں آتی۔ جیسے ایک قبیلے میں کئی خاندان ہوتے ہیں اور ہر خاندان میں کئی گھر اور ہر گھر میں کئی افراد، اسی طرح گمراہی کی ۷۲ جڑوں اور ضلالت کے بہتر قبیلوں سے سینکڑوں کیا ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں بھی اگر شاخیں اور خاندان و افراد پیدا ہو جائیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی اصل اور قبیلے بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں۔ مختصر یہ کہ جس طرح گمراہی کی ۷۲ جڑوں سے سینکڑوں ہزاروں شاخیں پیدا ہو گئیں (جنہیں فرقوں میں شمار کر لیا گیا) اسی طرح ہدایت کی ایک جڑ سے کئی شاخیں پیدا ہوئیں۔ مگر یاد رکھیے ضلالت کی جڑ کی ہر شاخ ضلالت ہوگی اور ہدایت کی جڑ سے جو شاخیں نمودار ہوں گی وہ سب ہدایت قرار پائیں گے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا (عام اس سے کہ وہ جہاد جانی ہو یا مالی، جسمانی ہو یا روحانی ہو، جہاد اصغر ہو یا جہاد اکبر ہو) ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سبیل کی بجائے سُبُل فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہم انہیں اپنی راہ کی طرف راہنمائی فرمائیں گے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ ہم انہیں

اپنی راہوں کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔ معلوم ہوا کہ سبیل خداوندی ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں اور وہی ہیں جن کا مبداء اور مرکز فرقہ ناجیہ السواد الاعظم اہلسنت و جماعت ہو۔ جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی، ماتریدی، اشعری وغیرہم۔

ثابت ہوا کہ اس اختلاف و افتراق کے دور میں نجات کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ حدیث مبارکہ "علیکم بالسواد الاعظم" کے مطابق مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ اہلسنت و جماعت کو لازم پکڑ لیا جائے اور اس کے علاوہ دیگر تمام مذاہب باطلہ سے علیحدگی اختیار کی جائے۔

واللہ الموفق للھدایۃ وھو المرسل الی سبیل الرشاد

سید احمد سعید کاظمی غفرلہٗ

اظہارِ حق

از: حضرت مولانا سید احمد حبیب شاہ صاحب کاظمی
ناظم اعلیٰ مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

ماہنامہ ''قائد'' بابت محرم وصفر ۱۴۰۷ھ میں شہادت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے علماء مؤرخین کی تصریحات کی روشنی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق جو عبارتیں میں نے لکھی ہیں اور بعض احباب نے ان پر نکتہ چینی فرمائی ہے۔ حاشا وکلا ان سے میرا مقصد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توہین و تنقیص اور ان پر طعن و تشنیع ہر گز نہیں۔ کوئی مسلمان کسی صحابی رسول اللہ ﷺ کے حق میں ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

چونکہ ہمارے علماء نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض کاموں کو خطاء اجتہادی منکر قرار دیا ہے اور خطاء منکر پر انکار کرنے کی تصریح فرمائی ہے اس لئے میں نے ان امور پر محض انکار کیا ہے اور جن عبارتوں میں میں نے انکار کیا ہے وہ میری اپنی نہیں بلکہ اجلہ صحابہ کرام و علماء اعلام سے منقول ہیں۔ جیسا کہ میں جواب استفسار میں ان کے حوالہ جات نقل کر چکا ہوں۔ بایں ہمہ متعدد احباب کے اصرار کی وجہ سے میں نے ان عبارات پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ کرام میں سے جن حضرات نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خطاء اجتہادی پر شدید الفاظ و عبارات میں انکار فرمایا وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمعصر اور نفس صحابیت میں مساوی طور پر شریک اور ہم پایہ تھے اور ہمعصر و ہم پایہ بزرگوں کے آپس میں اگر اس قسم کی باتیں ہو جائیں یا ایک بزرگ سے دوسرے کی شان میں کوئی اونچ نیچ یا کمی بیشی ہو جائے تو ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان بزرگوں کے متعلق ہم بھی وہی روش اختیار کریں اور وہی الفاظ ان کے حق میں بولیں جو کسی بزرگ نے استعمال کئے ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا موسیٰ و ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ کافی ہے کہ سیدنا

موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیدنا ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سر اقدس اور ریش مبارک کے نورانی بالوں کو جلال کی حالت میں پکڑ لیا تھا، جس پر حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ۔ سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں نبی ہیں۔ لیکن اس واقعہ کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نبی کی توہین کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، نہ ان کے اس فعل کو کوئی شخص اپنے لئے دلیل جواز بنا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما یا کسی دوسرے صحابی نے اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں کوئی سخت کلمہ کہہ دیا تو نہ اس کہنے والے صحابی پر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے نہ اس کے قول کو ہم اپنے لئے دلیل جواز بنا سکتے ہیں۔ اس بناء پر باوجودیکہ ان عبارات سے میری نیت ہرگز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توہین نہ تھی، لیکن اس کے باوجود میں صدقِ دل کے ساتھ ان عبارتوں سے رجوع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کی بارگاہ اقدس میں انتہائی خشوع وخضوع اور خلوص وتضرع کے ساتھ دُعا کرتا ہوں کہ اے میرے معبودِ حقیقی! تو میری نیت کو خوب جانتا ہے۔ اپنے حبیب ﷺ کے طفیل میری اس لغزش اور غلط فہمی کو معاف فرما کر سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روح مبارک کو مجھ سے راضی کر دے، تاکہ آخرت میں تیرا یہ بندۂ عاصی تیری رحمتوں سے محروم نہ ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ اس کے بعد میں اپنے ان احباب کا شکریہ ادا کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جن کے توجہ دلانے سے میں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور بعونہٖ تعالیٰ امر حق تک پہنچ کر اسے قبول کرنے کے شرف سے مشرف ہوا۔

فجزاھم اللہ احسن الجزاء فی الدنیا والاخرۃ وصلی اللہ تعالی علی حبیبہ ورسولہ محمد المصطفی وعلی آلہ وصحبہ البررۃ التقی

فقیر سید احمد حبیب کاظمی غفرلہٗ

ناظم مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

تتمہ

از: سید احمد سعید کاظمی غفرلہٗ مدیر مسئول ماہنامہ ''قائد'' ملتان

حضرت ناظم اعلیٰ مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم نے جس انداز سے رجوع الی الحق فرمایا ہے وہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ ان کا دِل خوف وخشیت الٰہی سے معمور ہے اور وہ صحیح معنی میں علماء ربانیین کے متبع ہیں۔ ممدوح نے اس پُر آشوب دور میں سلف صالحین کی سنت کو زندہ کردیا اور جس طرح سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ ودیگر آئمہ دین واکابر ملت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے خوف خداوندی کے پیش نظر رجوع الی الحق کو اپنے لئے موجب عار نہیں سمجھا بالکل اسی طرح حضرت ناظم صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے بھی امر حق کو واضح فرمانے سے دریغ نہیں فرمایا۔ حالانکہ جس جارحانہ انداز میں موصوف پر نکتہ چینی کی گئی تھی وہ حد درجہ دلآزار تھا۔ اس نفسانیت کے دور میں یہی انداز اگر کسی دوسرے شخص کے ساتھ اختیار کیا جاتا تو وہ بمقتضائے نفسانیت اپنی ضد پر اڑ جاتا، مگر ممدوح موصوف نے ایسا نہیں کیا بلکہ ضد اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری طرح غور وخوض فرمانے کے بعد جو امر حق آپ پر ظاہر ہوا اسے بلا تامل وتردد قبول فرما کر اپنے رجوع کا اعلان فرما دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

اس کے بعد مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مولوی ابوداؤد محمد صادق صاحب کوٹلوی نے اپنے دس سوالوں کے ضمن میں جو تیسرا سوال قائم کیا ہے کہ

انفرادی رائے سے کسی کو امیر وخلیفہ منتخب کرنا اگر مطلقاً ناجائز ہے تو یہ بات قابل استفسار ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف اپنی ذاتی رائے سے خلیفہ مقرر فرمایا یا نہیں۔ بعد انتخاب سب اہل ایمان کا اتفاق کرنا اور بات ہے۔

اس میں اس امر کی تصریح ہے کہ مولوی ابوداؤد محمد صادق صاحب استخلاف فاروقی کے مسئلہ میں اس بات کے قائل ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف اپنی ذاتی اور انفرادی رائے سے خلیفہ منتخب فرمایا۔ یعنی انہوں نے دیگر صحابہ کرام، مہاجرین وانصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے کوئی مشورہ نہیں فرمایا اور کسی کی رائے معلوم نہیں کی۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر صریح اتہام ہے۔ جیسا کہ جواب استفسار کے ضمن میں حضرت ناظم صاحب نے تاریخ الخلفاء اور نبراس کی عبارات نقل فرمائی ہیں۔

مولوی محمد صادق صاحب کی اس غلط فہمی کا ایک منشا تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کتب علم کلام وغیرہ میں یہ دیکھ کر کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے بغیر مشورہ کئے صرف اپنی ذاتی اور انفرادی رائے سے خلیفہ بنا دیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ جملہ استخلف ابوبکر۔ مشورہ کے ثبوت وعدم ثبوت سے ساکت ہے اور ثبوت مشاورت کی عبارات وروایات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کا حمل اثبات ونفی دونوں پر ہوسکتا ہے لیکن جب کتب عقائد وتاریخ میں ثبوت مشاورت پر صاف اور صریح روایات منقول ہو چکیں تو اب اس کو نفی مشورہ پر حمل کر کے یہ کہنا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اپنی ذاتی اور انفرادی رائے سے فاروق اعظم کو خلیفہ منتخب فرما دیا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟

دوسرا منشاء ان کی غلطی کا یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کتب کلام وغیرہ میں یہ

دیکھ کر کہ شرعاً ثبوت امامت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک امام دوسرے کو اپنا خلیفہ بنادے۔ یہ خیال کرلیا کہ استخلاف فاروقی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صرف ذاتی اور انفرادی رائے سے عمل میں آیا اور کسی سے مشورہ نہیں ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ایک امام صرف اپنی ذاتی رائے سے کسی دوسرے کو خلیفہ بنادے اور کسی سے مشورہ نہ کرے تو اس دوسرے کی امامت وخلافت شرعاً صحیح ودرست ہوگی۔ مگر اس صحت خلافت سے یہ لازم نہیں آتا کہ مستخلف کا بغیر مشورہ کئے صرف اپنی ذاتی رائے سے خلیفہ بنانا کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ دیکھئے بعض حالات میں ایقاع طلاق شرعاً جائز نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اس کے باوجود بھی طلاق دیدے تو شرعاً اس کے ثبوت ووقوع میں بھی کوئی تردد نہیں ہوتا۔ اس قسم کے اور مسائل بکثرت ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی امام کسی کو صرف اپنی ذاتی رائے سے خلیفہ بنادے اور کسی سے مشورہ نہ کرے تو اس دوسرے کی امامت تو شرعاً ضرور ثابت ہوجائے گی مگر یہ بتائیے کہ اس مستخلف کا یہ فعل نصوص قرآنیہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کے خلاف ہوگا یا نہیں؟

مولوی محمد صادق صاحب اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ انہوں نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف اپنی ذاتی اور انفرادی رائے سے خلیفہ منتخب فرمایا۔ روافض کو بغلیں بجانے اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ارشاد خداوندی کی خلاف ورزی کا الزام لگانے کا موقع دیا یا نہیں۔ میں عرض کروں گا کہ آپ ان آیتوں کی جو تاویل بھی کریں۔ وہ آپ ہی کے لئے قابل تسلیم ہوگی۔ مخالف تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظاہر نصوص قرآنیہ کی خلاف ورزی کرنے والا ہی قرار دے گا۔

جب آپ کی کتابوں میں صاف اور واضح طور پر مذکور ہے کہ ورُوی انه

شاور جمعامن المهاجرين والانصار فی عمر رضی الله تعالی عنه فقالوا لیس فینامثله (نبراس شرح عقائد حنفی ص ۴۹۸)

تو پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ بلاوجہ اپنی کتابوں کی تصریحات وروایات سے بھی انکار کریں اور مخالفین کو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مخالفت قرآن کا الزام عائد کرنے کا بھی موقع دیں۔

اس تفصیل وتوضیح کے بعد بھی اگر مولوی محمد صادق صاحب اپنے اسی پہلے مسلک پر قائم ہیں کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اپنی ذاتی اور انفرادی رائے سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب فرمایا تو وہ اس کو دلائل سے ثابت کریں ورنہ جس طرح حضرت ناظم صاحب ممدوح نے رجوع الی الحق فرما کر اس کا اعلان فرمایا ہے، اسی طرح مولوی محمد صادق صاحب بھی اپنی غلطی کا اقرار اور اس سے رجوع کا اعلان فرمائیں اور بہتر ہو کہ جس طرح ناظم صاحب کا رجوع قائد اور رضوان میں شائع ہورہا ہے اسی طرح مولوی محمد صادق صاحب کا رجوع بھی قائد اور رضوان میں شائع ہو اور اگر انہوں نے سکوت فرمائی تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ مولوی محمد صادق صاحب دوسروں پر ہی نکتہ چینی اور غوغا آرائی کے شائق ہیں اور خود امر حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه والباطل باطلا وارزقنا اجتنابه امين بحرمة سيد المرسلين عليه وعلى اله وصحبه الصلوة والتسليم

فقیر سید احمد سعید کاظمی غفرلہٗ

مدیر مسئول ماہنامہ ''قائد'' ملتان

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ مارچ، اپریل ۱۹۵۱ء، جلد ۳، شمارہ ۲ / ۳، ص ۱۵ تا ۱۸)

مولانا مودودی صاحب کا چیلنج منظور ہے

مولانا مودودی صاحب ۹ ؍ مارچ کو جمعہ کے دِن تشریف لائے تھے اور انہوں نے باغ عام خاص میں تقریر کی تھی۔ بعض احباب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ مودودی صاحب نے ''مکالمہ کاظمی ومودودی'' کا ذِکر کرتے ہوئے اور اپنے ہی من گھڑت سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس مکالمہ کے مضامین پر میں کاظمی صاحب سے پھر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے جواب میں میری طرف سے مودودی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر واقعی آپ نے یہ فرمایا ہے تو میں تعمیل ارشاد کے لئے بہ دل وجان حاضر ہوں۔ مگر مناسب ہے کہ جس طرح آپ نے یہ اعلان مجمع عام میں فرمایا ہے اسی طرح ہماری آپ کی گفتگو بھی مجمع عام میں ہوتا کہ اس دفعہ آپ کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ سوالات وجوابات گھر میں بیٹھ کر مرتب کر لئے گئے ہیں۔

مکالمہ مذکورہ کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس میں جو گفتگو درج ہے وہ ایک شخص نے مجھ سے تبادلہ خیالات کے بعد گھر میں بیٹھ کر مرتب کر لی اور اس کا نام مکالمہ رکھ دیا، میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

یعنی یہ تمام گفتگو محض فرضی اور بے اصل ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ مکالمہ میرے ہمراہیوں کی تصدیق اور ان کے اصل دستخطوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی یہ آپ کے نزدیک خلاف واقع اور بے اصل تھا تو آپ نے وہ اصلی گفتگو شائع کر دی ہوتی جو آپ کے نزدیک صحیح اور درست تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ آپ نے محض دفع الوقتی اور عوام کو مبتلائے فریب رکھنے کے لئے یہ کہہ دیا

ورنہ آپ جانتے ہیں کہ مکالمہ میں آپ کے جوابات کی جو ترجمانی کی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے، جس کی صحت پر آپ کی کتابوں کی عبارات منقولہ بھی مہر تصدیق ثبت کر رہی ہیں جو ہم نے بحوالۂ صفحات وہاں نقل کی ہیں۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ گفتگو کی اشاعت میں مجھ سے اجازت نہیں لی گئی نہ اس مکالمہ پر میری تصدیق ہے۔ گویا مودودی شریعت میں یہ بھی ناجائز ہے کہ مسائل شرعیہ میں کسی سے گفتگو ہو تو اسے دوسرے کی اجازت اور تصدیق کے بغیر شائع کر دیا جائے۔ مودودی صاحب سے میں دریافت کرتا ہوں کہ اگر یہ صحیح ہے تو آپ کے ۹؍جنوری ۱۹۵۱ء کے سہ روزہ اخبار کوثر میں مدیر کوثر اور ضلع ملتان کے ایک ڈاکٹر صاحب کی جو طویل گفتگو ڈاکٹر موصوف کی اجازت اور تصدیق کے بغیر شائع ہوئی ہے (جس کا عنوان ''پہلی منزل'' مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی بحث ہے) اس کے متعلق آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ مدیر کوثر نے اسے پوری رنگ آمیزی کے ساتھ بڑے طمطراق سے اپنے اخبار میں شائع کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی اجازت اور ان کی تصدیق کے اظہار کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مدیر کوثر کو اپنی گفتگو شائع کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی نہ اس کی تصدیق کی ہے اور اگر مدیر کوثر کے پاس اس قسم کی کوئی اجازت اور تصدیق موجود ہے تو وہ اسے اب شائع کر دیں۔ مگر وہ بیچارے شائع کہاں سے کریں گے۔ اگر ان کے پاس کچھ ہوتا تو وہ اسی وقت گفتگو کے ساتھ اسے شائع کر دیتے، کیونکہ ایسی اجازت و تصدیق کا حاصل کرنا اسی غرض سے ہو سکتا تھا کہ گفتگو کے ساتھ اسے شائع کر دیا جائے تاکہ پڑھنے والے مطمئن ہو جائیں۔

مجھے افسوس ہے کہ مودودی صاحب دوسروں کو وعظ سنانا خوب جانتے ہیں مگر اپنے گھر کی خبر نہیں لیتے۔

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ اس مکالمہ میں جو مجھ پر ادعائے مہدویت کا الزام لگایا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ میں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ اس کے متعلق گزارش ہے کہ ایک مکالمہ کیا آپ ہماری کسی تحریر سے بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم نے آپ کو زبان سے مہدویت کا دعویٰ کرنے والا قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ مودودی صاحب نے ابھی تک اپنے مہدی ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ مگر ان کی تحریرات سے (جنہیں ہم مکالمہ میں تفصیل سے نقل کر چکے ہیں) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم کے ذہن میں اپنی مہدویت کا تصور جمانے میں کوشاں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے کارناموں کو بالکل اسی رنگ میں قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں جس رنگ میں انہوں نے امام مہدی کے کارناموں کو اپنی کتاب تجدید واحیاء دین میں ظاہر کیا ہے۔

مہدی کے دعویٰ نہ کرنے کے متعلق مودودی صاحب نے کسی جگہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں لکھا کہ وہ یقیناً دعویٰ نہیں کریں گے صرف اتنا لکھ گئے ہیں کہ

"نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا۔" (تجدید واحیاء دین ص ۳۲)

اس عبارت میں مودودی صاحب نے امام مہدی کے دعویٰ نہ کرنے پر وثوق کا اظہار نہیں کیا صرف اسے خلافِ توقع بتایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بہت سے امور خلافِ توقع بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مودودی صاحب کو قیامِ پاکستان ہی کی کونسی توقع تھی۔ پھر وہ آج خدا کے فضل سے ایک عظیم الشان حقیقت بن کر ان کے سامنے آیا یا نہیں؟

دور کیوں جائیے! اسی موجودہ دور کو دیکھ لیجئے۔ مودودی صاحب کن توقعات کو لیکر میدان انتخاب میں اترے تھے اور اب ان کے صالح نمائندوں کا کیسا

عبرتناک حشر ہو رہا ہے، جسے دیکھ کر مودودی صاحب بے ساختہ بول اٹھتے ہوں گے کہ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اسی طرح اگر امام مہدی بھی مودودی صاحب کی توقع کے خلاف اپنی مہدویت کا اعلان کر دیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

تجدید و احیاء دین میں دو عبارتیں ایسی ہیں جن سے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مودودی صاحب اس بات کے قائل نہیں کہ امام مہدی اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔ پہلی عبارت یہ ہے۔

''نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں کہ دعویٰ سے اپنے کام کا آغاز کرے۔'' (تجدید و احیاء دین ص ۳۲)

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کے سوا کسی (مجدد یا مہدی) کو کسی وقت بھی دعویٰ کرنے کا منصب حاصل نہیں بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ اپنے کام کو دعویٰ سے شروع کرنا سوائے نبی کے کسی کا منصب نہیں اور کسی مجدد و مہدی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نبی کی طرح اپنے کام کا آغاز دعویٰ سے کرے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غیر نبی (مجدد و مہدی) بغیر دعویٰ کئے اپنا کام شروع کر دے پھر آگے چل کر اپنے مجدد و مہدی ہونے کا اعلان کرے تو اس کی نفی اس عبارت سے نہیں ہوتی، ورنہ اس عبارت میں ''آغاز'' کی قید بالکل بے معنی اور مہمل قرار پائے گی۔ دوسری عبارت یہ ہے کہ

''مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھائے جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔'' (تجدید و احیاء دین ص ۳۲)

اس سے بھی یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مودودی صاحب امام مہدی کے دعویٰ کی نفی فرما رہے ہیں، صحیح نہیں۔ اس عبارت کا صاف اور صریح مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ مہدویت وغیرہ کے دعوے کرتے ہیں اور لوگ ان پر ایمان لاتے ہیں حالانکہ انہوں نے صرف دعوے ہی کئے ہیں، کر کے کچھ نہیں دکھایا، ایسے لوگ میرے نزدیک اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مودودی صاحب نے صرف دعویٰ کرنے کو علم و ذہن کی پستی پر مبنی نہیں فرمایا بلکہ وہ لمبے چوڑے دعوے کرنے کے باوجود کچھ کر کے نہ دکھانے والوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو کم علم اور پست ذہن فرما رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص دعوے تو بڑے کرتا ہے مگر کر کے کچھ نہیں دکھاتا تو اسے ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی نکما اور بے وقوف کہے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص دعوے کے ساتھ کام بھی کر کے دکھائے تو اسے کوئی بھی کم علم اور پست ذہن نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے اگر امام مہدی اپنے عظیم الشان کارناموں کے ساتھ اپنے مہدی ہونے کا اعلان بھی کر دیں تو از روئے عقل و شرع اس میں کوئی استبعاد نہیں، نہ مودودی صاحب کی یہ عبارت اس کی نفی کرتی ہے۔

آج جو لوگ کسی مصلحت کے پیش نظر مودودی صاحب کے پندار مہدویت پر پردہ ڈالنے کے لئے مذکورہ بالا عبارات سے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، میں انہیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ مودودی صاحب کی ایک عبارت ایسی پیش کریں جس میں انہوں نے وثوق کامل کے ساتھ امام مہدی علیہ السلام کے دعوے کی نفی کی ہو۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مودودی صاحب نے کسی جگہ بھی مہدی علیہ السلام کے دعوے کی نفی نہیں کی اور عبارات مذکورہ بالا میں انہوں نے اپنے حریفوں پر طنز و تعریض کے باوجود بھی (کسی وقت) اپنے دعوے کے لئے خاصی گنجائش رکھ چھوڑی ہے۔ میری اور مودودی صاحب کی جو گفتگو مکالمہ میں شائع ہوئی ہے جس نے مودودی صاحب

اور ان کے مشن کو بڑی حد تک عوام کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے اس کی اشاعت سے ایوانِ مودودیت میں کہرام مچا ہوا ہے اور مودودیوں کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ وہ میری گفتگو کو بگاڑ کر پبلک کے سامنے پیش کریں۔

دوران گفتگو میں مودودی صاحب سے مَیں نے یہ کہا تھا کہ آپ کی تجدید و احیاء دین کی عبارات سے لوگوں کے دِلوں میں یہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ آپ اپنے متعلق مجدد کامل اور امام مہدی ہونے کا گمان رکھتے ہیں۔ اس الجھن کے دُور ہونے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنی زندگی میں اپنے مہدی ہونے کا انکار فرما دیں تا کہ آپ کے بعد کوئی آپ کو مہدی نہ کہے۔

کتنا صاف اور سیدھا مطالبہ تھا۔ اگر مودودی صاحب اپنی مہدویت کا گمان نہیں رکھتے اور یہ نہیں چاہتے کہ لوگ میرے بعد مجھے مہدی کہیں تو انہیں واضح طور پر یہ کہنا چاہئے تھا کہ میں اپنی مہدویت کا گمان نہیں رکھتا لیکن اس کے جواب میں وہ یہی فرماتے رہے کہ ان شاء اللہ میں بغیر کسی دعوے کے اپنے رب کے سامنے پیش ہو جاؤں گا۔ جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ مہدی کی شان یہ ہے کہ وہ باوجود مہدی ہونے کے دعویٰ نہ کرے اور بغیر دعویٰ کئے اپنے رب کے سامنے پیش ہو جائے۔ مگر یہاں بھی ان شاء اللہ کہہ کر دعویٰ کیلئے گنجائش رکھ لی۔ جب میں نے اس بات پر زور دیا کہ آپ اپنی زندگی میں اپنے مہدی ہونے کا انکار فرمائیں تو ارشاد فرمایا کہ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ میرے بعد مجھے مہدی کہا جائے۔ مرنے والوں کے حق میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ کوئی کسی کو خدا کہہ دیتا ہے، کوئی کسی کو ولی بنا دیتا ہے، کوئی کسی کو کافر کہہ دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا جناب یہ فرمائیے کہ مرنے کے بعد کسی بندہ کو خدا کہنا یا کسی مسلمان کو کافر کہنا شرعاً ناجائز ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا قطعاً ناجائز

ہے۔ اسی طرح اگر آپ مہدی نہیں اور آپ کے بعد آپ کو مہدی کہا گیا تو یہ بھی ناجائز ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی ہی میں اپنی مہدویت کا انکار فرمادیں تاکہ آپ کے بعد آپ کے حق میں اس قسم کی ناجائز بات نہ کہی جائے۔ اس موقع پر یہ بھی عرض کردوں کہ میں نے یہ مطالبہ صرف اس لئے کیا تھا کہ مودودی صاحب نے اپنی کتاب تجدید واحیاء دین میں لکھا ہے کہ

شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کا منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ (تجدید واحیاء دین ص ۳۲)

اس عبارت میں مودودی صاحب نے واضح طور پر اس امر کی تصریح فرمادی ہے کہ مہدی کو اس کی موت کے بعد لوگ جانیں گے کہ یہ مہدی تھا۔ لہٰذا مودودی صاحب کے کارناموں کے پیش نظر اگر ان کے بعد لوگ انہیں مہدی کہنے لگیں تو اس عبارت کی رو سے ان کا یہ قول بالکل جائز اور درست ہوگا۔

ناظرین کرام! غور فرمائیں کہ جب مودودی صاحب اور ان کے ہواخواہوں سے میری اس گفتگو اور جائز مطالبہ کا کوئی معقول جواب نہ ہو سکا تو انہوں نے میری اس بات کو بگاڑ کر پبلک کے سامنے پیش کیا کہ کاظمی صاحب نے ہم سے یہ سوال کیا کہ اگر آپ کے مرنے کے بعد آپ کو مہدی کہا جائے تو آپ کیا کریں گے؟ ہم نے جواب دیا کہ مرنے کے بعد اگر کوئی ہمارے حق میں جو کچھ کہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ بکثرت مرنے والوں کے حق میں بہت کچھ کہا گیا۔ پھر انہوں نے کیا کیا۔

سبحان اللہ! کسی کے کلام میں تحریف کی مثال اس سے بہتر نہیں مل سکتی۔ دوسروں کو خدا کے خوف کی تلقین کرنے والے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ انہوں نے محض جواب سے عاجز ہونے کی وجہ سے میری بات کو کس طرح مسخ

کر کے پیش کیا ہے۔

کوئی اَن پڑھ آدمی بھی کسی سے ایسا سوال نہیں کر سکتا۔ بھلا بتائیے کہ جب آپ مر کر مٹی میں مل گئے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟ اور اس کے متعلق آپ سے کیا سوال ہو سکتا ہے؟

مودودی صاحب نے جس انوکھے انداز میں اپنی مجددیت و مہدویت کا جال بچھایا ہے اس کی پوری تفصیل تو ہم نے ''مکالمہ کاظمی و مودودی'' اور ''آئینۂ مودودیت'' کے حصہ اول و دوم میں لکھی ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ مگر یہاں صرف اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے ابھی تک اپنی زبان سے اپنی مہدویت کا اعلان نہیں کیا، مگر جو نقشہ انہوں نے امام مہدی علیہ السلام کا اپنی کتاب تجدید و احیاءِ دین میں کھینچا ہے بعینہٖ اسی نقشہ کی صورت میں اپنی ذاتِ گرامی کو پیش کر کے کم از کم اپنی جماعت کے مخصوص ارکان کے اذہان میں اپنی مہدویت کا تصور پوری طرح قائم کر دیا ہے۔ اگر اس میں کچھ کمی ہو سکتی ہے تو صرف یہی کہ باوجود سر توڑ کوششوں کے ابھی تک وہ حکومت کا تختہ الٹنے اور اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب نہیں ہوئے اور اگر خدانخواستہ وہ کبھی اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اسی وقت اس نقشہ مہدویت کی تکمیل ہو جائے گی اور مودودی صاحب کے امام مہدی ہونے میں کسی مودودی کو کسی قسم کا شک و شبہ یا تردد باقی نہ رہے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت دعویٰ کی وہ گنجائش جنہیں مودودی صاحب اب تک باقی رکھتے چلے آئے ہیں ''داشتہ آید بکار'' کے مطابق کام آئے۔

آخر میں اتمام حجت کے لئے میں پھر ایک دفعہ مودودی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اگر واقعی آپ اپنے مہدی ہونے کا گمان نہیں رکھتے تو غیر مبہم الفاظ میں اعلان فرما دیجئے کہ میں امام مہدی نہیں ہو سکتا میرے بعد کوئی شخص مجھے مہدی نہ کہے۔

مجھے سنجیدہ مودودی حضرات سے توقع ہے کہ میرے اس مطالبہ کی معنویت اور افادیت پر ٹھنڈے دِل سے غور کریں گے اور عوام کو دام تلبیس میں پھنسانے کی کوشش ترک کرنے کے ساتھ ہی انہیں امر حق کو قبول کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔

بالخصوص عام برادرانِ اسلام سے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ ان امور کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر سلف صالحین کے مسلک پر قائم رہتے ہوئے (سرزمین متنبئین و متجددین) کے اس نئے مگر خطرناک فتنہ مودودیت سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں گے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

سید احمد سعید کاظمی غفرلہٗ
ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ العلماء پاکستان

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ مارچ/اپریل ۱۹۵۱ء جلد ۳ شمارہ ۲/۳ ص ۱۰ تا ۱۴)

ہجرت کا فلسفہ

ہجرت کے معنی ہیں دارالکفر سے دارالمؤمنین کی طرف انتقال کرنا۔ یا یوں کہئے کہ جس جگہ مسلمانوں پر اہل کفر و طغیان کا ظلم و ستم حد سے گزر جائے اس جگہ سے مسلمانوں کے منتقل ہونے کو ہجرت کہتے ہیں۔

ہجرت کا ظاہری پہلو تو یہ ہے کہ مظلوم مسلمان بظاہر مغلوب و مقہور ہو کر انتہائی بے بسی اور تباہ حالی میں اپنے وطن سے نکلتے ہیں لیکن بقول شخصے ع

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پِس جانے کے بعد

مسلمان کا ترک وطن بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ ہجرت مسلم کا باطنی پہلو لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ جس مقام سے وہ مصائب و آلام کا شکار ہو کر نکلا تھا۔ ایک وقت نہایت عزت و وقار کے ساتھ اُس مقام پر واپس آتا ہے۔

ظاہر میں لوگ عموماً ہر چیز کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی قوتِ فکریہ اس سے آگے متجاوز نہیں ہوتی اور وہی ظاہری پہلو اِن کے قوائے عملیہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ لیکن مسلمان کو چاہئے کہ حقائق اشیاء کو اسلامی بصیرت سے دیکھئے تا کہ اس کی نظر غلطی سے محفوظ رہے۔

اب اس مسئلہ کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھئے۔

اسلامی تعلیمات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مقام پر مسلمان کا دشمن مسلمان کو ایسی تکلیف پہنچائے جن کی مدافعت اس سے نہ ہو سکے تو وہ

اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق اپنے نیک بندوں کو حکم دیتا ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر چلے جاؤ۔ ان کے چلے جانے پر دشمن خوش ہوتا ہے اور طبعی سرکشی کی بناء پر متکبرانہ انداز میں کہتا ہے کہ دیکھو! میں نے اپنے حریف کو کس طرح ذلیل وخوار کر کے نکالا لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ والے ذلیل نہیں ہوا کرتے۔ عزت صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔ اللہ والوں کا دشمن کے ساتھ مقابلہ میدان میں ترک وطن کا اقدام اس لئے نہیں ہوتا کہ کمزور اور مغلوب ہو کر بھاگ گئے! بلکہ مسلمان کا ترک وطن کی صورت میں ایک قدم پیچھے ہٹنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک قابل و ماہر پہلوان ٹوٹے ہوئے اپنے مقابل کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے لئے ایک دو قدم پیچھے ہٹ کر آگے آتا ہے اور آن کی آن میں اپنے حریف کو گرا کر چار خانے چت کر دیتا ہے۔ اسپرنگ جب دبتا ہے تو ابھرنے کے لئے دبتا ہے۔ مسلمان جب وطن سے نکلتا ہے تو واپس آنے کے لئے نکلتا ہے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبادو گے

ہمارے مہاجر بھائیوں کو اس حقیقت پر گہری نظر کرنی چاہئے کہ مسلمان کی ہجرت اس لئے نہیں کہ مسلمان کافروں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر نکلا ہے۔ مسلمان ذلیل ہو کر نہیں بلکہ اپنے دشمن کو ذلیل کرنے کے لئے نکلتا ہے۔

یوں سمجھئے کہ جس طرح کُشتی کے میدان میں کامیاب پہلوان اپنے مدِ مقابل کے سامنے ایک دو قدم اس لئے نہیں ہٹتا کہ مقابلہ سے بھاگ رہا ہے بلکہ اُس کا پیچھے ہٹنا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ پیچھے ہٹے بغیر اپنے حریف کو گرانے کے لئے موقع نہیں پاتا۔ ایک دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے داؤ پیچ اور قوت کے مظاہرے کے لئے ماحول پیدا کرتا ہے تا کہ اپنے مقابل کو پوری طاقت کے ساتھ زیر کر لے۔ غور سے

دیکھا جائے تو مسلمان کا ہجرت کرنا بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں وہ اتنا موقع نہیں پاتا کہ اپنی تمام مخفی قوتوں کو بروئے کار لاکر دشمن کو مغلوب کرے۔ اس لئے ترک وطن کر کے ایسی جگہ جاتا ہے جہاں دشمن کو ذلیل کرنے کا پورا پورا سامان آسانی سے مہیا کر سکے اور پوری طرح تیاری کر کے دشمن پر ایسی جست لگائے کہ اس کا خاتمہ کر کے رکھ دے۔

بے شک اللہ اس بات پر قادر ہے کہ مسلمان کو وطن میں رہتے ہوئے اتنی قوت دے دے کہ وہ ہجرت کئے بغیر اپنے دشمن کو مغلوب کر دے۔ اللہ تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ مسلمان ہاتھ بھی نہ ہلائے اور اُس کا دشمن خدا کی قدرت سے فنا ہو جائے! لیکن خدا کا یہ قانون نہیں ہے، کیونکہ وہ حکیم مطلق ہے اور ایسی باتیں جو حکمت سے خالی ہوں اس کی شان کے لائق نہیں۔

اس بیان کو ذہن نشین کرنے کیلئے ایک نظر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہجرت پر ڈالئے کہ آپ نے اور آپ کے ماننے والوں نے کس حالت میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور پھر کس شان و شوکت کے ساتھ مکہ معظمہ واپس آئے۔

الغرض مہاجرین کو چاہئے کہ اپنی ذہنیت میں یہ تبدیلی پیدا کریں کہ ہم ذلیل ہو کر نہیں نکلے بلکہ دشمن کو ذلیل کرنے کا سامان مہیا کرنے کے لئے پاکستان آئے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ انسان پہلے ایک مقصد اور ارادہ دِل میں پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کی تکمیل کے ذرائع مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مہاجرین و انصار کو باہمی تعاون کے ساتھ اس مقصد وحید کو پایۂ تکمل تک پہنچانے کے لئے ہمہ تن مصروف کار ہو جانے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہمارے کام مہاجرین و انصار کے شایانِ شان ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اصلاح حال کی طرف

متوجہ ہونے کی فوری ضرورت ہے۔اس کے بعد دولت خداداد پاکستان کی بقاء وترقی کے لئے جد و جہد اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں جان ومال سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔

آزاد قوموں کا احساس اپنے اندر پیدا کرنے اور اپنی اسلامی شان کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔اگر ہم صحیح معنی میں انصار ومہاجرین بن گئے تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم تو آسمانوں سے واپس آ کر دوبارہ وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ہمارا وطن ہم سے کتنی دور ہے؟

سید احمد سعید کاظمی امرہوی مدیر

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ جون ۱۹۵۰ء جلد ۲ شمارہ ۵ ص ۲۶/۲۷)

ہفتہ کی عید

اخبارات میں بعض علماء کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ ۲۹ رمضان المبارک کے بعد ہفتہ کے دِن جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا اور عید الفطر منائی وہ سخت گناہ گار ہیں۔ اس بیان کی اشاعت پر اکثر مسلمان جنہوں نے ہفتہ کے دِن عید منائی بہت پریشان ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ اس بیان کی روشنی میں ہمارا عید الفطر منانا شرعاً گناہ ہے یا نہیں؟ اور ہم پر قضا یا کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

مسلمانوں کے اطمینان اور مسئلہ کی وضاحت کے لئے گزارش ہے کہ علماء کا یہ بیان صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جن علاقوں میں نہ چاند دیکھا گیا نہ اس پر کوئی شرعی شہادت قائم ہوئی اور نہ ہی کوئی اور شرعی ثبوت انہیں بہم پہنچا بلکہ ان لوگوں نے محض ریڈیو یا ٹیلیفون وغیرہ کی اطلاعات یا عام افواہوں پر ہفتہ کے دِن عید منائی۔ ایسے لوگوں کے لئے شرعاً ضروری تھا کہ وہ تیس روزے پورے کر کے عید مناتے، شرعی ثبوت کے بغیر ان کا عید منانا کسی صورت میں جائز نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ان کے حق میں رمضان شریف کا مہینہ پورے تیس دِن کا تھا۔ جب انہوں نے تیس روزے پورے نہیں کئے تو ان پر ایک روزے کی قضا واجب ہے اور اکثر غیر شرعی اطلاعات اور عام افواہوں کی بناء پر محض اپنے خیال سے انہوں نے روزہ توڑ دیا تو قضا کے علاوہ کفارہ بھی واجب ہے۔

البتہ اگر کسی معتمد عالمِ دین کے فتوے پر روزہ توڑا تو صرف قضا واجب

ہوگی، کفارہ نہیں، اگر چہ وہ فتویٰ صحیح نہ ہو۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اس دن کے ایام رمضان سے ہونے میں ایک ایسا شبہ پیدا ہو گیا جو کفارہ ساقط ہونے میں شرعاً معتبر ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ غلط فتوے کا وبال مفتی کے ذمہ رہے گا اور وہ سخت گناہ گار ہوگا تاوقتیکہ سچے دِل سے شرعی توبہ نہ کرے۔

لیکن جن علاقوں میں چاند دیکھا گیا اور اس پر شرعی شہادتیں قائم ہوگئیں یا اس کے علاوہ کسی دوسرے شرعی ثبوت کی بناء پر انہوں نے عید منائی ان کے لئے علماء کا یہ بیان نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہفتہ کے دِن عید منائیں، کیونکہ شرعی ثبوت بہم پہنچ جانے کے بعد اُسے قبول نہ کرنا اور اس کے خلاف عمل کرنا بھی موجب گناہ ہے۔

الحمدللہ! علمائے مدرسہ انوار العلوم نے کسی ٹیلیفون یا ریڈیو وغیرہ کی اطلاع پر نہیں بلکہ رویت ہلال عید پر ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت لینے کے بعد ہفتہ کے دِن عید منانے کا اعلان کیا تھا جو بالاتفاق صحیح اور حق ہے اور اس میں کسی تردد کی گنجائش نہیں۔

(ماہنامہ السعید ملتان ماہ مارچ/اپریل ۱۹۶۱ء جلد ۲، ۳، شمارہ ۱۲، ۱، ص ۵۸)

اجتہاد کا حجت شرعیہ ہونا

مبادی! مقاصد کا موقوف علیہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مبادی مقاصد سے افضل ہو جائیں۔ دیکھئے! وضو نماز کا موقوف علیہ ہے، لیکن نماز سے افضل نہیں۔ اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ جس کی فضیلت پر کتاب و سنت شاہد ہے ذکر الٰہی سے افضل نہیں۔ جامع ترمذی کی حدیث میں ہے۔

عن ابی الدرداء رضی اللہ تعالٰی عنہ قال قال النبی ﷺ الا انبئکم بخیر اعمالکم وازکٰھا عند ملیککم وارفعھا فی درجاتکم وخیر لکم من انفاق الذھب والورق وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقھم ویضربوا اعناقکم قالوا بلٰی قال ذکر اللہ

(ترمذی جلد ثانی ص ۱۷۳)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتادوں جو تمہارے شہنشاہ حقیقی کے نزدیک تمہارے اعمال سے بہتر اور پاکیزہ ہو اور تمہارے مدارج بہ نسبت تمام اعمال کے زیادہ بلند کرنے والا اور راہِ خدا میں سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی بہتر ہو اور اس سے بھی بہتر ہو کہ تم اپنے دشمنوں (کفار) کے مدمقابل ہو کر ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں (یعنی جہاد)"

صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں ضرور بتائیے۔ ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا ذِکر" (جامع ترمذی)

ذِکر الٰہی کا جہاد فی سبیل اللہ سے افضل ہونا اسی لئے ہے کہ جہاد ذریعہ اور آلہ ہے۔ ذِکر الٰہی اور کلمۃ اللہ کے بلند ہونے کا جہاد کا مقصد اصلی صرف ذِکر الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ سلف صالحین نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں ان سب میں بہتر و افضل دو چیزیں ہیں۔ مسائل شرعیہ کا تحمل و تحفظ اور ان میں تفقہ و تدبر۔ حضرات محدثین کرام اور ان کے ہم ذوق علماء اعلام نے کتاب و سنت کے تحمل و تحفظ کی خدمت انجام دی اور حضرات مجتہدین عظام نے کتاب و سنت میں تفقہ و تدبر کا فرض ادا کیا۔ تحمل و تحفظ ذریعہ اور موقوف علیہ ہے تفقہ و تدبر کا۔ اصل مقصود تفقہ ہے نہ کہ تحمل و تحفظ کیونکہ کتاب و سنت کا اصل مقصد حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو سمجھنا ہے اور اسی کا نام تفقہ ہے تو بلا شبہ یہ کہنا درست ہوگا کہ تفقہ کو محض تحمل و تحفظ پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تفقہ فی الدین حاصل کر کے احکام و مسائل مستنبطہ کی تبلیغ و اشاعت کو فی الجملہ فرض قرار دیا۔

> قال اللہ تعالی فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ ۔(التوبة:۱۲۲)
>
> اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر قبیلہ سے کیوں نہیں چند لوگ نکل آتے تاکہ وہ تفقہ فی الدین حاصل کریں اور جب واپس آئیں تو اپنی قوم کو ڈرائیں۔

یہ لوگ جو کامل تفقہ فی الدین رکھنے والے ہیں شریعت مطہرہ کی اصلاح میں اہل ذِکر مجتہد اور اولوا الامر کہلاتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر

کبیر جلد ثالث ص ۲۴۵ میں آیت وَاَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے تحت ارشاد فرمایا۔

مذھبنا ان الاجماع لا ینعقد الا بقول العلماء الذین یمکنھم استنباط احکام اللہ من نصوص الکتاب والسنۃ وھؤلاء ھم المسمون باھل الحل والعقد فی کتب اصول الفقہ نقول الآیۃ دالۃ علیہ لانہ تعالی اوجب طاعۃ اولی الامر والذین لھم الامر والنھی فی الشرع لیس الاھذا الصنف من العلما لان المتکلم الذی لا معرفۃ لہ بکیفیۃ استنباط الاحکام من النصوص لا اعتبار بامرہ ونھیہ و کذالک المفسر والمحدث الذی لا قدرۃ لہ علی استنباط الاحکام من القرآن والحدیث

یہ وہی اجتہاد و استنباط ہے جس کا ذکر حدیث[1] معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں موجود ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ لمعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حین بعثہ الی الیمن بم تقضی یا معاذ قال بکتاب اللہ تعالی قال فان لم تجد قال بسنۃ رسول اللہ ﷺ قال فان لم تجد قال اجتھد برائی فقال رسول اللہ ﷺ الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب

[1]: حدیث معاذ مشہور ہے۔ دیکھو تلویح جلد ثانی مصری ص ۳۵۹ (قولہ و ایضا حدیث معاذ) فانہ مشھور یثبت بہ اصول

ویرضاہ

حضور سید عالم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو اُن سے دریافت فرمایا کہ اے معاذ! مقدمات کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا، کتاب اللہ سے! فرمایا۔ اگر تم اُس میں کوئی مسئلہ نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ عرض کیا سنت رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کروں گا! ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی بات تمہیں سنت میں نہ ملے تو اس وقت کیا کرو گے۔ عرض کیا حضور میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا! جس پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا کہ تمام تعریفیں اُس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز کی توفیق عطا فرمائی!

معلوم ہوا کہ جب کوئی مسئلہ کتاب و سنت میں منصوص نہ ہو اور قیاس و اجتہاد کی ضرورت واقع ہو تو اہل اجتہاد کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہے۔ (سید احمد سعید کاظمی مدیر)

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ مارچ ۱۹۵۰ء جلد ۲، شمارہ ۲، ص ۱۰، ۱۱)

مسائل واحکام ماہِ صیام

اور

مسائل نماز عید الفطر وصدقۃ الفطر وغیرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ مَنَّ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ بِشَھۡرِ رَمَضَانَ وَ کَتَبَ عَلَیۡھِمُ الصِّیَامَ بِرَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَرِضۡوَانَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیۡبِہٖ مُحَمَّدِنِ الَّذِیۡ سَنَّ لَنَا التَّرَاوِیۡحَ وَالصِّیَامَ وَرَضِیۡنَا فِیۡھَا وَعَلَّمَنَا الۡاَحۡکَامَ وَعَلٰی اٰلِہِ الۡکِرَامِ وَاَصۡحَابِہِ الۡعُظَّامِ۔ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ○

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے ان لوگوں پر فرض کئے گئے جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم گناہوں سے بچو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رمضان آتا ہے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

(رواہ الشیخان فی صحیحھما عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

سرورِ عالم ﷺ نے شعبان کے آخری دِن میں خطبہ فرمایا:۔

اے لوگو! تمہارے پاس عظمت والا اور برکت والا مہینہ آیا ہے۔ وہ مہینہ کہ جس میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض

کئے اور اسکی رات میں قیام (نماز پڑھنا) تطوع (سنت) قرار دیا۔ جو مسلمان اس ماہ میں نیکی کا کوئی کام کرے تو وہ ایسا ہے کہ اور کسی مہینہ میں فرض ادا کیا اور اس مہینہ میں جس نے فرض ادا کیا تو ایسا ہے کہ اور مہینوں میں ستر فرض ادا کئے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ مہینہ مواسات (مومنین کے ساتھ ہمدردی و غمخواری) کا ہے۔ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔ جو اس میں روزہ دار کو افطار کرائے تو اس میں گناہوں کی مغفرت ہے اور اس کی گردن آگ سے آزاد کر دی جائے گی اور افطار کرانے والے کو ویسا ہی ثواب ملے گا جیسا روزہ رکھنے والے کو، بغیر اس کے کہ اس کے اجر میں کمی ہو۔ ہم (صحابہ) نے عرض کی۔ یارسول اللہ (ﷺ)! ہم میں ہر شخص وہ چیز نہیں پاتا جس سے روزہ افطار کرائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ یہ ثواب ہر اس مسلمان کو دے گا جو ایک گھونٹ دودھ یا ایک خرما یا ایک گھونٹ پانی سے روزہ افطار کرائے، اور جس نے روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض سے سیراب کرے گا۔ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائے۔ یہ وہ مہینہ ہے کہ اس کا اول رحمت ہے اور اوسط مغفرت اور آخر جہنم سے آزادی ہے۔ جو شخص اپنے غلام (خادم) پر اس مہینہ میں تخفیف کرے اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن سلمان الفارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مسائل فقہیہ:

روزہ عرف شرع میں مسلمان کا بہ نیت عبادت صبح صادق سے غروب آفتاب تک اپنے آپ کو کھانے پینے و جماع سے روکنا ہے۔ عورت کا حیض و نفاس سے خالی ہونا روزہ کے لئے شرط ہے۔ (عامہ کتب فقہ)

روزہ کے تین درجہ ہیں۔ ایک عام لوگوں کا روزہ کہ یہی کھانے پینے اور

جماع سے رکنا۔ دوسرا خواص کا روزہ کہ اس کے علاوہ کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضاء کو گناہ سے باز رکھنا۔ تیسرا خاص الخاص کا کہ جمیع ماسویٰ اللہ سے اپنے آپ کو بالکلیہ جدا کر کے صرف اسی اللہ واحد قیوم کی طرف متوجہ رہنا۔ (جوہرہ نیرہ)

مسئلہ: ادائے روزہ رمضان و نذر معین و نفل کے روزوں کے لئے نیت کا وقت غروب آفتاب سے ضحوہ کبریٰ تک ہے۔ (درمختار رد المحتار) ضحوہ کبریٰ سے کچھ پہلے نیت کا وقت ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: نیت دِل کے ارادہ کو کہتے ہیں۔ البتہ زبان سے کہنا مستحب ہے۔

مسئلہ: رات میں روزہ کی نیت کی پھر اس کے بعد کھایا پیا تو نیت باطل نہیں ہوئی۔ اگر رجوع نہیں کیا تو وہی نیت باقی ہے۔ (جوہرہ) روزہ کے لئے سحری کھانا بھی نیت ہے۔ مگر جب سحری کھاتے وقت یہ ارادہ ہے کہ صبح روزہ نہیں ہوگا تو سحری کھانا نیت نہیں۔ (جوہرورد المحتار)

یوم الشک یعنی شعبان کی تیسویں تاریخ کو نفل خالص کی نیت سے وہ لوگ روزہ رکھ سکتے ہیں جو بلاتردد نفل خالص کی نیت کرنے پر قادر ہوں۔ نفل کے سوا کوئی اور روزہ اس دِن مکروہ ہے۔ (مراقی الفلاح و در المختار) بھول کر کھانا پینا روزہ، فرض و نفل میں معاف ہے۔ روزہ نہیں گیا۔ مسئلہ: بہت کمزور آدمی جو روزہ میں بھول کر کھا پی رہا ہو اسے دیکھ کر خاموش رہنے اور یاد نہ دلانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آدمی قوی ہے تو اس کو یاد دلانا واجب ہے۔ (رد المحتار)

مسئلہ: مکھی یا غبار یا دھواں حلق میں جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگرچہ روزہ دار ہونا یاد ہو۔ اگر خود قصداً دھواں پہنچایا تو روزہ فاسد ہوگیا۔ اگر روزہ دار ہونا یاد ہو خواہ کسی چیز کا دھواں ہو۔

مسئلہ: بھری سنگھی لگوائی یا سرمہ یا تیل لگوایا تو روزہ نہ گیا۔ اگر تیل یا سرمہ کا مزہ

حلق میں محسوس ہوتا ہو یا تھوک میں سرمہ کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہو جب بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (جوہرہ ردالمحتار)

تل یا تل کے برابر کوئی چیز چبائی اور تھوک کے ساتھ حلق سے اتر گئی تو روزہ نہ گیا۔ مگر جبکہ اس کا مزہ حلق میں محسوس ہوتا ہو تو روزہ جاتا رہا۔ (فتح القدیر)

مسئلہ: حقہ، سگریٹ، سگار، چرٹ پینے سے روزہ جاتا رہتا ہے۔ اگرچہ پینے والا اپنے خیال میں حلق میں دھواں نہ پہنچاتا ہو بلکہ صرف نسوار استعمال کرنے یا صرف تمباکو پان کھانے سے بھی روزہ جاتا رہے گا۔ اگرچہ پیک تھوک دی ہو۔ اس لئے کہ باریک اجزاء ضرور حلق میں پہنچتے ہیں۔

مسئلہ: جو زخم دِماغ یا شکم کی جھلی تک پہنچتا ہو اس میں دوا ڈالی۔ اگر دوا دِماغ یا شکم تک پہنچ گئی تو روزہ جاتا رہا۔ (عالمگیر)

مسئلہ: حقہ پیا یا نتھنوں سے دوا چڑھائی یا کان میں تیل ڈالا یا چلا گیا تو روزہ گیا۔ (عالمگیری)

کلی کر رہا تھا، بلا قصد پانی حلق سے اتر گیا یا ناک میں پانی چڑھا رہا تھا اور دِماغ کو چڑھ گیا، اگر روزہ دار ہونا یاد ہے تو روزہ جاتا رہا ورنہ نہیں۔ (عالمگیری)

مسئلہ: روزہ دار کو استنجا میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر استنجا کرتے وقت حقنہ رکھنے کی جگہ تک پانی پہنچ گیا تو روزہ جاتا رہا۔ (ردالمحتار)

مسئلہ: قصداً منہ بھر کر قے کی اور روزہ دار ہونا یاد ہے تو مطلقاً روزہ جاتا رہا۔ اگر اس سے کم کی تو نہیں۔ اگر بے اختیار قے ہو گئی خواہ تھوڑی یا منہ بھر کر روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (درمختار)

مسئلہ: جو شخص رمضان المبارک کو معمولی اور بے وقعت سمجھتے ہوئے بغیر عذر شرعی کے علانیہ دِن میں کھائے پئے یا ایسی بات بولے جس سے رمضان المبارک کی تحقیر ظاہر

ہوتی ہوتو وہ شخص مرتد کے حکم میں ہے۔ ایسے بد بخت کو قید کر کے اس کے شبہات کا ازالہ کیا جائے گا۔ اگر اصلاح پذیر نہ ہو اور اسی طرح مصر رہے تو شرعاً واجب القتل ہے۔

مسائل سحری

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں فرق سحری کا لقمہ ہے۔ (رواہ مسلم و ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن خزیمہ عن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سحری کھانا سنت ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہے۔ مگر نہ اس قدر کہ صبح ہونے کا شک ہو جائے۔ (عالمگیری) سحری میں اس قدر زیادہ نہ کھائے کہ سحری اور روزہ کے فوائد اور اس کی حکمتوں سے محروم ہو جائے۔ (مراقی الفلاح) افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے مگر افطار اس وقت کرے کہ غروب آفتاب کا گمان غالب ہو جائے۔ ابر کے دِن افطار تاخیر سے کرے۔ رسول اللہ ﷺ افطار کے وقت یہ دُعا پڑھتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ (رواہ ابوداؤد)

مسائل رخصت

سفر شرعی، عورت کا حاملہ ہونا، بچے کو دودھ پلانا، مرض، بوڑھاپا، اکراہ، خوف ہلاکت، خوف نقصان عقل اور جہاد یہ سب روزہ نہ رکھنے کے لئے عذر شرعی ہیں اور ان وجوہ کی بناء پر اگر کوئی شخص رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھے تو گنہگار نہیں۔ (درمختار)

مسئلہ: روزہ توڑنے کی وجہ سے اگر کسی شخص پر کفارہ لازم آجائے تو اس کی ادائیگی اس طرح ہونی چاہئے کہ اگر ممکن ہو تو ایک غلام آزاد کر دے ورنہ دو مہینے کے روزے پے در پے رکھے۔ اگر اس سے عاجز ہو تو ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر کر صبح شام کھانا کھلائے۔

تراویح

نمازِ تراویح مرد عورت کے لئے سنت موکدہ ہے۔ اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔ (درمختار وغیرہ) جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تراویح بیس رکعتیں ہیں۔ بیہقی نے بہ سند صحیح سائب ابن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ لوگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعت پڑھتے تھے اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کے عہد میں بھی تراویح اسی طرح پڑھی جاتی تھی۔ مؤطا میں یزید بن رومان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تیئیس رکعتیں پڑھتے تھے۔ بیہقی نے کہا کہ اس میں تین رکعتیں وتر کی ہیں۔

مسئلہ: تراویح میں ایک بار قرآن مجید ختم کرنا سنت ہے۔ دو مرتبہ فضیلت اور تین مرتبہ افضل ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: ہر چار رکعت پر اتنی دیر بیٹھنا مستحب ہے جتنی دیر میں چار رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ (عالمگیری وغیرہ) اس بیٹھنے میں اسے اختیار ہے کہ چپکا بیٹھے یا کلمہ طیبہ پڑھے یا تلاوت کرے یا درود شریف پڑھے یا چار رکعتیں تنہا نفل پڑھے۔ جماعت سے مکروہ ہے یا یہ تسبیح پڑھے۔

سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوتِ سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ۔

مسئلہ: تراویح مسجد میں باجماعت پڑھنا افضل ہے۔

مسئلہ: بالغین کی نمازِ تراویح نابالغ کے پیچھے جائز نہ ہوگی۔ یہی صحیح ہے۔ (عالمگیری)

اعتکاف

اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ ط

صحیحین میں حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

مسئلہ: مسجد میں اللہ کے لئے نیت کے ساتھ ٹھہرنا اعتکاف ہے۔ اعتکاف کے لئے مسجد جامع ہونا شرط نہیں بلکہ مسجد جماعت میں بھی ہوسکتا ہے۔ رمضان شریف میں آخر کے دس دِن میں اعتکاف کیا جائے۔ یعنی بیسویں رمضان کو سورج ڈوبتے وقت بہ نیت اعتکاف مسجد میں داخل ہو اور تیسویں کے غروب کے بعد یا انتیس کو چاند ہونے کے بعد نکلے۔ یہ اعتکاف سنت کفایہ ہے۔ اگر سب ترک کردیں تو سب سے مطالبہ ہوگا اور اگر شہر میں ایک نے کرلیا تو سب بری الذمہ ہوگئے۔

مسئلہ: معتکف کو وطی کرنا، عورت کا بوسہ، شہوت سے چھونا، گلے لگانا حرام ہے۔ جماع سے بہر حال اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔ معتکف کو چاہئے کہ اعتکاف کی حالت میں لغویات سے پوری طرح پرہیز کرے۔ تلاوت قرآن مجید اذکار حسنہ اور نیک باتوں میں وقت گزارے۔ بیہودہ گوئی سے اعتکاف بے نور اور بے برکت ہوجاتا ہے

عید الفطر

رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دِن کچھ کھا کر نماز کے لئے تشریف لے جاتے اور عید الاضحیٰ کو نہ کھاتے جب تک نماز نہ پڑھ لیتے۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی عن بریدۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بخاری شریف میں بروایت حضرت انس وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دِن کھجوریں جو طاق ہوتیں تناول فرما کر نمازِ عید کے لئے تشریف لے جاتے۔

مسئلہ: نمازِ عیدین میں نہ اذان ہے نہ اقامت۔

مسئلہ: نماز کا وقت آفتاب بلند ہونے سے (یعنی جس وقت سورج خوب روشن

ہو جائے حتیٰ کہ اس پر نظر ٹھہر نہ سکے) کچھ پہلے زوال آفتاب تک ہے۔

نمازِ عید کا طریقہ

نمازِ عید واجب ہے اور اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نمازِ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نیت کر کے کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے۔ پھر ثناء پڑھے، پھر کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور اللہ اکبر کہتا ہوا ہاتھ چھوڑ دے پھر ہاتھ اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دے، پھر ہاتھ اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے۔ یعنی پہلی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے اس کے بعد دو تکبیروں میں ہاتھ چھوڑے پھر چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے۔ پھر امام اعوذ اور بسم اللہ آہستہ پڑھ کر جہر کے ساتھ الحمد اور سورۃ پڑھے۔ پھر رکوع کرے اور دوسری رکعت میں الحمد اور سورۃ کے بعد تین بار کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ نہ باندھے۔ پھر چوتھی بار بغیر ہاتھ اٹھائے اللہ اکبر کہتا ہوا رکوع میں جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ عیدین میں زائد تکبیریں چھ ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے اور تکبیر تحریمہ کے بعد اور تین دوسری رکعت میں قرأت کے بعد اور تکبیر رکوع سے پہلے یہ چھ تکبیریں زائد ہیں۔ ان میں ہاتھ اٹھائے جائیں گے۔

مسئلہ: ہر دو تکبیروں کے درمیان بقدر تین تسبیح سکتہ کریں۔ نمازِ عید کے بعد امام خطبہ مسنونہ پڑھے گا جس میں لوگوں کو احکام عید سنائے گا۔ بعض لوگ خطبہ سننے سے پہلے چلے جاتے ہیں وہ تارک سنت ہونے کی وجہ سے گنہگار ہوتے ہیں۔ جس قدر نمازی ہیں خواہ ان کو خطبہ کی آواز پہنچے یا نہ پہنچے اختتام تک بیٹھا رہنا سب کے لئے ضروری ہے۔ جو لوگ امام کے قریب ہیں ان کے لئے حق شرع یہ ہے کہ خطبہ سنیں اور جو دور ہیں ان کے لئے حق شرع یہ ہے کہ خاموش رہیں۔

مسئلہ: عیدگاہ میں نمازِ عید سے پہلے نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ (درمختار)

مسئلہ: نمازِ عید ہو جانے کے بعد بعض لوگ عیدگاہ میں جماعت کے ساتھ نمازِ عید پڑھتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا جائز نہیں۔ انہیں چاہئے کہ نمازِ عید کے وقت میں جہاں عید نماز نہ ہوئی ہو اور شرعاً وہاں نمازِ عید جائز بھی ہو امام کے ساتھ با جماعت نماز ادا کریں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو استحباباً صلوٰۃ ضحی کی طرح چار نفل تنہا پڑھ لیں مگر یہ نفل نمازِ عید کی قضا یا اس کے قائم مقام نہ ہوں گے۔ (درمختار)

شش عید کے روزے

طبرانی اوسط میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، فرمایا حضور ﷺ نے جس نے رمضان کے روزے رکھے اور ان کے بعد شوال میں چھ روزے رکھے تو وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو گیا جیسا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

صدقۂ فطر

ترمذی شریف میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا کہ مکے کے کوچوں میں اعلان کر دے کہ صدقہ فطر واجب ہے۔

مسئلہ: صدقۂ فطر واجب ہے اور اس کا وقت تمام عمر ہے یعنی عمر میں جس وقت بھی دے گا شرعاً ادا مانا جائے گا نہ قضا۔

مسئلہ: صدقۂ فطر کا ادا کرنا نمازِ عید سے پہلے مسنون ہے۔

مسئلہ: عید کے دن صبح صادق ہوتے ہی صدقہ فطر ہر مسلمان آزاد مالک نصاب پر اپنی طرف سے اور اپنی چھوٹی اولاد اور غلاموں کی طرف سے واجب ہوتا ہے۔

مسئلہ: صدقۂ فطر کی مقدار یہ ہے کہ گیہوں یا اس کا آٹا یا ستو نصف صاع یا کھجور یا

منقی یا جو یا اس کا آٹا یا ستو ایک صاع (درمختار)
مسئلہ: گیہوں یا جو دینے سے ان کا آٹا دینا افضل ہے اور اس سے افضل ہے کہ قیمت دے دے خواہ گیہوں کی قیمت دے یا جو یا کھجور کی۔ نفع فقیر کا خیال رکھنا چاہئے مگر گرانی میں ان چیزوں کا دینا قیمت سے بہتر ہے۔
مسئلہ: صدقہ فطر کا مصرف وہی ہے جو زکوۃ کا مصرف ہے۔ جہاں زکوۃ صرف کرنا جائز نہیں وہاں صدقہ فطر صرف کرنا بھی جائز نہیں۔
(مدیر مسئول)
(ماہنامہ السعید ماہ مارچ ۱۹۶۰ء، جلد ا، شمارہ ۱۸، ص ۱۲ تا ۱۵/ ۳۴)

احکام عیدالاضحیٰ وقربانی

(١) نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرھویں کی عصر تک ہر فرض و باجماعت کے بعد تکبیر تشریف باآواز کہنا واجب ہے۔

(٢) جس شخص پر قربانی واجب ہو اُس کو چاہئے کہ نمازِ عید تک نہ سر منڈائے، نہ خط بنوائے، نہ ناخن ترشوائے۔ عیدالاضحیٰ کے دِن نمازِ عید سے پہلے کچھ نہ کھائے۔ غسل کر کے اچھے ستھرے نئے یا دُھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ خوشبو لگائے اور ایک راہ سے باآواز بلند تکبیر تشریق پڑھتا ہوا عیدگاہ جائے۔

تکبیر: اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

ترکیب نماز

نیت: نیت کرتا ہوں میں دو رکعت نماز واجب عیدالاضحیٰ مع چھ تکبیروں کے واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا طرف کعبہ شریف کے، پیچھے اس امام کے۔ پھر امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہہ کر ہاتھ باندھ لے اور سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ پڑھ کر امام کی تکبیر کے ساتھ کانوں تک ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری تکبیر کہے ہر دو تکبیروں کے درمیان ہاتھ چھوڑ دے۔ پھر امام صرف اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ آہستہ اور الحمد و سورۃ بالجہر پڑھے۔ پھر رکوع اور سجود کرے۔ پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو کر پہلے الحمد و سورۃ پڑھے۔ پھر رکوع سے پہلے رکعت اولیٰ کی طرح تین بار کانوں تک ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہے اور ہاتھ نہ باندھے۔ چوتھی بار بغیر ہاتھ اٹھائے اللہ اکبر کہتا ہوا رکوع میں جائے۔ دونوں رکعتوں میں تین تین تکبیریں کہنا واجب ہے۔ جو شخص امام کے تکبیریں

کہہ لینے کے بعد شامل ہو تو وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر تکبیر رکوع کہتا ہوا رکوع میں جائے اور بحالت رکوع تین تکبیرات واجبہ کہہ لے (تسبیحات رکوع چھوڑ دے) رفع یدین کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے رکوع میں ایک یا دو تکبیریں کہی تھیں کہ امام نے رکوع سے سر اٹھالیا تو باقی تکبیریں ساقط ہو جائیں گی اور اگر کوئی شخص دوسری رکعت میں ایسے وقت شامل ہوا کہ امام بعض تکبیریں کہہ چکا ہے تو یہ شخص صرف بقیہ تکبیریں امام کے ساتھ کہے۔ جب فوت شدہ رکعت پڑھنے کھڑا ہو تو پہلے قرأت کرے اور بعد میں تکبیریں کہے۔ سلام کے بعد مذکورہ بالا تکبیر تشریق سب نمازی بلند آواز سے کہیں۔ بعد نماز امام خطبہ پڑھے اور سب لوگ اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے خطبے سنیں۔ بعد خطبہ و دعا باہمی معانقہ جائز ہے۔ مگر بدمذہب اور امرد محل فتنہ سے بچیں۔

احکامِ قربانی:

ہر مسلم و بالغ مرد و عورت پر جو مقیم و مالک نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کا مالک ہو قربانی واجب ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس سونا چاندی دونوں ہیں مگر ہر ایک مقدار نصاب سے کم ہے لیکن دونوں کی قیمت کا حساب لگایا جائے تو ایک نصاب سونے یا چاندی کا پورا ہو جائے تو وہ شخص صاحب نصاب ہوگا اور اس پر قربانی واجب ہوگی۔ قربانی کے لئے مال پر سال گزرنا ضروری نہیں۔ قربانی کا وقت شہری کے لئے بعد نماز عید ہے اور دیہات والوں کے لئے دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے اور آخری وقت سب کے لئے بارھویں کے غروب آفتاب تک ہے۔ بارھویں کے غروب آفتاب کے بعد قربانی فوت ہو جائے گی۔ اس صورت میں مالک نصاب پر قربانی کے جانور کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے اور اگر غیر مالک نصاب نے بہ نیت قربانی جانور خریدا تھا اور وہ آخر وقت تک قربانی نہ کر سکا تو

اس پر اس خریدے ہوئے جانور کا بعینہٖ صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ قربانی کے تین دِنوں میں سب سے افضل پہلا دِن ہے۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا اور درمیانی دو راتوں میں بھی قربانی ہوسکتی ہے۔ مگر بکراہت قربانی کے جانور اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، دُنبہ ہیں۔ (سب کے سب نر ہوں یا مادہ) ان کے سوا کسی دوسرے جانور کی قربانی درست نہیں۔ خصی کی قربانی افضل ہے۔ قربانی کا جانور تندرست سالم الاعضاء ہونا ضروری ہے۔ بیمار، لاغر جو مذبح تک نہ جاسکتا ہو۔ لنگڑا، اندھا، کانا ہو یا اس کا کان، ناک، دُم، سینگ، تھن وغیرہ کوئی عضو تہائی سے زیادہ کٹا ہوا ہو، یا اُس کے دانت سرے سے پیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ یا بھیڑ، بکری کا ایک تھن اور گائے بھینس وغیرہ کے دو تھن نہ ہوں یا علاج سے ایسے خشک کر دیئے گئے ہوں کہ دودھ نہ اتر سکے تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں۔ اونٹ، گائے، بھینس کی قربانی میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں۔ مگر ان کی خریداری کے وقت شرکت کی نیت ہونی چاہئے۔ بغیر نیت شرکت مکروہ ہے۔

قربانی کے جانور کی عمر

اونٹ پورے پانچ سال کا، گائے بھینس پورے دو سال کی، بھیڑ بکری پورے ایک سال کی ہو۔ دُنبہ ایسا فربہ جو یک سالہ عمر والے دُنبوں میں مل جانے پر دور سے ایک سالہ معلوم ہو۔ چھ ماہ کی عمر تک کا جائز ہے۔ اس سے کم عمر کی قربانی جائز نہیں۔ قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا افضل ہے۔ خود بخوبی نہ کر سکے تو دوسرا کر سکتا ہے۔ مگر اجازت ضروری ہے اور سنت یہ ہے کہ اپنے سامنے قربانی کرائے۔ جانور کو بھوکا پیاسا نہ رکھا جائے، نہ ایسے کو ذبح کیا جائے۔ جانور کے سامنے چھری تیز نہ کریں۔ نہ اسے ایک دوسرے کے سامنے ذبح کریں۔ جب تک سرد نہ ہوجائے کھال نہ اُتاریں۔

ذبح کرتے وقت بہتر ہے کہ یہ دُعا پڑھیں۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ جانور کو قبلہ رو بائیں پہلو پر لٹائیں، اور اپنا داہنا پاؤں اُس کے شانہ پر رکھ کر اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ کر تیز چھری سے ذبح کریں۔ ایسا گہرا ذبح نہ کریں کہ چھری گردن کے مہرے تک اتر جائے۔ اگر کوئی دوسرا شخص جانور کو پکڑے رہے تو بہتر ہے وہ بھی تکبیر کہے۔ اپنا جانور ذبح کرنے والا یہ دُعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِیْلِكَ اِبْرَاهِیْمَ وَحَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ دوسرے کا جانور ہو تو مِنِّیْ کی بجائے مِنْ کے بعد اس کا نام لے۔ چرمِ قربانی یا اس کی قیمت کا کوئی جزو اجرتِ قصاب میں دینا یا قربانی کے جانور کی قیمت میں مُجرا (منہا) کرنا حرام ہے۔ گوشت کے تین حصے برابر کرنا بہتر ہے۔ ایک اپنا، ایک اعزا و احباب کا، ایک فقراء و مساکین کا، فقراء و مساکین کا حصہ پورا تہائی تول کر علیحدہ کر لیں تو بہتر ہے۔ قربانی کے لئے اگر دودھ والا جانور خریدا ہے تو اس کا دودھ خود استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر مالک نے خود پیا ہے تو اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اسی طرح مینڈھے و دُنبہ کے اون کو قربانی کرنے سے پہلے اپنے کام میں لانا بھی ناجائز ہے۔ اُون کٹوائی ہو تو اس کا یا اُس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

(نوٹ:) جس بکری، بھیڑ اور دُنبے کے پیدائشی دُم نہیں ہوتی اس کی قربانی جائز ہے۔

(ماہنامہ السعید ماہ جون ۱۹۶۰ء، جلد ۲، شمارہ ۳، ص ۴۲/۴۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشرہ کی خرابی اور علماء کا فرض

ناظرین کرام آپ نے میرے اس مضمون کا عنوان ملاحظہ فرمالیا، میں سب سے پہلے معاشرہ کی تعریف اوران امور کی ترتیب طبعی بیان کروں گا جن کے ساتھ انسانی معاشرہ کی کڑیاں ملتی ہیں۔ پھران کی ضروری تفصیلات عرض کر کے فساد معاشرہ کے اسباب و علل پر کلام کروں گا۔ اس کے بعد معاشرہ کی اصل خرابیاں بتا کر علماء کے فرائض منصبیہ بیان کروں گا۔ امید ہے آپ حضرات غور سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

افرادِ انسانی کا مل جل کر زندگی بسر کرنا معاشرہ کہلاتا ہے۔ زندگی کے کچھ اغراض و مقاصد ہیں اوران اغراض و مقاصد کے تحت ضروریات کی تکمیل مقاصد میں جو ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریق کار ہوتا ہے اور ہر طریق کے لئے کچھ اصول وضوابط جن کی قدروں پر مقاصد کی اقدار قائم ہوتی ہیں، یہی اقدار، معاشرہ کے حسن و قبح کا معیار اوراس کی برائی بھلائی کا مناط و مدار کہلاتی ہیں۔

تخلیق و ایجاد کے اغراض و مقاصد

کوئی موجد جب کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کے ذہن میں مقصد ایجاد ہوتا ہے۔ اپنے علم و ارادہ کے مطابق اس کا متعین کرنا اسی کا کام ہے۔ کسی

دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کی صنعت وایجاد کی غرض وغایت کے بارے میں دخل اندازی کرے، جب مقصد ایجاد میں غیر موجد کا دخل نہیں تو ضروریات وطریق کا اور اس کے اصول وضوابط میں شرکتِ غیر کا تصور کیونکر پیدا ہوسکتا ہے اور اگر اس کے برخلاف غیر موجد نے مقصد ایجاد اور اس کے ماتحت ضروریات اور ان کے طرق کار کے قواعد وضوابط میں دخل دیا تو ان کی اقدار میں خلل واقع ہوگا، جو انسانی ایجاد کی تقدیر پر معاشرہ کا اصل معیار ہیں۔

تخلیق اِنسانی کا مقصد عظیم

چونکہ انسان کا خالق وموجد اللہ تعالیٰ ہے اس لئے اس کا مقصد تخلیق بھی صرف اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ میں ہونا چاہئے جس کی تعیین کا حق اسی کے لئے محفوظ ہونا ضروری ہے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ انسان کی پیدائش اور اس کی حیات وبقا کے مقصد کی تعیین میں دخیل ہو یا اس کی ضروریات کے طریق کار اور اس کے قواعد وضوابط میں خدا تعالیٰ کے خلاف اپنے علم وارادہ کو دخل دے۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسانی کا مقصد متعین فرمادیا (کہ میں نے انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) اس کی انسانی ضرورتوں کے تمام طریق کار اور ان کے جملہ اصول وضوابط انبیاء علیہم السلام اور شرائع واحکام کے ذریعے واضح فرما دیئے، اُن میں خلل اندازی یقیناً انسانی معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوگی۔

انسانی معاشرہ کا قوام

اس میں شک نہیں کہ خالقِ کائنات نے ہر چیز کے مقصد تخلیق کی جھلک اس کے حالات وکیفیات اور اوصاف وخصوصیات میں پیدا کر دی ہے، لیکن اس کو بالکل

صحیح طور پر سمجھ لینا عقل سلیم کا محتاج ہے جس کا سرچشمہ صرف نبوت و رسالت ہے۔ لہٰذا انسانی معاشرہ کا قوام اس کے فطری تقاضوں کی بنیاد پر صرف تعلیمات نبوت کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے، اس کے بغیر اس کی صحیح تشکیل بالکل ناممکن ہے۔

انسان دست قدرت کا وہ شاہکار ہے جس کے دامن میں حقائقِ کائنات کی تمام لطافتیں پائی جاتی ہیں وہ خلافت ربانی کا حقدار عزت و کرامت کا تاجدار اور احسن تقویم کا علمبردار ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا سب سے پہلا فطری تقاضا اُنس ہے جو اجتماع کو چاہتا ہے اور اجتماعیت ہی معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے۔ گویا معاشرتی یا تمدنی زندگی انسانی فطرت کا اولین تقاضا ہے جس کی بنیاد پر اس کی حیات و بقا کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر اس کی حدود میں انسان کی عزت و کرامت محفوظ نہ رہے تو اسے حیوانی خواہشات کے پورا ہونے کا طریقہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن انسانی معاشرہ وہ کسی صورت میں نہیں کہلا سکتا۔

اجتماع بر بنائے ضرورت ہوتا ہے اور ہر ضرورت مند کی ضرورتیں اس کے حسب حال پیش آتی ہیں۔ انسان کی جامعیت کے پیش نظر اس کے دامن خواہشات کی وسعتوں کا حال ظاہر ہے اور اس کی ضرورتوں کے میدان کا وسیع تر ہونا بھی اظہر من الشمس ہے، ضرورت کی بنا پر اجتماع کا ترتب اور اجتماع کی وسعتوں کے پیش نظر معاشرہ کا پھیلاؤ ایک لازمی اور بدیہی امر ہے۔

معاشرہ کی ابتدا گھریلو زندگی سے ہوتی ہے، ایک گھر میں ماں، باپ، میاں، بیوی، بہنیں، بھائی، بیٹا، بیٹی، خادم، خادمہ کا رہنا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے حسب حال تعلقات قائم ہونا، ہر ایک کے حقوق کی نگہداشت اور ایک دوسرے کے اجتماع سے ہر فرد کی متعلقہ ضرورتوں کا پورا کرنا اور پھر ان تمام ضرورتوں کا اس مقصد تخلیق کے ماتحت ہونا نہایت ضروری ہے جس کا تذکرہ ابتداءً کیا جا چکا ہے اور قرآنی

اصطلاح میں اس کا نام عبادت ہے۔ اس مقصد تخلیق کے بغیر ضرورتوں کا انقضاء باطل ایسا ہوگا جیسے سر کے بغیر جسم اور اصل کے بغیر فرع کا وجود ہو۔

انسانی زندگی کے اجتماع کا دوسرا مرحلہ گھریلو زندگی اور تدبیر منزل سے نکل کر ہمسایہ تعلقات سے شروع ہوتا ہے اور ہمسائیگی کے قرب و بعد سے اس کے مراتب میں تفاوت نمایاں ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ شہر کی پوری آبادی کو اپنے احاطہ میں لینے کے بعد دوسرے مرحلہ سیاست مدنیہ سے تیسری منزل (سیاست ملکی) تک جا پہنچتا ہے اور پھر ملک سے آگے چل کر علی الترتیب اقوامِ عالم سے جاملتا ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اس وسیع اجتماع کی بنیاد انسانی ضرورتیں ہیں اور چونکہ انسان خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اپنی ضرورتیں اپنے شایانِ شان رکھتا ہے اس لئے اس کی عظیم ضرورتوں کی بنیاد پر جب اس کے وسیع تعلقات کا پھیلاؤ ہوگا تو اس کے نظامِ زندگی میں انسانی طبقات کی تشکیل ان کے مختلف کارناموں کی تجدید اور ان کے مطابق انسانی طبقات کی ذہنیت اس کے تاثرات اور اس کے ماتحت انسانی اخلاق و اعمال تہذیب و تمدن کا ایک وسیع ترین نظام برپا ہوگا۔

ہر اجتماعی اور ترکیبی نظام کا حسن و قبح، صلاح و فساد اجزاء ترکیبیہ کی صحیح ترکیب پر موقوف ہے اور ترکیب صحیح دو چیزوں کے بغیر ممکن نہیں۔ سب سے پہلے اجزاء ترکیبیہ کا قابل ترکیب ہونا، دوسرے اصول ترکیب کے مطابق ایک جزو کو دوسرے جزو سے جوڑ دینا۔ یہ ترکیب ان ہی ضوابط کے تحت ہوگی جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور جن کا وجود انقضاء ضرورت کے طریق کار کے لئے لازمی ہے۔

اس مقام پر یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ طریق کار اور اس کے اصول میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور طریق کار چونکہ انقضاء ضرورت کے لئے ہیں اس

لئے ان دونوں کا بھی ایک دوسرے کے مناسب ہونا لابدی ہے، پھر ضرورت اصل مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ لہٰذا مقصد وضرورت کا ہم آہنگ ہونا بھی لازمی امر ہے۔

بیان سابق کا اجمال جن تفصیلات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اس کا خاکہ حسب ذیل ہے۔ تہذیب[1] اخلاق۔ تدبیر[2] منزل۔ سیاست[3] مدنیہ۔ سیاست[4] ملکیہ۔ بین الاقوامی[5] تعلقات۔ ان پانچ عنوانات کے تحت انسانی معاشرہ کا پورا نظام ہے جس میں حقوق اللہ، حقوق العباد سب داخل ہیں۔ اسی کے ذیل میں تمام انسانی کردار اور اس کے جملہ متعلقات شامل ہیں۔ تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، مزدوری، ملازمت، حکومت، سیاست کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی اور اس کا پورا اجتماعی نظام اس کے مقصد تخلیق کے ماتحت ہے، جس کی تعیین کا حق اس کے خالق وموجد کے سوا کسی دوسرے کو نہیں۔ اس کی تکمیل کے لئے تمام ضروریات اسی مقصد کے ماتحت ہوں گی۔ ضروریات کے پورا کرنے کا طریق کار اور اس کے اصول وضوابط کی تدوین وترتیب کا حق بھی اسی خالق وموجد کے لئے محفوظ ہوگا۔ مختصر یہ کہ انسانی معاشرہ کی بہتری کا دارومدار اسی ترتیب پر ہے۔ انسان کے نظام حیات اور اس کے معاشرہ میں اگر یہ ترتیب باقی نہ رہے تو یقیناً اس میں فساد رونما ہوگا، موجودہ معاشرہ کی تمام برائیاں اسی طبعی ترتیب کے فقدان کے باعث ہیں جس کا مختصر بیان ذیل کی سطور میں ملاحظہ کریں۔

مقصد تخلیق کا انکار یا اس سے تغافل، یا اپنی طرف سے اس کی غلط تعیین ضررتوں کو اصل مقصد سے غیر متعلق کر دینا اور ان کو پورا کرنے کے طریق کار کے اصول وضوابط سے جہالت یا اس میں ردوبدل یہی چیزیں معاشرہ کی خرابی کا موجب ہیں۔ موجودہ دور میں فساد معاشرہ کے ان تمام اسباب وعلل کا سنگ بنیاد یہ امر ہے کہ مفسد اور مضر عناصر نے اپنی بداعتدالیوں سے انسانی طبقات کے فطری اعتدال میں

ایسا خلل پیدا کر دیا ہے جس کے اثرات سے ہر طبقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوا اور اس کے تاثرات لازمی طور پر فساد معاشرہ کے اسباب وعلل پر منتج ہوئے۔ جہالت، رشوت، ظلم و تعدی، سود خوری، مکاری، دغا بازی، حق تلفی، کذب و افترا، چوری، شراب خوری، قمار بازی، زِنا، لوٹ کھسوٹ اور ہر قسم کے عیوب و نقائص و بداخلاقیاں اسی فطری اعتدال کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

ان تمام خرابیوں کا انسداد اور معاشرہ کو صحیح معیار پر لانا اصلاحِ افراد کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ معاشرہ کی اصل اجتماع ہے اور اجتماع کی اصل افراد، لہٰذا افراد کی درستی کے بغیر معاشرہ درست نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں حکومت ارباب اقتدار لیڈران قوم، امراء علماء سب کے ذمہ الگ الگ فرائض عائد ہوتے ہیں، لیکن چونکہ میرے مضمون کا تعلق صرف علماء کے فرائض سے ہے اس لئے میں بادل ناخواستہ سب سے قطع نظر کر کے صرف علماء کرام کے فرض منصبی پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

یہ حقیقت نا قابل فراموش ہے کہ ہر طبقہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اصلاح معاشرہ میں کوشاں ہیں۔ چنانچہ علماء کے طبقہ میں بھی باخبر حضرات اپنی بساط کے موافق اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل نہیں، اگر ایک طرف وہ خالص دینی اور اسلامی عصبیت لئے ہوئے عقائد اسلامیہ اور مسائل مذہبیہ کے تحفظ کی خاطر دین و مذہب کے دشمنوں سے برسر پیکار ہیں تو دوسری طرف معاشرہ کی خرابیوں اور مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کی برائیوں کے خلاف بھی وہ مصروف جہاد ہیں لیکن چونکہ اس فرض میں دوسرے گروہ بھی علماء کے ساتھ برابر کے شریک ہیں اس لئے جب تک پوری مشینری کام نہ کرے اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

ہاں! اس میں بھی شک نہیں کہ غفلت شعار علماء کے گروہ نے اپنے لئے ایک محدود دائرہ عمل اختیار کر لیا ہے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات کا ایک جزو خاص ان کے

پیش نظر ہے، چند مخصوص عقائد اور مخصوص طریق ہائے عبادت اور بعض فقہی مسائل ان کے دین اور علم دین کا کل سرمایہ ہیں، انہوں نے قرآن وحدیث کو چند وقتی معلومات کا مجموعہ قرار دے کر ان ہی میں سارے دین کو منحصر سمجھ لیا جس کی وجہ سے ان میں ایک خاص قسم کا تعصب پیدا ہو گیا اور اس کی وجہ سے وہ تنگ نظری کا شکار ہو کر رہ گئے۔ نہ دین کی وسعتوں کا تصور اُن کے ذہن میں آیا نہ دنیا کے حالات سے باخبر ہوئے۔ اس کمی کے باعث وہ بصیرت نظر اور وسعتِ نگاہ سے یکسر محروم ہو کر رہ گئے۔

مذہبی عقیدت اور تنگ نظری مسلمانوں میں فسادات کا سبب ہوئی۔ مذہبی جھگڑوں کا دروازہ کھل گیا۔ مختلف الخیال لوگ مذہبی مسائل میں ایسے الجھے کہ جدال و قتال تک نوبت پہنچی اور معاشرہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔

ایسے علماء کا اولین فرض ہے کہ وہ دین کی وسعتوں کو اپنے سامنے لائیں اور مقصد تخلیق انسانی سے اپنے اذہان کو آشنا کرتے ہوئے اپنے دِل میں اس امر کا احساس پیدا کریں کہ دین چند مخصوص طرق عبادت میں منحصر نہیں بلکہ انسان کی تمام زندگی اس کے سارے حالات اور کل معاملات میں دین کا دخل ہے، کتاب وسنت کی پوری تعلیمات کو پیش نظر رکھیں، دنیا کے حالات سے باخبر ہوں، معاشرہ کی خرابیوں اوران کے اسباب وعلل کا گہری نظر سے جائزہ لیں اور اپنے دائرہ عمل کو وسیع کریں۔

پوری ہمت وبصیرت کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اسلامی معاشرہ کو اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ نمایاں کریں اور عوام کو جن کی عقیدتوں کا دامن ان کے ساتھ وابستہ ہے اس طرف لانے کی سعی بلیغ فرمائیں، اپنے طرزِ تعلیم اور اندازِ تقریر وتحریر کو بدل دیں اور اپنی بے جا عصبیت اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر فراخدلی اور اسلامی رواداری سے معاشرہ کی اصلاح کریں۔

اصلاحِ معاشرہ کیسے ہو......!

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں جہاں بھی مذہبی طاقت کو کمزور کر کے صرف قانونی جبر سے اصلاح معاشرہ کی کوشش کی گئی سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔اس سلسلے میں ہمارے سامنے امریکہ کی مثال موجود ہے جہاں اس بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں شراب نوشی کے خلاف ایک عظیم مہم چلائی گئی۔ امریکہ کی اینٹی سیلون لیگ نے تحریروں، تقریروں اور تصویروں کے ذریعے بڑے وسیع پیمانے پر شراب کے نقصانات امریکی قوم کے ذہن نشین کرانے شروع کئے۔ اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق ١٩٢٥ء تک اس مہم پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر خرچ کئے گئے اور اس اُمّ الخبائث کے خلاف جو تحریریں شائع کی گئیں وہ تقریباً ٩/ارب صفحات پر مشتمل تھیں۔

١٩٢٠ء میں امریکی حکومت بھی باقاعدہ طور پر اس مہم میں شریک ہو گئی اور پورے ملک میں قانونِ تحریم شراب نافذ کر دیا گیا۔ یہ قانون دسمبر ١٩٣٣ء تک نافذ رہا۔امریکی محکمہ عدل کے اعداد و شمار کے مطابق اس قانون کی تنفیذ کے سلسلے میں دو سو آدمی ہلاک ہوئے۔ پانچ لاکھ چونتیس ہزار تین سو پینتیس آدمیوں کو قید کیا گیا۔ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرمانے کئے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کی مالیت کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور قومی خزانے سے اس قانون کی تنفیذ پر ٦٥ کروڑ پونڈ کے لگ بھگ اخراجات ہو گئے۔

محض قانون کے بل بوتے پر معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کی شاید دُنیا میں یہ سب

سے بڑی کوشش تھی جس میں قانونی جبر کو پوری قوت سے بروئے کار لایا گیا مگر نتیجہ اُلٹا نکلا۔ شرابیوں کی تعداد پہلے کی نسبت دس گنا بڑھ گئی۔ خفیہ بھٹیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ آخر امریکی حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور دسمبر ۱۹۳۳ء میں قانون تحریم شراب ختم کر دیا گیا۔

یہ حال تو تھا مذہب کے بغیر صرف قانون سے اخلاقی اصلاح کی تحریک کا۔ اب سنیئے مذہب کی بنیادوں پر اخلاقی اصلاح کا حال عہدِ رسالت کے ابتدائی سالوں میں شراب حرام نہ ہوئی تھی اِس لئے مسلمان بھی شراب پیتے تھے مگر ان کے سینے اپنے مذہبِ برحق دینِ اسلام کے جذبے سے لبریز تھے اور ان کے قلب ونظر اسلام کے نور سے منور تھے چنانچہ تحریم شراب کے متعلق خدا کا فرمان نازل ہوا:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝"

(المائدۃ: ۹۰، ۹۱، ۹۲)

"اے ایمان والو! شراب، جوا، اور پانسے گندا شیطان کا کام ہے اس سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ شراب اور جوئے کے

ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو کیا تم باز آؤ گے (یا نہیں) اور خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور باز آ جاؤ۔ اگر تم نے منہ موڑا تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمے تو صاف اور واضح پیغام پہنچا دینا ہی ہے۔"

جب یہ آیت کریمہ اُتری اور حضور نے اس کی تلاوت فرمائی تو صحابہ کی طاعت شعاری کی یہ کیفیت تھی کہ جس کو بھی اس کی اطلاع ہوئی اس نے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیا۔ شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے اور مے نوشی کی محفلیں ختم کر دی گئیں۔ حضرت انس اپنے سوتیلے والد کا واقعہ بیان کرتے ہیں "انی لقائم واسقی اباطلحة وفلانا وفلانا اذ جاء رجل فقال وهل بلغكم الخبر فقالوا وما ذالك قال حرمت الخمر قالوا هرق هٰذه القلال يا انس قال فما سالوا عنها ولا راجعوها۔" میں اپنے سوتیلے باپ طلحہ اور فلاں فلاں شخص کو کھڑا شراب پلا رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کیا تمہیں خبر پہنچی؟ انہوں نے کہا کیا؟ اس نے کہا شراب حرام ہوگئی۔ یہ سنتے ہیں اُنہوں نے کہا اے انس شرب کے مٹکے زمین پر اُلٹ دو۔ پھر اُنہوں نے اس کے متعلق نہ مکرر سوال کیا اور نہ دوبارہ ادھر رجوع کیا۔

(بخاری شریف کتاب التفسیر، ج ۲، ص ۶۶۴)

اس مثال سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ دین کی طاقت کس قدر عظیم ہے اور اخلاقی اصلاح میں کتنا موثر مقام رکھتی ہے۔

(بحوالہ رضوان ص ۲۰، ۲۱، جون ۱۹۷۵ء)

پاک سُنّی تنظیم

سُنّی آج تک ایسے سَن رہے کہ اپنے کسی چھوٹے بڑے خیر خواہ کے جھنجھوڑنے سے حرکت میں نہ آئے، دوستوں اور بہی خواہوں نے ہر چند محبت و پیار سے تنظیم کی طرف بلایا مگر کسی نے پرواہ نہ کی، بالآخر قدرتِ ایزدی نے حکمتِ عملی سے ایک بدترین بازاری فحاش، فاسق فاجر، عدوّ مبین کو ہمارے سروں پر مصائب و آلام کے پہاڑوں سے چٹانیں گرانے پر مسلط کر دیا جس نے گندی گالیاں بکنی شروع کیں، اہلسنّت پر بے بنیاد الزامات تراشے، اکابر و اسلاف کے حق میں بے پناہ سب و شتم کے طور مار باندھے اور پاکبازوں کی شان میں غلیظ ترین بے ہودہ بکواس کی۔

غیور افراد حرکت میں آئے اور ان کے دِل و دِماغ کے گوشوں میں غیرتِ مذہبی کے دبے ہوئے جذبات و احساسات اُبھرنے لگے۔ اہلِ بصیرت نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ ہمارے جمود و خمود اور سستی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ ناسمجھ لوگ گھبرا کر چیخ اُٹھے کہ شور و شر کا یہ سیلاب ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا مگر رحمتِ خداوندی نے پکارا کہ ’’لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ‘‘ ’’خدا کے بندو! تم اسے اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ تمہارے لئے خیر ہے۔‘‘

ظاہر و باہر، فتنہ و شر کو خیر سمجھنا، سمجھانے والے کے سمجھائے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ غفلت کی گہری نیند سونے والوں میں چند افراد جب اس ہر بونگ سے گھبرا اُٹھے اور انہیں ہوش آیا کہ ہم کروڑوں کی اکثریت میں ہونے کے باوجود اس غفلت کی وجہ سے اقلیتوں سے بھی گئے گزرے ہیں، اس بے حسی اور بدنظمی کے حال میں مصیبت

سے کوئی اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتا، چہ جائیکہ دوسرے کی مدد کرے۔ کچھ ہوش و حواس درست ہونے پر دِل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی بیدار کریں جو اَب تک غفلت کی نیند سوئے پڑے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دُشمن کے اِس بھرپور حملے نے بروقت وہ کام کیا جو دوستوں، خیرخواہوں کی عرصہ دراز کی جدوجہد سے نہ ہو سکا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ؏

عدو شرے بر انگیزد کہ خیرے مادراں باشد

الحمد للہ! سُنّی بیدار ہونے لگے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ۱۷ ستمبر سے لے کر آج ۱۷ نومبر ۱۹۹۲ء تک دو ماہ کے قلیل عرصہ میں تقریباً پچیس ہزار کی تعداد اہلسنّت کے افراد "پاک سُنّی تنظیم" کے رِشتہ سے منسلک ہو چکے ہیں۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی ذاتِ گرامی سے عقیدت کا دم بھرنے والے اہلسنّت جو اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پر مستقل بالذات اور دوسروں سے مستغنی ہو بیٹھے ہیں باوجود ہزار کوششوں کے اتحاد اور تنظیم کی طرف نہیں آئے۔ اگر اس وقت بھی انہوں نے "پاک سُنّی تنظیم" کی دعوتِ اتحاد کو قبول نہ کیا تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ اُن کے دِل مذہبی غیرت سے قطعاً ناآشنا ہو چکے ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور "پاک سُنّی تنظیم" کا ایک جامع پیغام سارے ملک کے تمام سنیوں کے نام جاری کر رہا ہوں۔ گوشِ ہوش کے ساتھ اس پیغام کو سنیئے اور گھر گھر اس کی آواز ایک ایک فرد کو پہنچایئے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ملک بھر میں ہر مسلک خیال کے لوگ اپنے اپنے مسلک کی حفاظت کے لئے پوری طرح منظم ہیں اور وہ اپنے مسلک اور مکتبِ فکر کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دے رہے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ جمود و خمود، سستی و غفلت، انتشار و افتراق کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں، نہ اپنے مسلک و مذہب کو محفوظ رکھنے کی قوت

رکھتے ہیں نہ اپنے ملک وملت کی کوئی ٹھوس خدمت انجام دینے کے قابل ہیں۔ خدارا ہوش میں آئیے اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ہماری اجتماعی قوت اور مستحکم تنظیم ہمارے تحفظ و بقا اور عزت ووقار کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہے۔ یقین کیجئے ہم آپ کو فلاح ونجات کی طرف بلا رہے ہیں۔ ہمارا درد بھرا پیغام سنیے اور ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیجئے۔

پاک سُنّی تنظیم کا پیغام اپنے سُنّی بھائیوں کے نام

برادرانِ اہلسنت! دو مہینے میں مصائب وآلام کی جو چٹانیں آپ پر گری ہیں اُن سے آپ کو ہوش آ گیا ہوگا کہ غفلت اور جمود وخمود کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ خدا کے لئے اُٹھیئے اور پوری قوت کے ساتھ منظم ہو کر باطل کی چٹانوں کو پاش پاش کر دیجئے۔

تنظیم اِسلام کی رُوح ہے

آپ مسلمان ہیں۔ تنظیم اِسلام کی رُوح ہے۔ دِین کی بنیادیں تنظیمی اُصول پر اُستوار کی گئی ہیں۔ اِسلام تمام بنی نوع اِنسان کو ایک رشتہ وحدت واخوت میں منسلک کر دینے والا نظام ہے۔ اخوت ومساوات، تنظیم واتحاد اس کی وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے وہ تمام ادیانِ عالم میں ممتاز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی غفلت اور سستی کے باعث ان نعمتوں سے محروم ہیں۔ کیا ہمارا کلمۂ شہادت، نماز باجماعت، فریضۂ زکوٰۃ، رمضان کے روزے، حج وزیارت، ہماری بنیادی تنظیم کے بہترین مظاہر جمیلہ نہیں۔

تنظیم کی ضرورت

حیاتِ ملّی کا بکھرا ہوا شیرازہ تنظیم کے بغیر مجتمع نہیں ہو سکتا۔ ظاہری و باطنی دُشمن ہمیں مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ مذہب ومسلک کو برقرار رکھتے ہوئے ہماری بقاء

کے امکانات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ دینی مقاصد سب ناتمام پڑے ہیں۔ حیاتِ ملی کی شیرازہ بندی، دشمن کی مدافعت، تحفظ دین وملت اور قومی بقا کے لئے ہماری تنظیم نہایت ضروری ہے۔

تنظیم کی نوعیت کیا ہوگی؟

یہ ایک اہم ترین سوال ہے جس کا مکمل اور صحیح جواب علمائے دین وزعمائے قوم ہی دے سکتے ہیں مگر اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ جواب کے انتظار میں کہیں اصل سوال ہی نسیاً منسیاً ہو کر نہ رہ جائے نوعیت تنظیم کا ایک مجمل اور دھندلا سا خاکہ پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور اپنی اس جسارت کے لئے اربابِ بصیرت زعمائے قوم سے معافی کا خواستگار ہوں۔

ایک تلخ حقیقت

قبل اس کے کہ نوعیت تنظیم کا اجمالی خاکہ پیش کروں، نہایت ادب سے گزارش کروں گا کہ ہمارے ملجا وماویٰ ہمارے علماء کرام ومشائخ عظام ہیں۔ یہ دونوں طبقے ساری قوم کے لئے دِل ودِماغ ٹھیک نہ ہو، وہ کبھی درست نہیں ہوسکتی۔

علماء کرام

اس میں شک نہیں کہ دین کی رہنمائی کے لئے ایسے علماء کرام ابھی تک موجود ہیں جو صحیح معنوں میں ورثۃ الانبیاء کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگرچہ وہ بہت کم ہیں مگر معدوم نہیں۔ مگر ساتھ ہی عالم کہلانے والے اُن جہلاء کی بہتات بھی ہمارے پیشِ نظر ہے جو دین کے نام پر شکم پروری کر رہے ہیں۔ جن کو چند ٹکے دے کر جو چاہو کہلوالو۔ متاعِ قلیل پر بک جانے والے پیشہ ور لوگ دین ومذہب کے دامن پر اِنتہائی بدنما دھبہ ہیں جن کے ناپاک وجود سے ملت کے دامن کو پاک کرنا اشد ضروری ہے۔

مشائخ کرام

علیٰ ہذا القیاس مشائخ کرام اور سجادہ نشینان میں بھی اب تک ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جو واقعی بندگانِ سلف کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ ان کے دم قدم سے اولیاء کرام کی یاد تازہ ہے اور وہ فی الحقیقت مسند ارشاد کے اہل ہیں لیکن اس میدان میں بھی جاہل پیروں کی بھرمار ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک مصیبت ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپے ان لوگوں کے عیش و نشاط پر صرف ہوتے ہیں۔ تزکیۂ نفس اور معرفتِ الٰہی تو درکنار، نماز روزہ بھی ان لوگوں کے قریب نہیں آیا۔ عوام ان کے دام تزویر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان مفت خوروں سے بھی اُمتِ مسلمہ کو نجات دلانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

اس قسم کے تمام علماء اور مشائخ کہلانے والوں سے قطع نظر کر کے صحیح المزاج علماء اور مشائخ کی تنظیم عوامی تنظیم کا سنگِ بنیاد ہے۔ اِسی لئے پاک سُنّی تنظیم کو جمیعۃ العلماء پاکستان کا شعبہ قرار دیا گیا ہے۔

نوعیت تنظیم کا اجمالی خاکہ

سُنّی علماء و مشائخ کے معمولی اور فروعی اختلافات کو ختم کر کے سب کو ایک مضبوط مرکز پر متحد کیا جائے تاکہ عوامی تنظیم کی پشت پناہی ہو سکے۔

عوامی مسائل کو حل کرنا علماءِ دین و اکابر قوم ہی کا کام ہے جب تک ان حضرات کی مستحکم تنظیم نہ ہوگی، عوامی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اسلامی نظام اور تنظیم علماء و مشائخ

ملکی دستور و قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور پاکستان میں نظامِ اِسلام کو رائج کرنے کا عظیم کام بھی اکابر قوم و علماءِ دین ہی کر سکتے ہیں۔ دِین پسند حضرات اِس

حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ہماری آزادی اور بقا کا سنگِ بنیاد پاکستان میں اسلامی دستور کا نفاذ ہے۔

آج ہم اپنی بے مائیگی پر جس قدر آنسو بہائیں، بجا ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں ہمیں پورا وثوق ہے کہ وہ ساری اُمتِ مسلمہ کے دینی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر صرف اپنے اجتہادی اُصول کے مطابق نظامِ اِسلام کو رائج کرنے کے درپے ہیں ہم نے اپنے ہاتھوں یہ میدان اُن کے حوالے کر دِیا۔ جب صحیح کام کرنے والے آگے نہ آئے تو موقع پا کر غلط کاروں نے اِس میدان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اَب وہ اِس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ہم پچاس برس کی تگ و دو کے بعد بھی اُن کے دوش بدوش نہیں آ سکتے۔

تاہم نا اُمید ہونا ٹھیک نہیں۔ اِس وقت ہمیں اپنی طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے خدا کی قدرت پر اعتماد کر کے اِس دِینی نظام کو بروئے کار لانے کی سرتوڑ کوشش کرنی چاہئے جس پر سلف صالحین کاربند رہے۔ مختصر یہ کہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق صحیح دینی نظام برپا کرنے کے لئے اکابرِ قوم وعلماءِ دِین کی تنظیم نہایت ضروری ہے۔

خطبات کی تنظیم

پیش آمدہ مسائل اوران سے متعلق ضروری معلومات ساری قوم تک پہنچانے کے لئے وحدت خطبہ ملک وملت کی بنیادی ضرورت ہے جو اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ وقتی تقاضوں کے پیشِ نظر مرکز سے ایک خطبہ تمام خطباء کے پاس پہنچے اور وہ اسے قوم کے سامنے پیش کریں۔ اگر خطبات کی یہ تنظیم عملی صورت اختیار کر لے تو بیک وقت تمام ملک میں ایک خطبہ کی آواز پوری قوم کے اذہان کو ایک مرکزِ فکر پر مجتمع کر سکتی

ہے اور ساری قوم کا دائرۂ عمل، وحدت مرکز کا آئینہ دار بن سکتا ہے اور یہ اِتنی بڑی قوت ہے جس کے ذریعے بڑے سے بڑے قومی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔

مدارسِ اِسلامیہ کی تنظیم

عصرِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ایک جامع نصاب تعلیم تمام مدارسِ اِسلامیہ میں رائج کرنے کے لئے مرتب کیا جائے اور اسے تمام مدارس میں جاری کر کے اِسلامی تعلیم کو بلند سطح پر لایا جائے۔ آج ہمارے مدارس جس ناگفتہ بہ حالت میں کام کر رہے ہیں، اِنتہائی قابلِ رحم ہے۔ اے کاش! دِینی علم کا ذوق رکھنے والے اربابِ بصیرت دِینی تعلیمات کے ان گہواروں کی حالتِ زار پر توجہ فرماتے۔ ہمارے نزدیک مقاصدِ تنظیم میں مدارسِ دینیہ کی تنظیم ایک مقصد عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنظیم اعراس

یہ صحیح ہے کہ اکثر مقامات پر بزرگوں کے عرس اسلاف کرام کے طریقوں پر ہوتے ہیں لیکن بے شمار مجالسِ عرس ایسی بھی ہیں جن میں فحاشی کے عبرتناک مناظر علی الاعلان دیکھے جاتے ہیں۔ میلوں کی صورت میں بے شمار لغویات پائی جاتی ہیں اور ان کی سرپرستی مزاروں کے سجادہ نشین کرتے ہیں۔ اشد ضرورت ہے کہ اولیائے کرام کے مقدس مزاروں اور پاکیزہ خانقاہوں کو اپنی تنظیمی طاقت کے ذریعے ہر قسم کی برائی سے پاک کیا جائے۔

تعلیماتِ نسواں

عورتوں میں دینی تعلیم کا فقدان ایسے نقصانِ عظیم کا موجب ہے جس کی تلافی آئندہ نسلوں تک نہیں ہوسکتی۔ ہماری تنظیم کے بنیادی مقاصد میں تعلیمِ نسواں کا مسئلہ بھی ایک عظیم مقصد ہے۔

تعلیمِ بالغاں

ہماری تنظیم کے بنیادی مقاصد میں تعلیمِ بالغاں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مناسب اوقات میں ہر جگہ اس کے مراکز کا قیام نہایت ضروری ہے۔ عوام کو دینی مسائل سے باخبر کرنا قوم کی بنیادی خدمت ہے جو تنظیم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

اصلاحِ معاشرہ

مسلمانوں کی زِندگی کے مختلف شعبوں میں جس قدر خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کا صحیح جائزہ لے کر ان کی اصلاح کا مکمل پروگرام بنایا جائے اور اس کو رائج کرنے کی اجتماعی کوشش کی جائے جس کی تکمیل مستحکم تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔

بداخلاقیاں اور جرائم

خلقِ حسن اِنسانیت کی رُوح رواں ہے۔ آج مسلمانوں کے اخلاق اس قدر گرتے جا رہے ہیں کہ خوفناک جرائم کے ارتکاب کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اس کی روک تھام بغیر تنظیم کے نہیں ہو سکتی۔

جب تک مناسب طریقوں سے قوم کی ذہنیت میں تبدیلی نہ کی جائے اور ان کے دِل خوفِ خدا سے آشنا نہ ہوں ان کا جرائم سے باز آنا اور نیکی کی طرف متوجہ ہونا دُشوار ہے۔ جہالت کو دُور کرنا بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ علمی و عملی تدبیروں سے انسدادِ جرائم ممکن ہے بشرطیکہ ان تدبیروں کو کسی تنظیم اور اجتماعی قوت کے تحت کام میں لایا جائے۔

صدقات وزکوٰۃ کی تنظیم

کوئی قومی کام سرمائے کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ تمام جماعتیں اپنے افراد کی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ اور ان سب کے صدقات وخیرات بیت المال کی صورت

میں جمع کر کے اپنے جماعتی کاموں اور ضرورتوں پر صرف کرتی ہیں۔

ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی جماعت کا ایک بیت المال قائم کریں اور ہر فرد اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو بیت المال کے لئے معین کر دے اور تمام صدقات وخیرات کی رقوم بیت المال میں جمع کی جائیں اور ہر مد کی رقم کو اس کے مصرف پر جائز طریقہ سے خرچ کیا جائے۔ یہ کام بھی تنظیم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

معاملات کی تنظیم

پاک سُنّی تنظیم کے پیشِ نظر عوام کے معاملات بھی ہیں کہ ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ فضول خرچی سے احتراز کیا جائے۔ آپس کے اختلافات کو باہمی مذاکرات کے ذریعہ طے کیا جائے جس کے لئے ایک خاص شعبہ قائم ہو اور اس کے لئے بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔

امدادِ باہمی

ہماری تنظیم ایک ایسا شعبہ بھی قائم کرنا چاہتی ہے جس میں امدادِ باہمی کے اُصول پر سرمایہ جمع کیا جائے اور اسی میں قوم کے غربا اور مساکین کی خصوصی امداد بھی شامل ہو۔

رضاکارانہ تنظیم

رضاکاروں کی ایک جماعت نہایت ضروری ہے جو مجاہدانہ طرز پر بوقتِ ضرورت ملک وملت کی خدمت انجام دے سکے۔

مبلغین کی تنظیم

ایک وسیع دار التبلیغ کا قیام جس کے ذریعے مبلغین کو منظم کر کے انہیں تربیت دی جائے تاکہ وہ تبلیغ میں کسی قسم کی بے راہ روی اختیار نہ کرسکیں۔

تصنیف وتالیف

ہماری تنظیم کے اہم بنیادی مقاصد میں یہ مقصد بھی ہے کہ تصنیف وتالیف کے ذریعہ علمی و عملی خدمت انجام دی جائے۔ مفید کتب و رسائل شائع کئے جائیں۔ ضروری مسائل پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہو۔ تفسیر وحدیث و دیگر علومِ دینیہ اور فنون مروجہ کو ملک میں عام کرنے کے لئے اور قوم کے اذہان کو کتاب وسُنّت اور علوم وفنون سے متاثر کرنے اور پیش آمدہ مسائل کے بارے میں اہم اور ضروری معلومات قوم کو بہم پہنچانے کے لئے تصنیف وتالیف کا کام مستحکم بنیادوں پر نہایت ضروری ہے۔ کم از کم ہفت روزہ اخبار جاری کیا جائے جو تمام ملک میں مرکزی پیغامات وہدایات کو پہنچادے اور ہر جگہ جماعت کے افراد کو اپنی جماعت کے احوال و کوائف سے باخبر ہونے کا موقع ملتا رہے۔

تنظیم کا یہ اجمالی خاکہ اِس لئے پیش کیا جارہا ہے کہ سُنّی بھائی اِسے پڑھ کر اپنی آرائے گرامی اور مفید مشوروں سے ہمیں مستفید فرمائیں۔ اس میں جو کمی انہیں مناسب معلوم ہو اُس سے ہمیں مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

پاک سُنّی تنظیم کا یہ پیغام ہر سُنّی مرد وعورت، بوڑھے بچے اور جوان کے لئے دِیا گیا ہے۔ اِسے کوئی رسمی بات نہ سمجھے بلکہ یقین کر لیجئے کہ یہ پیغام کسی درد رسیدہ دِل کی گہرائیوں سے نکلا ہے جو قوم کے سامنے اِن شاء اللہ العزیز ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں سامنے آجائے گا۔ جو لوگ آج اِس پر لبیک کہیں گے وہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے زمرہ میں شمار ہوں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

سید احمد سعید کاظمی

اگر پاکستان میں اہلِ سنّت کی امارتِ شرعیہ موجود ہوتی تو اِس ایمان افروز بیان کو اہلِ حق کے چیف جسٹس کا فیصلہ قرار دِیا جاتا اور مسلم ممالک کی عدالتوں میں بطورِ حجت اِسے پیش کیا جاتا

گستاخِ رسول کی سزا...... قتل

پر حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا وقیع تبصرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

حمد بے حد مر رسول پاک ﷺ را
آں کہ ایماں داد مُشتِ خاک را

دولتِ خداداد پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے وقت تک برصغیر کے قریے قریے میں جید علمائے موجود تھے اور اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کو فیض یاب کرتے رہے، مگر اہلِ سُنّت کی شومی قسمت کہ وہ علمائے حق یکے بعد دیگرے عازمِ خُلدِ بریں ہوتے چلے گئے۔ اُن میں سے بہت سے حضرات بجا طور پر علم کے ہمالہ تھے، مگر شہرت اُن پر فریفتہ نہیں تھی، لہٰذا اُن کا تعارف صرف حلقہ علماء تک محدود رہا۔

مفتی اعظم پاکستان حضرتِ علامہ ابو البرکات سید احمد قادری، چشتی، اشرفی، امیر حزب الاحناف لاہور (رحمۃ اللہ علیہ) اور غزالی زماں، رازئ دوراں علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہوی چشتی صابری قادری بانی انوار العلوم ملتان (رحمۃ اللہ علیہ) اُن بزرگوں میں سے ہیں جو علم و فضل کے بحرِ ذخار اور دریائے معرفت کے شناور تھے۔ شہرت اُن پر ایسی عاشق و شیدا تھی کہ ہر وقت اُن کے دروازوں پر دربانی کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ یہ دونوں بزرگ قیام پاکستان سے بہت پہلے پورے برصغیر (پاک و ہند) میں

اپنی فضیلتِ علمی اور شرافت نفسی کا لوہا منوا چکے تھے۔ امرتسر میں سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کا عرس مبارک نہایت تزک و احتشام سے منعقد ہوا کرتا تھا۔ اِس مقدس و بابرکت محفل میں سربرآوردہ مشائخ عظام اور جید علمائے کرام شرکت کرنا باعث فخر و مباہات جانتے تھے چنانچہ مذکورۃ الصدر دونوں بزرگ بھی اِس سہ روزہ محفل (اجلاس) میں شرکت فرماتے اور اہالیانِ امرتسر کو اپنے مواعظِ حسنہ وعلمیہ سے بہرہ ور فرماتے تھے۔ لہٰذا احقر اس زمانے سے اِن بزرگوں کے مداحین میں شامل تھا۔ پاکستان میں ہجرت کے بعد اِن بزرگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا بھی موقع میسر آیا اور یہ ہر دو بزرگ فقیر حقیر پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔

سنہ ۱۹۷۳ء میں جب راقم السطور کو مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی تو وہاں قطب مدینہ شیخ العرب والعجم حضرت شاہ ضیاء الدین احمد قادری مہاجر مدنی، خلیفہ خاص اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان قادری بریلوی (قدس سرہما) کے آستانہ عالیہ پر ہر روز حاضری سے مشرف ہوتا رہا اور متعدد مرتبہ حضرت قطب مدینہ نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا "اِس وقت پاکستان میں صرف دو ہی معتبر اور قابل اعتماد عالم دین ہیں، ایک حضرت ابوالبرکات سید صاحب اور دُوسرے علامہ سید احمد سعید کاظمی شاہ صاحب [1] (بلفظہٖ بقدرِ حافظہ)۔

[1] حضرت قطب مدینہ علیہ الرحمۃ والرضوان سے مختلف اوقات میں جن پاکستانی علماء حق کے بارے میں تحسین کے کلمات فقیر نے سنے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت شیخ الحدیث علامہ محمد سردار احمد قادری رضوی چشتی صاحب، حضرت علامہ سید سردار احمد قادری گڑھی اختیار خاں والے جو سید محمد فاروق القادری ایم۔اے کے دادا جان ہوتے ہیں، حضرت عبد نبی مخت محمد یار فریدی (گڑھی اختیار خاں)، علامہ عبد الغفور ہزاروی اور حضرت مفتی اعجاز ولی خا رضوی (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔ اس وقت جو حضرات بقید حیات تھے اُن میں سے حضرت استاذ العلماء مفتی تقدس علی خاں رضوی (مدفون پیر جوگوٹھ)، جناب پیر (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ

حضرت قطب مدینہ کی لسان فیض ترجمان سے ان بزرگوں کی عظمت کے اعلان سے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوئی کہ ان کے بارے میں میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔

۲۰ شوال المکرم ۱۳۹۸ھ جو حضرت ابوالبرکات واصل بحق ہو گئے اور اُن کے بعد لاہور میں مسند افتاء بے وُقعت ہو کر رہ گئی۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ کو حضرت غزالی دوراں مکین خلد بریں ہو گئے تو عوام اہل سُنّت بالکل بے سہارا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب اَعْلَی اللّٰہُ مَقَامَہٗ کی ذاتِ گرامی فی الحقیقت مستغنی عن الخطاب ہے۔ جب اُن کا نام نامی آ جائے تو خطابات والقابات اُن کی قد آور شخصیت سے بہت چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ وہ نابغہ روزگار علماء میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

سال ہا باید کہ تا یک فردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

تحریکِ پاکستان کے مبلغ اعظم حضرت ابوالمحامد سید محمد محدث چشتی اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ آل انڈیا سنی کانفرنس منعقدہ بنارس (۱۹۴۶ء) کے آخر میں درج ہدایات وتجاویز کی روشنی میں اگر پاکستان کے اندر متفقہ طور پر مرکزی دارالافتاء قائم کیا ہوتا یا کم از کم اہل سُنّت کو درپیش نت نئے مسائل علمیہ کے حل کے لیے امارتِ شرعیہ قائم کی ہوتی تو یقیناً کاظمی شاہ صاحب اُس کے متفقہ طور پر صدرالصدور قرار پاتے اور چھوٹے چھوٹے مولوی اور خودساختہ مفتی، جو عجیب وغریب باتیں کرتے رہتے ہیں، اُنھیں اپنی پناہ گاہوں سے باہر جھانکنے کی بھی جرأت نہ ہوتی، مگر وائے افسوس کہ یہاں اُلٹی گنگا بہنے لگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) غلام قادر اشرفی (مدفون لالہ موسیٰ) اور شاہ فاروق رحمانی (مدفون کراچی) علیہم الرحمۃ پر بہت خوش تھے۔ قائد اہلسنّت شاہ احمد نورانی صاحب زید مجدہٗ اور مجاہد ملت عبدالستار خان نیازی مدظلہٗ کے لئے دُعاگو رہتے تھے۔ وہ ان پر اس لئے خوش تھے کہ اُن دِنوں یہ دونوں بھٹو حکومت سے نبرد آزما تھے۔

حضرت قطب مدینہ قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق قبلہ کاظمی شاہ صاحب آخری اہل حق سربرآوردہ عالم دِین ثابت ہوئے [1] جس کی تصدیق درپیش حالات نے کردی ہے۔ مثلاً بعض حنفی سنی علماء نے شریعت آرڈی ننس کو قبول کرلیا ہے جس کا تعلق صرف سعودیہ کی شریعت سے ہے اور ولایت ابوحنیفہ (پاکستان) میں اُن نام نہاد حنفی علماء کے دستخطوں سے سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام اور کام کو حرفِ غلط کی طرح محو کردیا گیا اور غائبانہ نماز جنازہ کی "بدعت" اپنالی گئی ہے۔ پاکستان جن حنفی اولیاء اللہ کا فیضان ہے، اُن کی ارواحِ مقدسہ اِن نام نہاد حنفیوں سے ناراض ہیں اور اِن سب کا انجام قوم ضرور دیکھے گی اِن شاء اللہ تعالیٰ! اب یہی نام نہاد عاشقان مصطفیٰ نظام مصطفیٰ کو بالکل بھول گئے ہیں اور ضیاء اِزم، ضیاء اِزم کا وظیفہ جپنے لگے ہیں۔

ضیاء اِزم کیا ہے؟ مولوی اشرف علی تھانوی کے افکار و تعلیمات کی نشر و اشاعت یا یوں کہیے کہ سعودیہ کے قوانین کی ترویج! اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! اہل السنت و جماعت کو اِن نام نہاد علماء کو جو فی الحقیقت بندگانِ سیم و زر ہیں، اپنے سے دُور رکھنا چاہیے تا کہ اِن کے منحوس اثرات سے ایمان محفوظ رہ سکے۔

پیشِ نظر رسالہ حضرت علامہ کاظمی شاہ صاحب کا ایک تحریری بیان ہے جو انہوں نے جناب چیف جسٹس صاحب وفاقی شرعی عدالت کے استفسار پر تحریر کیا تھا جس میں اِہانت رسالت مآب اور تنقیص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی سزا کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کتاب وسنّت، اِجماعِ اُمت اور تصریحاتِ علمائے اُمت سے واضح ہے کہ ہر شاتم رسول کی سزا قتل ہے اور اِس مسئلے میں اہل حق میں سے کبھی کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اگر پاکستان میں اہل سنّت کی امارتِ شرعیہ موجود ہوتی تو اِس ایمان افروز بیان کو اہل حق کے چیف جسٹس کا فیصلہ قرار دیا جا

[1] علمائے حق تو چند اور بھی تھے لیکن یہاں صرف سربرآوردہ اور مسلمہ شخصیت کا ذکر ہے

اور مسلم ممالک کی عدالتوں میں بطور حجت اِسے پیش کیا جاتا مگر ع

اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

قبلہ کاظمی شاہ صاحب نے اِس تحریر میں گستاخانِ رسول کی اِسلامی سزا بتائی ہے۔ میں اس موقع پر امرتسر میں رونما ہونے والا تقریباً نوے (۹۰) سال پہلے کا ایک واقعہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں جو بے حد ایمان افروز اور عبرت انگیز ہے۔

یہ واقعہ حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب قبلہ علی پوری قدس سرہ نے امام الائمہ سیدنا حضرت امام ابوحنیفہ کوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عرس سراپا قدس منعقدہ مسجد جان محمد امرتسر کے اجتماعِ عظیم میں بیان فرمایا تھا۔

امرتسر کے گرجا گھر کے سامنے کھڑا ہو کر ایک پادری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فضائل اور عیسائی مذہب کی خوبیاں بیان کر رہا تھا اور وہ (پادری) دورانِ تقریر حضور پرنور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وسلم کا اِسمِ گرامی ادب و احترام سے نہیں لیتا تھا۔ سامعین میں ایک بھنگڑ اِس حالت میں کھڑا تھا کہ بھنگ گھوٹنے والا ڈنڈا اس کے کاندھے پر تھا۔ اس خوش بخت نے کہا:

"پادری! ہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو برحق نبی مانتے ہیں اور اُن کا نام ادب سے لیتے ہیں، تو بھی ہماری سچی سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام ادب سے لے۔"

مگر پادری پر اِس کا کچھ اثر نہ ہوا تو اِس عالی ہمم نے پھر ٹوکا۔ جب پادری نے تیسری بار بھی اسی طرح نام لیا تو اس پاک نہاد نے اپنا وہ ڈنڈا جس سے بھنگ گھوٹتا تھا، اِس زور سے پادری کے سر پر دے مارا کہ پادری کا سر پھٹ کر بھیجا باہر آ گیا اور وہ مردود بیان دیئے بغیر واصل جہنم ہو گیا۔ یہ عاشق صادق پکڑا گیا۔ موت کی سزا ہوئی۔ اپیل ہوئی۔ انگریز جج نے یہ لکھ کر بری کر دیا کہ:

"پادری کا قاتل تکیہ نشین بھنگڑ ہے۔ کوئی مولوی نہیں۔ مولوی اور پادری کی کوئی باہمی رنجش ہو سکتی ہے۔ بھنگڑ سے پادری کی دیرینہ یا تازہ رنجش کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ پادری نے ضرور اس کے جذبات کو مجروح کیا ہے، لہٰذا میں اسے بری کرتا ہوں۔" (بتغییر یسیر بقدرِ حاجت)

اللہ تعالیٰ اس مکین تکیہ کے مرقد منور پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور اس جیسا ایمان ہر مکین مسجد اور ہر مسلمان کو نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین! بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم۔

اِس واقعے کے نقل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ پادری حضور پر نور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی شانِ اقدس میں کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں کہہ رہا تھا، صرف حضور پاک ﷺ کا اِسم پاک اسلامی آداب سے نہیں لیتا تھا یعنی مولوی اسمٰعیل دہلوی کی طرح "جس کا نام محمد یا علی ہے، وہ کسی چیز کا مختار نہیں" [1] (نقل کفر کفر نباشد) یعنی پادری صرف "محمد صاحب" کہہ رہا تھا اور اُس تکیہ والے عاشق صادق کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور اُس نے اپنے "مذہب عشق" کا جھنڈا بلند کر دِکھایا۔ ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عاشقانِ سید ابرار (صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم) کسی عالم و مفتی سے پوچھے بغیر ہی ادب نہ کرنے والوں کو جہنم رسید کر دیتے ہیں تو کوئی گستاخ اُن کے خنجر بُرّاں سے کیونکر بچ سکتا ہے۔ اُن کا مفتی اُن کا وِجدان ہوتا ہے۔ اُن کا پیر و مرشد اُن کا جذبہ عشق ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے "اَن پڑھ" غازیوں کا یہ کام ہمیشہ لائق تقلید ہوتا ہے۔ کفار کی حکومت میں تو اِسی طرح ہونا چاہیے اور ہوتا رہا، مسلمانوں کی حکومت میں یہ عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سچی شہادتوں کے بعد گستاخِ رسول کے قتل کا حکم صادر کرے تاکہ مزید اُلجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا نہ ہو سکیں۔

خاکِ راہِ دردمنداں
محمد موسیٰ عفی عنہ
داتا کی نگری
۶ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

[1] "تقویۃ الایمان" صفحہ ۴۷ بحوالہ "اطیب الایمان" صفحہ ۳۲۴۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

بسلسلہ شریعت پٹیشن

در توہینِ رسالت

بعدالت جناب چیف جسٹس صاحب وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

بیان من جانب: سید احمد سعید کاظمی صدر مرکزی جماعت اہلسنّت پاکستان
وشیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ انوار العلوم، ملتان

محترم محمد اسمٰعیل قریشی، سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ پاکستان، لاہور نے بنام اسلامی جمہوریہ پاکستان، تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ نمبر ۲۹۵ الف اور دفعہ ۲۹۸ الف کے خلاف شرعی عدالت میں ایک درخواست دائر کی ہے۔ جہاں تک اہانت رسالت اور توہین و تنقیص نبوت سے اِس درخواست کا تعلق ہے، میں اِس سے پوری طرح متفق ہوں اور دلائل شرعیہ (کتاب وسنّت، اجماعِ اُمت اور تصریحاتِ علماء دین) کے مطابق میں اِس کی مکمل تائید اور حمایت کرتا ہوں۔ اِس سلسلے میں میرا تفصیلی بیان درج ذیل ہے:

کتاب وسنت، اجماعِ امت اور تصریحاتِ ائمہ دِین کے مطابق توہین رسول کی سزا صرف قتل ہے۔ رسول ﷺ کی صریح مخالفت توہین رسول ہے۔ قرآن مجید نے اِس جرم کی سزا قتل بیان کی ہے۔ اِسی بناء پر کافروں سے قتال کا حکم دِیا گیا۔ قرآن مجید میں ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ [1] یہ (یعنی کافرون کو قتل کرنے کا حکم [2]) اِس لیے ہے کہ اُنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی صریح مخالفت کر کے اُن کی

---

[1] سورۃ انفال آیت ۱۳

[2] مدارک ص ۷۱، ج ۲، خازن ص ۷۱، ج ۲، البحر المحیط ص ۴۷۱، ج ۴

توہین کاارتکاب کیا۔توہین رسول کے کفر ہونے پر بکثرت آیاتِ قرآنیہ شاہد ہیں۔

مثلاً وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ○ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ [1]

ترجمہ: اور اگر آپ اُن سے پوچھیں تو وہ ضرور کہیں گے، ہم تو صرف ہنسی مذاق کرتے تھے۔آپ (اُن سے) کہیں، کیا تم اللہ اور اُس کی آیتوں اور اُس کے رسول کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہو۔کوئی عذر نہ کرو۔بے شک ایمان کے بعد تم نے کفر کیا۔

مسلمان کہلانے کے بعد کفر کرنے والا مرتد ہوتا ہے اور از روئے قرآن مرتد کی سزا صرف قتل ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ [2] ترجمہ: اے رسول (ﷺ) پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے فرمادیجیے، عنقریب تم سخت جنگ کرنے والوں کی طرف بلائے جاؤ گے۔تم اُن سے قتال کرتے رہو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔.........

یہ آیت مرتدین اہل یمامہ کے حق میں بطورِ اخبار بالغیب نازل ہوئی۔ اگرچہ بعض علماء نے اِس مقام پر فارس و روم وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل روایت نے اِس آیت کو مرتدین بنی حنیفہ (اہل یمامہ) کے حق میں متعین کردیا:

عن رافع بن خديج انّا كنّا نقرأ هٰذه الأية فيما مضى ولا نعلم من هم حتّٰى دعا ابو بكر رضى الله عنه الى قتال بنى حنيفة فعلمنا انّهم اريدوا بها۔ [3] ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] سورۃ توبہ آیت ۶۵، ۶۶ [2] سورۃ الفتح آیت ۱۶

[3] البحر المحیط ص ۹۴، ج ۸، روح المعانی ص ۱۰۲، پ ۲۶

گزشتہ زمانے میں ہم اِس آیت کو پڑھا کرتے تھے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (مرتدین) بنی حنیفہ (اہل یمامہ) کے قتال کی طرف مسلمانوں کو بلایا۔ اُس وقت ہم سمجھے کہ اِس آیت کریمہ میں یہ مرتدین ہی مراد ہیں۔[1]

ثابت ہوا کہ اگر مرتد اسلام نہ لائے تو از روئے قرآن اُس کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔ قتل مرتد کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ اختصار کے پیش نظر صرف ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔

اتی علی بزنادقة فاحرقهم (وفی روایة ابی داؤد ان علیًا احرق ناسًا ارتدوا عن الاسلام) فبلغ ذٰلك ابن عباس فقال لو كنت انا لم احرقهم لنهی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلّم لا تعذّبوا بعذاب الله ولقتلتهم لقول رسول الله صلی الله علیه وسلّم من بدّل دینه فاقتلوه[2] ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس (مرتد ہو جانے والے) زندیق لوگ لائے گئے تو آپ نے اُنہیں جلا دیا۔ اس کی خبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا، اگر (آپ کی جگہ) میں ہوتا تو اُنہیں نہ جلاتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کے عذاب کے ساتھ کسی کو عذاب نہ دو، اور میں اُنہیں قتل کرا دیتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو (مسلمان) اپنے دین سے پھر جائے اُسے قتل کر دو۔

---

[1] تفسیر مظہری ص ۱۳۵، ج ۳۔ روح المعانی ص ۱۶۰، پ ۶

[2] صحیح بخاری ص ۲۴۳، ج ۱۔ ص ۱۰۲۳، ج ۲۔ ص ۱۰۹۶، ج ۲۔ ابو داؤد ص ۵۹۸، ج ۲۔ ترمذی ص ۱۷۶، ج ۱۔ النسائی ص ۱۵۱، ج ۲۔ ابن ماجہ ص ۱۸۵، ج ۱۔ مسند احمد ص ۲۳۱، ج ۵ عن معاذ۔

قتل مرتد کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی جس شدت کے ساتھ مرتدین کو قتل کیا، محتاجِ بیان نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے مرتد کو زندہ دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یمن کے دو مختلف حصوں پر حاکم تھے۔ ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ملاقات کے لیے آئے۔ ایک بندھے ہوئے شخص کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا:

کان یہودیا فاسلم ثم تھوّد قال اجلس قال لا اجلس حتّٰی یقتل قضاء اللہ ورسولہ ثلاث مرّات فامر بہٖ فقتل [1]۔

ترجمہ: یہ یہودی تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد پھر یہودی (ہو کر مرتد) ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت معاذ بن جبل کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ انہوں نے تین بار فرمایا: جب تک اسے قتل نہ کر دیا جائے، میں نہیں بیٹھوں گا۔ (قتل مرتد) اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے حکم سے اسے اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

---

[1] بخاری ص ۱۰۲۳، ج ۲۔ ابوداؤد ص ۵۹۸، ج ۲، نسائی ص ۱۵۲، ج ۲۔

گستاخِ رسول کا قتل

غلافِ کعبہ سے لپٹے ہوئے توہین رسول کے مرتکب مرتد کو مسجد حرام میں قتل کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دِن رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے حضور ﷺ سے عرض کی، حضور! (آپ کی شان میں توہین کرنے والا) ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: "اقتلوہ" اسے قتل کردو[1]۔

یہ عبداللہ بن خطل مرتد تھا۔ اِرتداد کے بعد اس نے کچھ ناحق قتل کیے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر حضور کی شان میں توہین و تنقیص کیا کرتا تھا۔ اس نے دو گانے والی لونڈیاں اِس لیے رکھی ہوئی تھیں کہ وہ حضور ﷺ کی ہجو میں اشعار گایا کریں۔ جب حضور ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دِیا تو اُسے غلافِ کعبہ سے باہر نکال کر باندھا گیا اور مسجد حرام میں مقامِ ابراہیم اور زم زم درمیان اس کی گردن ماری گئی[2]۔

یہ صحیح ہے کہ اس دِن ایک ساعت کے لیے حرمِ مکہ کو حضور ﷺ کے لیے حلال قرار دے دِیا گیا تھا لیکن بالخصوص مسجد حرام میں مقامِ ابراہیم اور زم زم کے درمیان اس کا قتل کیا جانا اِس بات کی دلیل ہے کہ گستاخِ رسول باقی مرتدین سے بدرجہا بدتر و بدحال ہے۔

۱۔ بخاری ص ۲۴۹، ج ۱، ص ۶۱۴، ج ۲۔ ۲۔ فتح الباری ص ۱۳، ج ۸، عمدۃ القاری ص ۳۴۷، ج ۸، ارشاد الساری ص ۳۹۲، ج ۶۔

اجماعِ اُمت

۱۔ قال محمّد بن سحنون اجمع العلماء ان شاتم النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم المتنقص لہٗ کافر والوعید جار علیہ بعذاب اللہ لہٗ وحکمہٗ عند الامّۃ القتل ومن شکّ فی کفرہٖ وعذابہٖ کفر [۱]۔

ترجمہ: محمد بن سحنون نے فرمایا، علماء اُمت کا اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ کو گالی دینے والا حضور ﷺ کی توہین کرنے والا کافر ہے اور اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وعید جاری ہے اور اُمت کے نزدیک اُس کا حکم قتل ہے۔ جو اُس کے کفر اور عذاب میں شک کرے، کافر ہے۔

۲۔ وقال ابو سلیمان الخطابی لا اعلم احدا من المسلمین اختلف فی وجوبِ قتلہٖ اذا کان مسلمًا [۲]۔

ترجمہ: امام ابو سلیمان الخطابی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، جب مسلمان کہلانے والا نبی ﷺ کے سبّ کا مرتکب ہو تو میرے علم میں کوئی ایسا مسلمان نہیں جس نے اُس کے قتل میں اختلاف کیا ہو۔

۳۔ واجمعت الامّۃ علی قتل متنقصہ من المسلمین وسابہٖ [۳]

ترجمہ: اُمت کا اجماع ہے کہ مسلمان کہلا کر حضور کی شان میں سبّ اور تنقیص کرنے والا قتل کیا جائے گا۔

۱۔ الشفاء ص ۲۱۵، ۲۱۶، ج ۲۔ نسیم الریاض شرح الشفاء ص ۳۳۸، ج ۴۔ الرّد المحتار ص ۳۱۷، ج ۳۔ الصارم المسلول ص ۴۔ ۲۔ الشفاء ص ۲۱۶، ج ۲۔ فتح القدیر شرح ہدایہ ص ۴۰۷، ج ۴۔ الصارم المسلول ص ۴۔ ۳۔ الشفاء ص ۲۱۱، ج ۲۔

۴۔ قال ابو بکر بن المنذر اجمع عوام اهل العلم علی ان من سبّ النبی صلّی الله علیه وسلّم یقتل قال ذٰلك مالك بن انس واللّیث واحمد واسحاق وهو مذهب الشّافعی قال القاضی ابو الفضل وهو مقتضی قول ابی بکر ن الصدیق رضی الله عنه ولا تقبل توبته عند هٰؤلاء وبمثله قال ابو حنیفة واصحابهٗ والثّوری واهل الکوفة والأوزاعی فی المسلمین لکنهم قالوا هی ردّة [1]۔

ترجمہ: امام ابوبکر بن منذر نے فرمایا، عامہ علماء اسلام کا اجماع ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کو سبّ کرے، قتل کیا جائے گا۔ ان ہی میں سے مالک بن انس، لیث، احمد، اسحاق (رحمہم اللہ) ہیں اور یہی شافعی کا مذہب ہے۔ قاضی عیاض نے فرمایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا یہی مقتضیٰ ہے۔ (پھر فرماتے ہیں) اور ان ائمہ کے نزدیک اس کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ، ان کے شاگردوں، امام ثوری، کوفہ کے دوسرے علماء اور امام اوزاعی کا قول بھی اسی طرح ہے۔ ان کے نزدیک یہ ردّت ہے۔

۵۔ انّ جمیع من سبّ النبیّ صلّی الله علیه وسلّم او عابه او الحق به نقصًا فی نفسه او نسبه او دینه او خصلة من خصاله او عرّض به او شبّهه بشیء علی طریق السّبّ له او الازراء علیه او التصغیر بشانه او الغضّ منه والعیب له فهو سابٌّ لّه والحکم فیه حکم السّابّ یقتل کما نبیّنهٗ ولا نستثنی فصلًا مّن فصول هٰذا الباب علی هٰذا المقصد ولا نمتری فیه تصریحًا کان او تلویحًا .... وهٰذا کلّهٗ اجماعٌ مّن العلماء وائمّة الفتوٰی من لدن الصّحابة رضوان الله علیهم الی هلم جرا [2]۔

---

[1] الشفاء ص ۲۱۵، ج ۲۔ [2] الشفاء ص ۲۱۴، ج ۲۔ الصارم المسلول ص ۵۲۵ (طبع بیروت)

ترجمہ: بے شک ہر وہ شخص جس نے نبی کریم ﷺ کو گالی دی یا حضور ﷺ کی طرف کسی عیب کو منسوب کیا یا حضور کی ذاتِ مقدسہ، آپ کے نسب، دِین یا آپ کی کسی خصلت سے کسی نقص کی نسبت کی یا آپ پر طعنہ زنی کی یا جس نے بطریق سب اہانت یا تحقیر شان مبارک یا ذاتِ مقدسہ کی طرف کسی عیب کو منسوب کرنے کے لیے حضور ﷺ کو کسی چیز سے تشبیہ دِی، وہ حضور ﷺ کو صراحۃً گالی دینے والا ہے، اُسے قتل کر دِیا جائے۔ ہم اِس حکم میں قطعاً کوئی استثنا نہیں کرتے۔ نہ ہم اِس میں کوئی شک کرتے ہیں۔ خواہ صراحۃً توہین ہو یا اشارۃً کنایۃً۔ اور یہ سب علماء اُمت اور اہل فتویٰ کا اجماع ہے۔ عہد صحابہ سے لے کر آج تک۔ (رضی اللہ عنہم)

۶۔ والحاصل انّہٗ لا شكّ ولا شبهة فى كفر شاتم النّبىّ صلّى الله عليه وسلّم وفى استباحة قتله وهو المنقول عن الائمة الاربعة [۱]

ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کو گالی دینے والے کے کفر اور اُس کے مستحق قتل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ چاروں ائمہ (ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل) سے یہی منقول ہے۔

۷۔ كلّ من ابغض رسول الله صلّى الله عليه وسلّم بقلبه كان مرتدًّا فالسابّ بطريق اولى ثمّ يقتل حدًّا عندنا [۲]

ترجمہ: جو شخص رسول اللہ ﷺ سے اپنے دِل میں بغض رکھے وہ مرتد ہے۔ آپ ﷺ کو گالی دینے والا بطریق اولیٰ مستحق گردن زنی ہے۔ پھر (مخفی نہ رہے کہ) یہ قتل ہمارے نزدیک بطور حد ہوگا۔

۸۔ ايما رجل مسلم سبّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم او كذّبه

---

[۱] فتاویٰ شامی حنفی ص ۳۲۱، ج ۳، ونحوہ الصارم المسلول للحنبلی ص ۴۔

[۲] فتح القدیر (امام ابن ہمام حنفی) ص ۴۰۷، ج ۴۔

او عابه او تنقصه فقد کفر بالله وبانت منه زوجته [۱]۔

ترجمہ: جو مسلمان رسول اللہ ﷺ کو سبّ کرے یا تکذیب کرے یا عیب لگائے یا آپ کی تنقیص شان کا (کسی اور طرح سے) مرتکب ہو، تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور اس سے اس کی زوجہ اس کے نکاح سے نکل گئی۔

۹۔ اذا عاب الرّجل النّبیّ صلّی الله علیه وسلّم فی شیء کان کافرا و کذا قال بعض العلماء لو قال لشعر النّبیّ صلّی الله علیه وسلّم شعیر فقد کفر و عن ابی حفص الکبیر من عاب النّبیّ صلّی اللهُ علیه وسلّم بشعرة من شعراته الکریمة فقد کفر و ذکر فی الاصل ان شتم النّبیّ کفر [۲]۔

ترجمہ: کسی شے میں حضور ﷺ پر عیب لگانے والا کافر ہے اور اسی طرح بعض علماء نے فرمایا، اگر کوئی حضور ﷺ کے بال مبارک کو "شَعر" کے بجائے (بصیغہ تصغیر) "شُعَیر" کہہ دے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اور امام ابو حفص الکبیر (حنفی) سے منقول ہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے کسی ایک بال مبارک کی طرف بھی عیب منسوب کیا تو وہ کافر ہو جائے گا اور امام محمد نے "مبسوط" میں فرمایا کہ نبی ﷺ کو گالی دینا کفر ہے۔

۱۰۔ ولا خلاف بین المسلمین ان من قصد النّبیّ صلّی الله علیه وسلّم بذٰلك فهو ممن ینتحل الاسلام انّه مرتد یستحق القتل [۳]۔

ترجمہ: کسی مسلمان کو اس میں اختلاف نہیں کہ جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی اہانت و ایذا رسانی کا قصد کیا اور وہ مسلمان کہلاتا ہے، وہ مرتد مستحق قتل ہے۔

یہاں تک ہمارے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کتاب و سنت اجماعِ امت اور

۱۔ کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۱۸۲، فتاوی شامی ص ۳۱۹، ج ۳

۲۔ فتاوی قاضی خان ص ۸۸۲، ج ۴ (طبع نولکشور) ۳۔ احکام القرآن للجصاص ص ۱۰۶، ج ۳۔

اقوال علمائے دِین کے مطابق گستاخِ رسول کی سزا یہی ہے کہ وہ حدًا قتل کیا جائے۔

اِس کے بعد حسب ذیل اُمور کی وضاحت بھی ضروری ہے:

۱۔ بارگاہِ نبوت کی توہین و تنقیص کو موجب حدّ جرم قرار دینے کے لیے یہ شرط صحیح نہیں کہ گستاخی کرنے والے نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کی غرض سے گستاخی کی ہو۔ یہ شرط ہر گستاخِ نبوت کے تحفظ کے مترادف ہو گی اور توہین رسالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ ہر گستاخِ نبوت اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لیے یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنا میری غرض نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ شرط کتاب اللہ کے بھی منافی ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت ہم لکھ چکے ہیں کہ توہین کرنے والے منافقوں کا یہ عذر کہ "ہم تو آپس میں صرف دِل لگی کرتے تھے۔ ہماری غرض توہین کی نہ تھی۔ نہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل کرنا ہمارا مقصد تھا" اللہ تعالیٰ نے مسترد کر دیا اور واضح طور پر فرمایا لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ بہانے نہ بناؤ، ایمان کے بعد تم نے کفر کیا۔

۲۔ صریح توہین میں نیت کا اعتبار نہیں۔ "رَاعِنَا" کہنے کی ممانعت کے بعد اگر کوئی صحابی نیت توہین کے بغیر حضور ﷺ کو "رَاعِنَا" کہتا تو وہ وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کی قرآنی وعید کا مستحق قرار پاتا، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ نیت توہین کے بغیر بھی حضور ﷺ کی شان میں توہین کا کلمہ کہنا کفر ہے۔

امام شہاب الدین خفاجی حنفی اِرقام فرماتے ہیں:

المدار فی الحکم بالکفر علی الظّواهر ولا نظر للمقصود والنّيّات ولا نظر لقرائن حالہ۔[1]

توہین رسالت پر حکم کفر کا مدار ظاہر الفاظ پر ہے۔ توہین کرنے والے کے قصد و

[1] نسیم الریاض شرح الشفاء ص ۴۲۶، ج ۴

نیت اور اس کے قرائن حال کو نہیں دیکھا جائے گا۔............ ورنہ توہین رسالت کا دروازہ کبھی بند نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ ہر گستاخ یہ کہہ کر بری ہو جائے گا کہ میری نیت اور ارادہ توہین کا نہ تھا۔............ لہٰذا ضروری ہے کہ توہین صریح میں کسی گستاخِ نبوت کی نیت اور قصد کا اعتبار نہ کیا جائے۔

٣۔ یہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کلام میں ننانوے وجوہ کفر کی ہوں اور اسلام کی صرف ایک وجہ کا احتمال ہو تو فقہاء کا قول ہے کہ کفر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ اس کا ازالہ یہ ہے کہ فقہاء کا یہ قول اس تقدیر پر ہے کہ کسی مسلمان کے کلام میں ننانوے وجوہِ کفر کا صرف احتمال ہو، کفر صریح نہ ہو۔ لیکن جو کلام مفہومِ توہین میں صریح ہو اس میں کسی وجہ کو ملحوظ رکھ کر تاویل کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ لفظِ صریح میں تاویل نہیں ہو سکتی۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

قال حبیب ابن الربیع لان ادعاء التأویل فی لفظ صراح لایقبل۔ [1]

ترجمہ: حبیب بن ربیع نے فرمایا کہ لفظِ صریح میں تاویل کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔

کسی کلام کا توہین صریح ہونا عرف اور محاورے پر مبنی ہے۔ معذرت کے ساتھ بطور مثال پیش کرتا ہوں کہ اگر کسی کو ولد الحرام کہا جائے اور کہنے والا لفظ "حرام" کی تاویل کرے اور کہے کہ میں نے "المسجد الحرام" اور "بیت اللہ الحرام" کی طرح معظم اور محترم کے معنیٰ میں یہ لفظ بولا ہے، تو اس کی یہ تاویل کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہ ہو گی کیونکہ عرف اور محاورے میں "ولد الحرام" کا لفظ گالی اور توہین ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ کلام جس سے عرف اور محاورے میں توہین

---

[1] الشفاء ص ٢١٧، ج ٢۔

کے معانی مفہوم ہوتے ہوں، توہین ہی قرار پائے گا، خواہ اُس میں ہزار تاویلیں ہی کیوں نہ کی جائیں۔ عرف اور محاورے کے خلاف تاویل معتبر نہ ہوگی۔

۴۔ یہاں اِس شبہ کو دُور کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر توہین رسول کی سزا حدًّا قتل کرنا ہے تو کئی منافقین نے حضور ﷺ کی صریح توہین کی۔ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ حضور! ہمیں اجازت دیں کہ ہم اِس گستاخ منافق کو قتل کر دیں، لیکن حضور ﷺ نے اِجازت نہیں دی۔

ابن تیمیہ نے اس کے متعدد جوابات لکھے ہیں۔ جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے[1]:

ا۔ اس وقت اُن لوگوں پر حَدّ قائم کرنا فسادِ عظیم کا موجب تھا۔ اُن کے کلماتِ توہین پر صبر کر لینا اس فساد کی نسبت آسان تھا۔

ب۔ منافقین اعلانیہ توہین رسالت نہ کرتے تھے بلکہ آپس میں چھپ کر حضور ﷺ کے حق میں توہین آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔

ج۔ منافقین کے ارتکابِ توہین کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حضور ﷺ سے اُن کے قتل کی اِجازت طلب کرنا اِس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ گستاخِ رسول کی سزا قتل ہے۔

گستاخانِ شانِ رسالت ابو رافع یہودی اور کعب بن اشرف کو قتل کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دِیا تھا۔ اِس حکم کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علم تھا کہ حضور ﷺ کی شان میں توہین کرنے والا قتل کا مستحق ہے۔

د۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے جائز تھا کہ وہ اپنے گستاخ اور مُوذی کو اپنی حیات میں معاف فرما دیں لیکن اُمت کے لیے جائز نہیں کہ وہ حضور ﷺ کے گستاخ کو معاف کر دے۔

---

[1] الصارم المسلول ص ۲۲۲ تا ۲۳۳

نبی اکرم ﷺ اور دیگر انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے اِس حکم کو بجالائے کہ "آپ معافی کو اختیار فرمائیں اور جاہلوں سے منہ پھیر لیں اور نیکی کا حکم دیں۔"

(سورۃ اعراف، آیت ۱۹۹)

میں عرض کروں گا کہ گستاخِ رسول پر قتل کی حَدّ جاری کرنا ایسی حَدّ ہے جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا حق ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی توہین حضور کی اُمت کے لیے بھی سخت ترین اذیت کا موجب ہے اور اِس طرح اِس حَدّ کو پوری اُمت کا حق بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ بواسطہ ذاتِ اقدس کے...... اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنا یہ حق کسی کو خود معاف فرمادیں۔ جیسا کہ بعض دِیگر احکامِ شرع کے متعلق دلیل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن احکام میں حضور ﷺ کو اختیار عطا فرمایا۔ مثلاً حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبردہ کو بکری کے ایک بچے کی قربانی کرنے کا حکم دِیا اور فرمایا:

ولن تجزی عن احد بعدك [1]

کہ (یہ قربانی) تمہارے علاوہ کسی دُوسرے پر ہرگز جائز نہیں۔

اِسی طرح حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ نے حرم مکہ کی گھاس کاٹنے کو حرام قرار دِیا تو حضرت عباس نے عرض کی "اِلَّا الْاِذْخَر" یعنی "اذخر" گھاس کو حرمت کے اِس حکم سے مستثنٰی فرمادیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اِلَّا الْاِذْخَر" یعنی "اذخر" کو حرمت کے حکم سے ہم نے مستثنٰی فرمادِیا [2]۔

اِس حدیث کے تحت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی تحریر فرماتے ہیں:

"و در مذہب بعضے آن است کہ احکام مفوض بُود بوے صلی اللہ علیہ وسلم ہر چہ خواہد و

---

[1] بخاری ص ۸۳۲، ج ۲ [2] بخاری ص ۱۲۱، ج ۱، مسلم ص ۴۳۸، ج ۱

برہر کہ خواہد حلال وحرام گرداند و بعضے گویند با اجتہاد گفت۔ واوّل اصح واظہر است[۱]۔
"یعنی بعض کا مذہب یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ جس کے لیے جو کچھ چاہیں حلال اور حرام فرمادیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ اجتہاد کے طور پر فرمایا تھا اور پہلا مذہب اصح اور اظہر ہے۔"

اِن احادیث کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اختیار حاصل ہو سکتا ہے کہ کسی حکمت و مصلحت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن منافقین پر قتل کی حدّ جاری نہ فرمائیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو یہ اختیار نہیں۔

آخر میں عرض کروں گا کہ توہین رسالت کی حدّ اسی پر جاری ہو سکے گی، جس کا یہ جرم قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو جائے۔ اس کے بغیر کسی کو اس جرم کا مرتکب قرار دے کر قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ تواتر بھی دلیل قطعی ہے۔ اگر کوئی شخص توہین کے کلماتِ صریحہ بول کر یا لکھ کر اِس بات کا اعتراف کرے کہ یہ کلمات میں نے بولے یا میں نے لکھے ہیں تو یقیناً وہ واجب القتل ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے اور کہتا پھرے کہ میری نیت توہین کی نہ تھی۔ یا اِن کلمات سے میری غرض یہ نہ تھی کہ میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچاؤں۔ بہرحال وہ مستحق قتل ہے۔

علیٰ ہٰذا وہ لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین صریح کی تاویل کر کے اس کے مرتکب کو کفر سے بچانا چاہیں بالکل اسی طرح قتل کے مستحق ہیں جیسا کہ خود توہین کرنے والا مستوجب حدّ ہے۔ شاتم رسول کے حق میں محمد بن سحنون کا قول ہم شفاء، قاضی عیاض اور الصارم المسلول سے نقل کر چکے ہیں کہ وَمَنْ شَكَّ فِيْ كُفْرِهٖ وَعَذَابِهٖ كَفَرَ[۲]۔

سید احمد سعید کاظمی

۲۵ نومبر ۱۹۸۵ء

[۱] اشعۃ اللمعات ص ۴۰۸، ج ۲۔ مسک الختام ص ۵۱۲، ج ۲۔

[۲] الشفاء: قاضی عیاض ص ۲۱۵،۲۱۶، ج ۲۔ الصارم المسلول ص ۴۔

اسلاف کی ہڈیاں

از مولوی نور احمد خاں فریدی مع تعاقب (از مدیر مسئول)

محترم فاضل دوست مولانا نور احمد خان صاحب فریدی کا یہ مضمون دِلی شکریہ کے ساتھ ہم ''قائد'' میں درج کر رہے ہیں۔ لیکن دو جگہ تعاقب کرنا پڑا جس کی وجہ سے ہم اپنے فاضل دوست سے شرمندہ بھی ہیں۔ مولانا محترم کے اخلاق کریمانہ سے امید ہے کہ ہمارے اس تطفل سے کوئی ملال محسوس نہ فرمائیں گے اور اگر انہیں ہماری تحقیق سے اختلاف ہو تو ہمیں اس سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

پچھلے دِنوں بیک وقت رسالہ عالمگیر لاہور، پرچم لائل پور، زمیندار لاہور، الفرید چاچڑاں شریف، خیام لاہور اور صبح امید بمبئی میں نیاز مند کا سفرنامہ حجاز شائع ہوا ہے۔ ان میں جنت المعلٰی اور جنت البقیع کے عنوان سے ارضِ مقدس کے دو مشہور قبرستانوں کا بھی حال درج تھا۔

حکومت سعودیہ کی طرف سے ان قبرستانوں سے جو سلوک ہوا ہے اس کا بھی ضمناً ذِکر آیا۔ اس پر سلطان مسقط کے چیف سیکرٹری علامہ احمد شبیلی کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے جھنجھلا کر اپنا مراسلہ صبح امید بمبئی میں شائع کرنے کو بھیجا۔ اس میں لکھا کہ حاجی صاحب مکہ مکرمہ حج کرنے گئے تھے یا قبروں پر فاتحہ پڑھنے؟

شبیلی صاحب کے اس فقرہ سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر ان کے نزدیک قبرستان میں جانا اور فاتحہ پڑھنا روا نہیں ہے تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہی ﷺ نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر اُم المومنین خدیجۃ الکبریٰ کی قبر مبارک پر فاتحہ نہیں پڑھی تھی؟ کیا آنحضرت ﷺ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جنت البقیع میں تشریف نہیں لے جاتے تھے؟ اگر

نبوت قبرستان میں تشریف لے جاتی تھی تو علامہ شبلی کو مجھ پر طنز کرنے کا کیا حق ہے؟ اور اگر کوئی حاجی حج کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ذریات کی قبروں پر فاتحہ پڑھ دیتا ہے تو اس سے حاجی کا حج کس طرح ساقط ہو جاتا ہے؟

آگے چل کر شبلی صاحب نے قبروں کے جواز و عدم جواز پر بحث کی ہے اور بمبئی کے سیٹھوں پر خوب خوب برسے ہیں کہ انہوں نے ام المؤمنین کی قبر پر گریہ کیوں کیا؟ اور ٹوٹی پھوٹی قبروں کے روڑے کنکر کو سر آنکھوں سے کیوں لگایا؟

دنیا میں دو قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ بعض کی عقل پر محبت غالب ہوتی ہے اور بعض کی محبت پر عقل کا تسلط ہوتا ہے۔ جیسا کہ عہد رسالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر بھر بلا ضرورت ایک درخت کی شاخ سے جھک کر گزرتے رہے کہ حضور رسول خدا ﷺ اس کے نیچے سے جھک کر گزرتے تھے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد لمبا نہ تھا اور انہیں جھک کر گزرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل دیکھئے کہ انہوں [1] نے شجر بیعت الرضوان کو یہ کہہ کر کٹوا دیا تھا کہ اس سے شرک پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے جو

ا: انہوں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے شجر بیعت الرضوان کو یہ کہہ کر کٹوا دیا تھا کہ اس سے شرک پھیلنے کا خطرہ ہے۔

فائدہ! تفسیر خازن جلد ۱۶۳ پر بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث مرقوم ہے اور معالم التنزیل میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

عن طارق بن عبد الرحمن قال فطلقت حاجا فمر بقوم یصلون فقلت ما هذا المسجد قالوا هذه الشجرة حیث بایع رسول الله ﷺ بیعة الرضوان فاتیت ابن المسیب فاخبرته فقال سعید کان ابی فی من بایع تحت الشجرة قال فلما اخرجنا من العام المقبل لنسیناها فاصحاب الرسول الله ﷺ لم یعلموها وعلمتموها فانتم اعلم فضحك (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سی طبیعت رکھتے ہیں وہ شخصی محبت سے زیادہ اصول کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طارق بن عبدالرحمن کہتے ہیں میں حج کے لئے چلا تو رستہ میں چند لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیسی مسجد ہے؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے بیعت الرضوان فرمائی تھی۔ یہ سن کر میں سعید ابن مسیب کے پاس آیا اور میں نے انہیں اس واقعہ کی خبر دی۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ میرے والد بھی بیعت الرضوان میں شامل تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ بیعت کے دوسرے سال جب ہم لوگ یہاں آئے تو ہم اس درخت کو بھول گئے۔ وہ درخت ہماری آنکھوں سے چھپ گیا۔ ہم اس پر قادر نہ ہوئے۔ یہ کہہ کر حضرت سعید فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ نے اس درخت کو نہ جانا اور تم نے جان لیا۔ تم ان سے بھی زیادہ جاننے والے ہو۔ یہ فرما کر ہنسنے لگے۔

اس کے بعد علامہ خازن فرماتے ہیں

وفی روایة عن سعید بن المسیب عن ابیه قال لقد رأیت الشجرة ثم اتیتها بعد عام فلم اعرفها

سعید ابن مسیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ان کے والد نے فرمایا وہ درخت (جس کے نیچے بیعت الرضوان ہوئی تھی) میں نے دیکھا تھا پھر ایک سال کے بعد میں وہاں آیا تو میں نے اسے نہ پہچانا۔

علاوہ ازیں ایک اور روایت خازن اور معالم کے اسی مقام پر ہے وھی ھذہ وروی ان عمر بن الخطاب رضی الله عنه مر بذالك المكان بعد ان ذهبت الشجرة فقال این كانت فجعل بعضهم یقول ههنا وبعضهم یقول ههنا فلما كثر اختلافهم قال سیر وا ذهبت الشجرة

درخت بیعت الرضوان کے چلے جانے کے بعد سیدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس جگہ سے ہو کر گزرے۔ آپ نے ہمراہیوں سے فرمایا وہ (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

پسند کرتے ہیں اور اپنی محبت کی معراج محبوب کے مقاصد کی ترویج میں سمجھتے ہیں۔ لیکن جنہیں اپنے محبوب سے والہانہ محبت ہو انہیں محبوب کی ہر شے مرغوب نظر آتی ہے۔ ان کا دِل یہ چاہتا ہے کہ محبوب کی ایک ایک ادا پر جان نچھاور کر دیں۔ اس لئے اگر بمبئی کے سیٹھوں نے ام المؤمنین کی قبر پر گریہ کیا یا میں نے قبر مبارک کے شکستہ پتھروں کو سر آنکھوں سے لگایا تو اس میں علامہ شبلی کو بُرا ماننے کا کیا حق ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) درخت کہاں تھا؟ تو کوئی کہنے لگا کہ یہاں تھا اور کسی نے کہا یہاں۔ جب ان کا اختلاف زیادہ ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا چلو! وہ درخت تو جاتا رہا۔

اس کے بعد تفسیر خازن میں بخاری کی اور حدیث مرقوم ہے۔

عن ابن عمر قال رجعنا من العام المقبل فما اجتمع منا اثنان علی الشجرۃ التی بایعنا تحتھا وکانت رحمۃ من اللہ تعالی

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ ہم آئندہ سال (بیعت الرضوان کے مقام پر) واپس آئے تو ہم میں سے دو آدمیوں کا اتفاق اس درخت پر نہ ہو سکا جس کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی اور وہ درخت کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی۔

ان احادیث کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ شجر بیعت الرضوان بیعت کے دوسرے سال ہی لا پتہ ہو گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود فرما رہے ہیں۔ سیروا ذھبت الشجرۃ (اے لوگو!) چلو (بھی) وہ درخت تو جاتا رہا۔ ایسی صورت میں یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شجر بیعت الرضوان کو کٹوا دیا تھا۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کسی درخت کو کٹوانا ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے کسی اور درخت کو شجرہ بیعت الرضوان سمجھ لیا تھا جیسا کہ طارق ابن عبدالرحمن کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لئے اس درخت کو کٹوا دیا۔ (مدیر مسئول)

سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آنسو:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے عمل سے بھی سرکار دو عالم ﷺ کی قبر مبارک پر گریہ کرنا اور خاک مبارک کو چومنا و سونگھنا ثابت ہے۔ امام نویدی کے الفاظ یہ ہیں۔

اخذت تربة من تراب رسول الله ﷺ فشمته ثم انشاءت تقول ۔

ماذا على من شم تربة احمد ان لا يشم مدى الزمان غواليا

صبت على مصائب هوانها ان صبت على الايام صرن لياليا

الشیخ سمہودی المدنی اپنی شہرہ آفاق تصنیف وفاء الوفاء میں بروایت امام طبرانی وابن شیبہ تحریر فرماتے ہیں ہیں کہ جب جنابہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی قبر پر حاضر ہوئیں اور سرہانے بیٹھ کر رونے لگیں۔ آں حضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فوراً بقیع میں تشریف لے آئے اور معصومہ کے دوپٹہ کے دامن سے معصومہ کے آنسو پونچھے اور پیار سے صبر کی تلقین فرمائی۔ امام کی اصل عبارت یہ ہے۔

لما ماتت رقية بنت رسول الله ﷺ بكت فاطمة رضى الله عنها على شفير القبر فجعل النبى ﷺ يمسح الدموع عن عينها بطرف ثوبة

اگر یہ صحیح ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی بہنوں کی قبروں پر گریہ کیا ہے اور اگر بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبر مبارک پر رونا اور خاک مبارک سے اپنے چہرے کو آلودہ کرنا ثابت ہے تو شبلی صاحب کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ ام المؤمنین کی قبر پر گریہ کرنے کے جرم میں ہمیں موردِ الزام ٹھہرائیں۔ آنسو خوشی سے بھی نکل پڑتے ہیں۔ وفورِ محبت سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ اگر مدتوں کے بچھڑے ہوئے بچے کو یوں اچانک اپنی والدہ محترمہ کا شرف نیاز حاصل ہو جائے تو اس کی

آنکھوں سے خوشی کے آنسو کیوں نہ ٹپکیں اور اگر کوئی اپنی ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کی یاد میں آنکھوں سے چند گرم گرم قطرے ٹپکا دے تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور شبیلی صاحب کو اس سے شرک کی بو کیسے آنے لگتی ہے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ

سلطان ابن سعود نے قبروں کو گرا کر اسلام کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی داد شبیلی صاحب جیسے معدودے چند آدمیوں کے سوا کسی نے نہیں دی۔ بلکہ غیر اسلامی دنیا نے بھی اسے بری طرح محسوس کیا ہے۔ کوئی زندہ قوم اپنے بزرگوں کی یاد گاروں کو مٹایا نہیں کرتی۔ اسلامی تاریخ سلطان ابن سعود کے سوا اور کوئی بادشاہ ایسا پیش نہیں کر سکتی جس نے اپنے بزرگوں کی قبروں پر ہل چلائے ہوں۔ شبیلی صاحب لکھتے ہیں۔

"رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو قبروں کو پاٹنے اور مورتیوں کو توڑنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔"

لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ قبریں مسلمانوں ہی کی تھیں۔ "روانہ" کا لفظ صاف دلالت کرتا ہے کہ جو قبریں گرانی مقصود تھیں وہ مدینہ شریف کے باہر تھیں اور یہ چھوٹی موٹی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اچھی طرح سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ مسلمانوں کی قبریں عہد رسالت میں مدینہ عالیہ تک محدود تھیں، یا اُحد اور بدر کے مقامات پر شہداء دفن تھے۔ اگر شارع ﷺ ان کی قبریں گراتے تو بنواتے ہی کیوں؟ حالانکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہے کہ حضرت نے نہ صرف قبریں بنوائیں بلکہ کتبے بھی لگوائے۔ علامہ امام سمہودی رحمۃ اللہ علیہ "وفاء الوفاء" میں لکھتے ہیں کہ جب[1] حضرت نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو دفن فرمایا تو اس کی قبر کے سرہانے سنگین کتبہ لگوایا۔

---

۱ : جب حضرت نے عثمان بن مظعون کو دفن فرمایا تو اس کی قبر کے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

امام کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سرہانے سنگین کتبہ لگوایا۔

قائد: حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر شریف کے سرہانے جس پتھر کا ذکر امام سمہودی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں وہ وہی پتھر ہے جو ابوداؤد کی روایت میں مذکور ہے، جس کے متعلق حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا اُعْلِمُ بِهَا قبرَ اَخِیْ وَاُدْفِنُ اِلیه مَن مات مِن اَهْلِی "۔ یہی پتھر ان کے مزار اقدس کی علامت تھا، کتابت کا ذکر نہ حدیث میں ہے نہ امام سمہودی کی عبارت میں کوئی ایسا لفظ ہے جس سے کتبہ مراد لیا جا سکے۔ یہ مخصوص سنگین پتھر جو قبر کے سرہانے رکھا گیا بس اسی کو علامت کے لئے رکھا گیا تھا۔ یہ نہیں کہ اس پر کتابت کرائی گئی ہو۔

رہا کتابت علی القبور کا مسئلہ:۔ تو اس کے متعلق سر دست ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مرقات شرح مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۳۷۱ سے نقل کرتا ہوں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ قبروں اور مسجد کی دیواروں پر کتابت کے مکروہ ہونے کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وَقیل یسن کتابة اسم المیت لا سیما للصالح لیعرف عند تقادم الزمان لان النهی عن الکتابة منسوخ کما قاله الحاکم او محمول علی الزائد علی ما یعرف به حال المیت اھ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ میت کا نام لکھنا مسنون ہے خصوصاً صالحین کے نام تو ضرور لکھے جائیں تاکہ عرصۂ دراز گزر جانے کے بعد ان کی پہچان ہو سکے۔ اس لئے کہ نہی عن الکتابۃ منسوخ ہو چکی ہے۔ جیسا کہ حاکم نے کہا ہے۔ یا اس نہی کا مطلب یہ ہے کہ جتنی کتابت سے میت کا حال معلوم ہو سکے اس سے زیادہ لکھنا ممنوع ہے۔

اس کے بعد ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ محاکمہ فرماتے ہیں۔ وفی قوله یسن محل بحث والصحیح ان یقال انه یجوز انتهی۔ کتابت اسم میت کا مسنون ہونا محل بحث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کو جائز کہا جائے۔ (مدیر مسئول)

لما دفن النبی ﷺ عثمان بن مظعون امر بحجر فوضع عند رأسه الی اخرہٖ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدینہ سے روانگی ہی اس امر کی قوی دلیل ہے کہ جن قبروں کے پاٹنے کا انہیں حکم ہوا تھا وہ کفار اور یہود کی قبریں تھیں۔ اگر مسلم قبور کا گرانا مقصود ہوتا تو انہیں پہلے سے تعمیر ہی نہ کیا جاتا۔ کیونکہ اکثر و بیشتر قبریں حضرت کی موجودگی ہی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ کیا شبیلی صاحب بتا سکتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کس موقعہ پر یہ حکم صادر فرمایا۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کس جانب تشریف لے گئے اور کن کن قبروں کو منہدم کر کے زمین کے برابر کیا۔

اگر شبیلی صاحب نے نیازمند کی گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ عہد نبوی میں سوائے چند صحابیوں کے اور کوئی فوت ہوا ہی نہیں۔ زیادہ تر وہ قبریں وجود میں آئیں جو جنت البقیع اور بدر و اُحد کے مقامات پر لڑائیوں کے سبب بن گئی تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ عہد رسالت اور خلاف راشدہ کے دور میں ان قبروں میں سے کسی قبر کو زخم نہیں پہنچا۔

ریاض کی قبریں

جب اُحد کی تلہٹی سے امیر معاویہ نہر نکالنے لگے تو اس موقع پر شہدائے اُحد کی چند لاشوں کو منتقل کیا گیا تھا جس کا ذِکر صاحب وفا نے تفصیل سے کیا ہے۔ اگر زمانہ نبوت یا خلافت میں کوئی قبر گرائی جاتی تو اس کا ذِکر صحاح ستہ میں ضرور ہوتا۔ تعجب اس امر کا ہے کہ سلطان کے پایۂ تخت ریاض میں جو شاہی قبرستان ہے اس میں اونٹوں کے کوہان کی مانند قبریں دندنا رہی ہیں، ان پر تو سلطان کی اسلامی حمیت کو جوش نہیں آتا۔ لیکن قبرستان بقیع و معلات تہس نہس کر دیئے گئے۔ کیا ان کا مرتبہ ریاض

کے قبرستان سے کم تھا؟

۵ ردسمبر کا ''زمیندار'' لاہور اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ ۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء بروز جمعرات سہ پہر کے قریب سلطان مسقط قائد اعظم کے مزار پر گئے اور مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد پھول چڑھائے۔ یہ علامہ شبیلی کے سلطان المعظم کا فعل ہے۔ اگر مزارات پر پھولوں کا چڑھانا شرعاً ممنوع ہے تو پھر کم از کم وہ ہر جگہ متشرع ہونے کا ثبوت دیں۔ اگر قائد اعظم کے مزار پر پھول چڑھائے جا سکتے ہیں تو ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر مبارک پر کونسی چیز مانع آ سکتی ہے۔

آپ ہی اپنے ذرا طرزِ عمل کو دیکھیں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

محاکمہ

لیکن میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ قبروں پر شاندار مقبرے بنوائے جائیں۔ اگر شبیلی صاحب نے میرے مضمون کو غور سے پڑھا ہے تو انہیں یہ سطریں صاف نظر آتی ہوں گی۔

''اگر سعودی حکومت کو قبروں سے چڑ ہے تو قبریں نہ سہی لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ کے اجداد دفن ہوں اسے صاف بھی نہ رکھا جائے۔ زیادہ نہ سہی زمین کو ہموار کر کے ان پر سفیدی سے یا اینٹوں سے قبر کا نشان بنا کر سرہانے نام کی تختی لگا دی جائے۔''

فرمائیے! اس بیان سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ میں مقبروں کی تعمیر کے لئے سلطان کو متوجہ کر رہا ہوں۔ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ جہاں خاندانِ نبوت دفن ہے اسے بے ادبی سے بچایا جائے۔ حج کے موقع پر جب اکنافِ عالم سے لاکھوں آدمی یہاں آ کر جمع ہوتے ہیں تو ایسے مقامات کا جب تک ان پر کوئی امتیازی نشان نہ ہو

خرابی سے بچنا محال ہے۔ ایسے مردانِ کامل کی پاکیزہ ہڈیوں کو جنہوں نے اسلام کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں بے ادبی سے بچانا ضروری ہے۔ حکومت سعودی نے مکہ مکرمہ کے اور بھی بہت سے مقدس مقامات کو غیر محفوظ کر دیا ہے۔ جیسے مولد النبی ﷺ اور مولد فاطمہ رضی اللہ عنہا۔ جس کے بارے میں تاریخ الخمیس میں لکھا ہے۔

وھو افضل الموضع بمکۃ بعد المسجد الحرام

جس جگہ کو مسجد الحرام کے بعد افضل ترین بتایا جا رہا ہے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ غلاظت اور گندگی کے انبار لگے ہیں۔

شبلی صاحب کی اور غلط بیانی:

شبلی صاحب لکھتے ہیں۔

''حاجی صاحب کو سخت افسوس ہے کہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مکہ میں کیوں وفات پائی۔ ہندوستان میں وفات پاتیں۔ تو ان کا مزار رشک تاج محل بناتے اور ان کی پوجا کرتے۔''

اب میری عبارت کا ملاحظہ ہو۔

''میرے سامنے بمبئی کے سیٹھوں نے ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر پر گریہ کیا اور روتے ہوئے کہا کہ اے سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدۂ محترمہ، اے آقائے دو جہاں کی ملکہ، اگر تیری قبر ہندوستان میں ہوتی تو ہم تیرا مقبرہ ایسا خوبصورت بناتے کہ تاج محل بھی رشک کھاتا۔''

محولہ بالا بیان میرا کہاں ہے کہ شبلی صاحب لٹھ لے کر میرے پیچھے دوڑ پڑے ہیں۔ اگر اس صراحت کے بعد بھی وہ مجھے کوستے رہیں تو ان کی قوتِ فیصلہ کا خدا

حافظ۔

اگرچہ بمبئی کے سیٹھوں کی موجودہ سیاسی حالت حجاز کے مقابلہ میں بھی قابل رحم ہے۔ تاہم یہ فقرات ان کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ ان میں انہوں نے صرف یہ ظاہر کیا کہ یہاں ہماری سنی نہیں جاتی۔ اگر تیری قبر ایسی جگہ ہوتی جہاں ہمیں اس کی تعمیر کا پورا اختیار ہوتا تو تاج محل سے بھی زیادہ حسین مقبرہ بنا کھڑا کرتے۔

(ماہنامہ ''قائد'' ملتان ماہ اپریل ۱۹۵۰ء، جلد ۲، شمارہ ۳، ص ۲۷ / ۳۲)

آدم!

(''فریدی وجدی'' مع تعاقب از مدیر مسئول)

اعتقادی دنیا کا عقیدہ ہے کہ آدم ابو البشر ہیں اور آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل پیدا ہوئے۔ مذہب عیسوی کی کتابوں میں طوفانِ نوح اور ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ۲۳۰۸ سال کا فاصلہ اور حضرت عیسیٰ و حضرت آدم علیہما السلام کے درمیان ۴۰۰۴ سال کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے ہمارے اور حضرت آدم علیہ السلام کے مابین ۵۹۱۴ سال سے زیادہ کا فصل نہیں ہوتا۔

فلاسفہ[1] اس حساب کو غلط قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چھ ہزار سال کے عرصہ میں نوعِ انسانی اور ان کی زبانوں، مذہبوں اور جسموں میں ایسا عظیم اور نمایاں اختلاف و تغیر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ تحقیق و تفتیش سے ثابت ہوتا ہے۔

---

[1]: قائد: فلاسفہ کی وہ تحقیق و تفتیش جس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ''چند ہزار سال میں نوعِ انسانی اور ان کی زبانوں، مذہبوں اور جسموں میں ایسا نمایاں اختلاف و تغیر نہیں ہو سکتا۔'' کی بنیاد عقل ہو گی یا نقل، نقل سے اس امتحان کا ثبوت ظاہر البطلان ہے، کیونکہ نقلیات اور سمعیات کی بنا مذہب ہے یا تاریخ: یہ بحث چونکہ دائرۂ مذہب سے باہر ہو رہی ہے اس لئے مذہبیات سے کسی نقل کے پیش ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی تاریخ تو اس زمانہ کی تاریخ تاریخی حیثیت سے اس دنیا میں موجود نہیں۔ لہٰذا نقلیات سے اس استحالہ کا ثبوت ناممکن ہے۔

اب اگر اس تحقیق و تفتیش کا منشی عقل کو قرار دیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ دنیا کا کوئی عقلمند چند ہزار سال کے عرصہ میں نوعِ انسانی کے اس تغیر و اختلاف کے استحالہ پر دلیل قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس انسان کی ذات نہایت مختصر عرصہ میں اس سے زیادہ عظیم الشان تغیر و اختلاف کی حامل ہے جس کو قرآن کریم نے نہایت حکیمانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

قدیم ترین مصری آثار جو آج سے چار ہزار سال قبل کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں ہم کو افریقہ اور سویز کے درمیانی علاقہ میں مختلف قوموں کے مجسمے اور شکلیں ایسی نظر آتی ہیں جن کی شکل، کھوپڑی، ناک، کان، بال اور رنگ وغیرہ زمانہ موجودہ کے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ طوفانِ نوح علیہ السلام اور مصر کے آثارِ قدیمہ کے مابین جو قلیل مدت بتائی جاتی ہے وہ قوموں کے درمیان اس حد تک اختلاف و انقلاب جسمانی کے لئے کافی ہو۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم وجودِ انسان کو چھ ہزار سال سے دسیوں ہزار سال پہلے فرض کریں جو ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والی قوموں کے اس حد تک اختلاف جسمانی کے لئے کافی ہو سکے۔

وجودِ انسانی کی تاریخ پر ہر زمانہ میں کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس

بقیہ صفحہ گزشتہ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ○ ''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ماں کے پیٹ میں نطفہ بنایا۔ پھر نطفہ کو خون بستہ کیا۔ پھر خون بستہ کو گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ پھر ہم نے اسے دوسری مخلوق بنایا (یعنی جسم کا ڈھانچہ مکمل کر کے اس میں روح ڈالی) پس بڑی برکت والا ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے۔'' غور فرمائیے جوہر سے جسم، جسم سے جماد، جماد سے نبات، نبات سے حیوان (جاندار) اور حیوان سے انسان وجودِ انسانی میں یہ کتنے بڑے عظیم القدر تغیرات اور اختلافات ہیں اور کتنے مختصر عرصہ میں نمایاں ہوئے جو مخلوق قلیل ترین زمانہ میں جنسی اور ذاتی اختلافات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اگر ہزاروں برس کے طویل عرصہ میں اللہ تعالیٰ اس کو محض عارضی اختلافات و تغیرات کا محل بنا دے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ اور کونسی دلیل اس کے ناممکن ہونے پر قائم ہے؟

باب میں آج تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ ظنی و تخمینی ہے۔ مصر قدیم کے ایک بادشاہ نے نیتوں کے مشہور عالم ہیئت بطلیموس پلاؤلف کو دوسو برس قبل مسیح حکم دیا تھا کہ قدماء مصر کے قدیم ترین زمانوں کا حساب لگا کر حدود قائم کرو تو اس نے تقریباً ۳۵۰۰۰ سال مقرر کئے۔ ایک دوسرے یونانی مؤرخ ''دیودور'' صقلی نے جو عین ولادتِ مسیح کی صدی میں ہوا ہے تقریباً ۲۲۵۰۰۰ سال کا اندازہ کیا ہے۔ مؤرخ کلدانی ''بیرور'' جو تیسری صدی قبل مسیح میں تھا اس نے کلدانی قبائل کی مدت کو ۴۳۰۰۰۰ سال بتایا ہے اور طوفانِ نوح اور ملکۂ بابل ''سمیر امیس'' کے مابین ۳۵۰۰۰ سال کا فاصلہ قرار دیا ہے۔ لیکن عصر حاضر کے محققین و مؤرخین انسان اول کے وجود کی تاریخ کو علم طبقات الارض (جیلوجیا) کے ذریعہ مقرر کرنے پر اعتماد کرتے ہیں۔

ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات کیا ہیں؟ مسٹر ''ہارنز'' اپنی تحقیقات و قیاسات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فرش زمین پر انسان کا وجود اب سے ۳۰۰۰۰ سال پہلے سے ہے۔

امریکہ کے ایک ماہر طبقات الارض مسٹر ''بونیٹ ڈالڈن'' نے ایک قدیم ترین کھوپڑی کو دیکھ کر جو زمین کی تہ سے برآمد ہوئی تھی اندازہ کیا ہے کہ وہ ۱۵۸۴۰۰ سال سے کم کی نہیں۔

غرض مذہبی، لوگوں اور فلسفیوں کے درمیان زمین پر وجودِ آدم کی تاریخ میں بڑا کافی اختلاف ہے۔ ہمیں اس کا حل اس صورت میں کرنا لازمی ہے کہ روح اسلام سے مطابق ہو سکے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم اور احادیث صحیحہ زمین پر وجودِ آدم کی تاریخ سے متعلق کوئی خاص تصریح نہیں کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے جو تصریحات بیان کی ہیں وہ سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ اسلامی محققین و مؤرخین کی کتابوں میں جو تفصیلات دی گئیں ہیں وہ علوم عصری اور کم از کم موجودہ محققین کے

دعووں سے اتفاق کی گنجائش رکھتی ہیں۔ علاؤ الدین علی البسوی اپنی کتاب "محاضرۃ الاوائل" مؤلفہ ۹۸۸ھ میں بیان کرتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو زمین نے ان سے کہا کہ اے آدم! تو مجھ پر کب آیا؟ جبکہ میری نئی بہار، تازگی اور جوانی رخصت ہوگئی اور میں پرانی یعنی قریب الفنا ہوچکی۔

پھر کہتے ہیں کہ بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ زمین پر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے گوشت خون والی ایک مخلوق موجود تھی جس کی شہادت قرآن مجید کی اس آیت سے ملتی ہے۔ قَالُوٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ الخ
فرشتوں[1] نے یہ بات اپنے عینی مشاہدہ کی بناء پر کہی ہوگی؟

---

[1] قائد: مفسرین کی تصریحات کو تو آپ یہ کہہ کر ٹھکرا رہے ہیں کہ "یہ سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں زمین پر وجود آدم کی تاریخ سے متعلق کوئی خاص تصریح نہیں ہے۔" لیکن ملحدین، فلاسفہ کے مسلک کی تائید میں آپ ان تمام بے سروپا تصریحات سے استدلال کرتے چلے جا رہے ہیں، جن کی صحت پر ان معترضین کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں۔ آپ ہی بتائیے جن تاریخوں میں آیا ہے کہ زمین پر تخلیق آدم سے پہلے گوشت خون والی ایک مخلوق موجود تھی ان کا ماخذ کیا ہے؟ اگر تعصب اور تنگ نظری سے الگ رہتے ہوئے کتاب، محاضرۃ الاوائل سے منقولہ روایت پر غور کیا جائے (جس سے آپ فلاسفہ کے نظریہ کی تائید فرما رہے ہیں) تو اس سے بھی مذہبی تصریحات کی تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر اس وقت آئے جب وہ قریب الفنا تھی۔ معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام اور قیامت کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے۔

رہی یہ بات کہ حدیث مذکور میں یہ بھی موجود ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر گوشت اور خون والی مخلوق موجود تھی تو اس سے مذہبی نظریہ کی تردید نہیں ہوسکتی کیونکہ گوشت اور خون والی مخلوق صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی ہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ آدم خلیفۃ اللہ علیہ السلام سے

پھر کہتے ہیں کہ تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ لوگ اگلوں کے خلاف تھے، خدا نے ان میں یوسف نام کے ایک نبی کو بھیجا تو ان لوگوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ پھر

بقیہ صفحہ گزشتہ: ہزاروں برس پہلے زمین پر مخلوق ہوئی ہو اور قبل از آدم اس پر جانور رہتے ہوں (جو گوشت اور خون والی مخلوق ہے۔)

ہماری بحث جانوروں کی تاریخ سے متعلق نہیں۔ ہم تو تاریخِ آدم کی بابت گفتگو کر رہے ہیں۔ بنابریں اس حدیث کو فلاسفہ کے نظریہ کی تائید میں پیش کرنا کسی طرح دروست نہیں ہوسکتا۔

آپ کا یہ کہنا کہ "فرشتوں کا قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ الخ اس کا مؤید ہے، کیونکہ فرشتوں نے یہ بات اپنے عینی مشاہدہ کی بناء پر ہی کہی ہوگی۔" کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ فرشتے جو عقل محض ہیں اتنی بات نہیں سمجھ سکتے کہ آدم علیہ السلام جس کی تخلیق آگ، پانی، ہوا، مٹی عناصرِ متضادہ سے ہو رہی ہے طبعاً اختلاف کا حامل ہوگا، جو حد سے متجاوز ہو کر فساد اور خونریزی پر منتج ہوسکتا ہے۔

اہل مذہب نے اس سلسلہ میں جو تصریحات کی ہیں کسی نہ کسی حد پر مذہبی نظریات سے اس کی تائید ملتی ہے۔ جیسا کہ تخلیق آدم علیہ السلام سے متعلق آپ نے آیاتِ قرآنیہ کا خلاصہ درج کیا ہے۔ ان آیات کا ایک ایک لفظ مذہبی تصریحات کا مؤید ہے۔ لیکن ملحدین، فلاسفہ اور جدید تحقیقات کا کوئی نظریہ قرآن کریم یا کسی حدیث سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔

مذہب سے بیگانہ تحقیقات اور ملحدینِ زمانہ کے ذاتی نظریات کی تائید و حمایت میں قرآنِ حکیم کی صاف اور واضح آیتوں میں بعید ترین تاویلیں اور دُور از کار پیوندکاریاں در حقیقت ان ملحدین، فلاسفہ اور لامذہب سائنسدانوں کے سامنے اہلِ مذہب کا اعترافِ شکست، بلکہ الحاد و زندقہ کے ہاتھوں مذہب کو ذبح کرنا ہے۔

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ اپریل ۱۹۵۰ء جلد ۲ شمارہ ۳ ص ۲۴ تا ۲۶)

محقق[1] موصوف لکھتے ہیں کہ فتوحات مکیہ میں شیخ محی الدین اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے حدوث عالم کے باب میں کیا خوب کہا ہے کہ

میں نے ایک مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف ایک ایسی جماعت کے ساتھ کیا جنہیں میں شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ اس جماعت میں سے کسی نے دو شعر پڑھے۔ جن میں سے مجھے ایک یاد رہ گیا اور دوسرا فراموش ہو گیا۔ وہ شعر یہ ہے۔

لقد طفتم کما طفنا سنینا بھذا البیت طرا اجمعونا

۱؎: قائد: محقق موصوف کی تحقیق کا حال تو اُس وقت معلوم ہوتا جبکہ وہ شیخ اکبر علیہ الرحمۃ کی عبارت نقل فرماتے۔ بر تقدیر صحت عرض ہے کہ شیخ اکبر جیسے صوفی کے کشف سے تاریخی مسائل میں استدلال سمجھ میں نہیں آتا۔ تاریخی مسائل جو محض سطحی اور ظاہری مسائل ہیں ان کے ثبوت میں کشفیات (جو مبہم اور مجمل حقیقت کی ایک اجمالی تصویر کا نام ہے) پیش کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ رہی وہ حدیث جسے آپ کشف کا مؤید سمجھ رہے ہیں۔ فلاسفہ کے نظریہ کی تائید سے بالکل ساکت ہے۔ ایک لاکھ یا ایک آدم میں اختلاف نہیں۔ گفتگو اس امر میں ہے کہ فلاسفہ جو یہ کہتے ہیں کہ قوموں کے اندر اتنا زبردست اختلاف و انقلاب چند ہزار سال کے قلیل عرصہ میں نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم وجود انسانیت کو لاکھوں سال پیشتر فرض کریں۔ اس کا ثبوت نہ حضرت شیخ اکبر علیہ الرحمۃ کے کشف سے ہوتا ہے نہ حدیث سے۔ علاوہ ازیں جماعت انبیاء علیہم السلام میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی شامل ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ کہنا کہ آپ کا علم ہی ابتداء عالم سے قاصر و منقطع ہے، کسی طرح صحیح نہیں۔ بخاری اور مسلم میں صاف اور واضح حدیثیں موجود ہیں، جن میں بصراحت مذکور ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتداء آفرینش عالم سے لیکر دخولِ جنت و نار تک ذرہ ذرہ کے تفصیلی حالات بتمام و کمال بیان فرما دیئے۔ مبداء، معاد اور معاش، اور جمیع مخلوقات کے احوال بتائے اور یہ سرکار کا معجزہ ہے کہ صبح سے شام تک جمیع ما کان و ما یکون کا علم ظاہر فرما دیا۔ ملخص عینی وغیرہ

میں نے ان میں سے ایک شخص سے دریافت کیا۔ آپ کون لوگ ہیں؟

اُس نے جواب دیا ہم تمہارے اجداد اولین میں سے ہیں۔

میں نے پھر سوال کیا۔ آپ کس زمانہ کے لوگ ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ کچھ اوپر چالیس ہزار سال پہلے کے۔ میں نے کہا۔ آدم تو اس سے بہت قریب زمانہ کے ہیں۔ تو اس نے کہا تم کس آدم کی بات کہتے ہو؟ یہ آدم جو تم سے بہت قریب زمانہ کے ہیں یا دوسرے آدم کے متعلق؟ یہ سن کر میں فکر میں پڑ گیا اور مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی مجھے رسول اللہ ﷺ کی حدیث یاد آ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے پہلے جن کا حال ہمیں معلوم ہے ایک لاکھ آدم اور پیدا کئے ہیں۔"

ایسی ہی ایک روایت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ پھر شیخ اکبر نے فتوحات میں بیان فرمایا ہے کہ "میں نے ایک مرتبہ عالم ارواح میں ادریس علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے اپنے اس کشف اور اس سے متعلق اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا۔ اس لئے کہ ہر ایک وہ کشف جس کی تائید حدیث صحیح سے نہ ہو محققین کے نزدیک قابل توجہ نہیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا "یہ حدیث بھی صحیح ہے اور اس کی بابت تمہارا مکاشفہ و مشاہدہ بھی درست ہے۔ ہم انبیاء کی جماعت حدوث عالم پر ایمان رکھتی ہے اور تعینات و تکوینیات کے مبداء سے ہمارا علم انقطاعی ہے۔"

شیخ اکبر قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حدوث عالم کے باوجود ابتداء تاریخ عالم کا علم باتفاق انبیاء و اولیاء و مجتہدین مجہول [1] ہے، اگرچہ متقدمین و متاخرین فلاسفہ اس کے خلاف نہیں لیکن ان باتوں پر توجہ نہیں کرتے جو محض جاہل مورخین نے بیان کی

---

[1]: فن کی حیثیت سے جس طرح دیگر علوم و فنون ہیں اسی طرح تاریخ عالم کا علم لوگوں میں نہیں پایا جاتا۔ یہ مطلب نہیں کہ بطور علوم اسرار کے بھی کسی کو یہ علم حاصل نہیں ہوا۔

ہیں۔ واللہ اعلم اتم۔

اس موضوع پر یہ چند روایات ہیں جن سے نظریہ اسلام کی اتنی وسعت ثابت ہوتی ہے کہ جدید بحثیں اس کے اندر سما سکتی ہیں[1]۔

تخلیق آدم کے باب میں اہل مذاہب اور فلاسفۂ عصر کا اختلاف ہے اور یہ مسئلہ ایک حیثیت سے زمین پر وجود آدم کی تاریخ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اہل مذہب تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر آدم علیہ السلام کو مٹی سے اس کی اپنی صورت اصلی پر بنایا اور پھر اس کے قالب میں اپنی روح پھونک کر مکمل بشر بنا دیا۔ فلاسفۂ عصر کہتے ہیں کہ یہ بات عقل اور عادت خالق دونوں کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتداءً زمین پر بہت چھوٹی سی شکل کا ایک ادنیٰ حیوان تھا پھر بعض موثرات طبعی سے اس کی ہیئت جسمانی میں تغیر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اضطراری طور پر اس کی طرز معیشت میں تغیر واقع ہو کر طول زمانہ اور مختلف موثرات کے باعث اس کی صفات میں تغیر و تبدل پیدا ہو گیا اور اس تغیر و تبدل نے اس کی جنس میں امتیاز اور ترقی پیدا کر دی اور وہ اپنے دوسرے زیرِ اثر حیوانات پر غلبہ و تسلط حاصل کرتا گیا ہو اور حیوانات غیر اختیاری طور پر ان ہزاروں سال کے عرصہ میں اُس کے زیرِ اثر اور محکوم ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ اُس نے بندر کی شکل[2] اختیار کر لی اور اُسی سے حیوان کی ایک ایسی ترقی یافتہ قسم پیدا ہوئی جو بندر اور انسان کی درمیانی حالت میں تھی اور پھر اُس

۱: جی ہاں! حقانیت و صداقت کا ہر پہلو اسلام میں اپنی جگہ رکھتا ہے لیکن باطل کے لئے حق کے دامن میں کوئی گنجائش نہیں۔ ۱۲

۲: بندر سے انسان ہونا عجیب تھیوری ہے۔ اکبرالہ آبادی نے کیا خوب فرمایا ہے

کہا منصور نے، خدا ہوں میں — ڈارون، بولے بوزنا☆ ہوں میں (☆بندر)

مجھ سے کہنے لگے مرے اک دوست — فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

سے موجودہ شکل وصورت کا انسان عالمِ وجود میں آیا۔

یہ خلاصہ ہے ڈاروین کی تھیوری کا جس کو ہم نے لفظ ''ڈاروین'' کی تشریح کے سلسلہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفیوں اور مذہبی لوگوں کا اس مسئلہ میں بڑا بھاری اختلاف ہے۔ ہم یہاں اس کی صراحت کئے دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ موجودہ علمی ورسمی عقیدہ ہے۔ دنیا کا رجحان زیادہ تر اسی نظریہ کی طرف ہے اور دوسرے نظریہ کے ماننے والوں کی تعداد کم ہے۔ لیکن یہ رائے آج تک ظنی ہی رہی مرتبۂ تحقیق تک نہیں پہنچ سکی۔ اس لئے کہ بندر اور انسان کے درمیان کی متوسط مخلوق مفقود ہے، روئے زمین پر اس کا کہیں پتہ نہیں مل سکا اور جب تک ایسی مخلوق کا وجود ثابت نہ ہو جائے اس نظریہ کی صحت پر کوئی عقلی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر بھی فلاسفہ نے دوسرے نظریات وآراء کو نظر انداز کر کے راز تخلیق کے اسباب کی سہولت کے پیش نظر اسی نظریہ اور رائے کو پسند کر لیا ہے۔

کیا یہ عقیدہ دین[1] کے منافی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ عہد حاضر میں اس کا جواب دینا کوئی آسان بات نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم موضوع پر ہم کافی غور وخوض کریں تا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے یقینی[2] علم کا دروازہ کھول دے۔

۱: قائد: دین سے مراد اگر الہام ربانی اور تعلیمات نبوی ہیں تو یقیناً یہ عقیدہ دین کے منافی ہے۔ جب قرآن کریم نے تخلیق سے متعلق صاف لفظوں میں بار بار فرما دیا کہ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ (میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں) خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا) خَلَقْتُهٗ بِيَدَیَّ (میں نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (جب میں اس کا پتلا تیار کر کے اس میں روح مقدس پھونک دوں تو (اے فرشتو!) تم اس کے لئے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑو) (مدیر مسئول)

۲: قائد! اللہ تعالیٰ نے علم یقینی کا دروازہ کھولا ہوا ہے اور وہ قرآن کریم ہے۔ قرآن سے الگ ہو کر

اگر یہ ڈارونی تھیوری صحیح ثابت ہو جائے تو خلقت آدم علیہ السلام کے متعلق جو آیاتِ قرآن وارد ہوئی ہیں ان کے ظاہر معانی[۲] کی تاویل کرنا آسان ہو جائے گا۔

بقیہ صفحہ گزشتہ: علم یقینی کی تلاش بے سود ہے۔ اگر انسان اپنی ناقص عقل کے ذریعہ ہر چیز کا علم یقینی حاصل کر سکتا تو الہام ربانی اور سلسلۂ نبوت بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ ان فلسفیوں اور عقل کے اندھوں کے متعلق قرآن حکیم نے بار بار فرمایا اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ قرآن حق وصداقت اور علم ویقین کی راہ پر چلاتا ہے اور اپنی عقل پر اعتماد کرنے والے شکوک واوہام کے گڑھوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ خدا کی شان یہ طبقہ اپنے ثابت کردہ مسائل اور نظریات کی صحت وحقانیت پر خود بھی مطمئن نہیں۔ جیسا کہ آپ تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ~~لیکن یہ رائے آج تک ظنی ہی رہی مرتبہ تحقیق تک نہیں پہنچ سکی~~۔ حیرت ہے کہ جو چیز آپ کے نزدیک قطعی ہے اُس میں تاویل کرنا آپ بہت آسان سمجھتے ہیں اور جس دعوے کا ثبوت آپ کی تصریحات کے بموجب آج تک ظنی ہو اُس کی تائید وتقویت کے لئے آپ اپنا بہترین سرمایۂ علم ویقین قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں فرماتے۔

قرآن حکیم کے خلاف اپنے مزعومہ نظریات فاسدہ کے مابین اگر بذات خود بھی اُن کی واقعیت وقطعیت کے مدعی ہوتے تو اُس صورت میں آپ کا ان کی تائید وحمایت کرنا چنداں مضحکہ خیز نہ ہوتا۔ لیکن جبکہ وہ خود شکوک واوہام کی ظلمتوں میں مبتلا ہیں اور آج تک ان اختلافیات کا کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکے تو ایسی حالت میں آپ کا ان کے مزعومات کی تائید وتصدیق فرمانا مدعی سست گواہ چست کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے؟

۲۔: قائد! تعجب ہے کہ قرآن مجید کی وہ آیات جو تخلیق آدم علیہ السلام کے بارے میں قطعی الثبوت والدلالہ ہیں جن کی قطعیت آپ کے نزدیک مسلم ہے اُن میں تاویل کرنا آپ کو بہت آسان نظر آتا ہے۔ حالانکہ تاویل اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ایک کلام دو معنی کا محتمل ہو اور کسی دلیل یا قرینہ کی بناء پر ایک معنی کی طرف اسے پھیر دیا جائے۔ تخلیق آدم علیہ السلام سے متعلقہ آیات اپنے معنی مرادی پر

اور اس کی صحت ثابت نہ ہو سکی تو ہمیں اُسی مذہبی نظریہ کی طرف مائل ہونا چاہئے جو دلیل قطعی سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ حقیقت مسلمان کی گمشدہ چیز ہے جہاں بھی وہ ملے گی اُسے لے لے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن تمام علمی رایوں پر بحث کریں جو ہم پر اور دوسروں پر وزن وثبات سے ظاہر ہوں۔ ہم صرف اپنی مخصوص رائے کی جانبداری نہ کریں کہ یہ ایک بہت بڑی اور کثیر الوجود حقیقت ہے۔ عقلمند کا یہی کام ہے کہ وہ کسی حقیقت[1] کی انتہاء تک پہنچے بغیر رُک نہ جائے۔

بقیہ صفحہ گزشتہ: ایسی صریح الدلالہ ہیں کہ اُنہیں اُن کے معنی سے پھیر کر ڈاروین کی تھیوری کی طرف لے جانا تحریف کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایک اچھے بھلے انسان کو بندر کہہ دینا کسی طرح درست نہیں بالکل اُسی طرح قرآن کی روشنی میں انسان کی ابتداء بندر قرار دینا مضحکہ خیزی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۱: فائدہ! کسی حقیقت کی انتہاء تک صحیح معنی میں پہنچنے کا دعویٰ تو ان مناطقہ نے بھی نہیں کیا جو اپنے کمال دانش پر نازاں اور دنیا میں عقل وخرد کے پتلے مشہور تھے۔ وہ بیچارے بھی آج تک یہی کہتے رہے کہ معرفۃ حقائق الاشیاء عسیر جدا (سلم العلوم وغیرہ) یعنی حقائق اشیاء کی معرفت بہت مشکل ہے۔

جب ایسے مدعیان علم و عقل کا اس میدان میں یہ حال ہے تو اُن لوگوں کا ذکر ہی کیا جنہوں نے اپنے ہوش وحواس، ادراک وشعور سے ہاتھ دھو کر عقل وخرد کے پرستاروں سے مستانہ وار کہہ دیا کہ ؏ عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ

اور بارگاہِ احدیت میں یہ کہتے ہوئے سر بسجود ہو گئے کہ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ! (البقرۃ: ۳۲)

حقائق عالم کا اخفاء: عامۃ الناس سے حقائق عالم کا اخفاء ایک بہت بڑی حکمت اور عظیم الشان مصلحت پر مبنی ہے۔ اگر ہر حقیقت کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا جائے تو اس عالم رنگ و بو کا نظام ایک منٹ کیلئے بھی برقرار نہ رہے۔

قرآن حکیم میں خلقت آدم سے متعلق جو آیات ہیں اُن کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

’’جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں

بقیہ صفحہ گزشتہ: یاد رکھئے، حقائق کائنات! قدرت کے رازہائے سربستہ ہیں اور کسی کے پوشیدہ بھید کو اس کی بلا اجازت دریافت کرنے کی کوشش کرنا انتہائی بداخلاقی بلکہ ذلیل ترین قسم کی چوری پر اقدام کرنا ہے۔ عالم حقائق میں ہم اُسی حد تک جاسکتے ہیں جہاں تک جانے کی خالق عالم نے ہمیں اجازت دی ہے۔ اُس سے آگے بڑھنا گویا مالک کی بغیر اجازت اُسکی حرم سرا میں داخل ہونا ہے جو علم و عقل، تہذیب و شرافت کے سراسر منافی ہے۔

دنیاوی بادشاہوں کی حکمتوں پر عوام کا مطلع ہونا سلطنت کے نظم و نسق میں بداعتدالی کا موجب ہوتا ہے۔ ع رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ تو احکم الحاکمین کے رموز و اسرار پر اُس کی منشاء کے خلاف اطلاع پانے کی کوشش کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ حقائقِ اشیاء کی انتہاء تک صحیح معنی میں وہی لوگ پہنچتے ہیں جو اُن اسرار و رموز کے متحمل ہوسکتے ہیں اور اُن کا پہنچنا صرف ذاتی جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ تائید ایزدی ان کا ہاتھ پکڑ کر منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے جس کا سینہ کھول دیتا ہے وہ اپنے رب کریم کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے۔

اُسی نور سے وہ حقائق کائنات کو دیکھتا ہے۔ جس کی بابت حدیث شریف میں بھی وارد ہوا۔ اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله (ترمذی)

ترجمہ: مومن کی فراست سے ڈرو۔ وہ بلاشبہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

بہرحال یہ امر طے شدہ ہے کہ کسی حقیقت کی انتہاء کو پہنچنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ یہ نعمت عظمیٰ ہے جو عطائے ایزدی کے بغیر کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

زمانہ کے بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ جو ہر چیز کی ’’لم‘‘ دریافت کرنے کے عادی ہیں باوجود ادعائے

تو فرشتے کہنے لگے خدایا کیا تو زمین پر ایسی مخلوق بنانا چاہتا ہے جو زمین میں فساد پھیلائے اور خون بہائے؟ حالانکہ ہم تیری حمد کرتے ہوئے تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ خدا نے کہا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ پھر خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء

بقیہ صفحہ گذشتہ: کمال کے ہر قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور جس قدر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اُسی قدر منزل مقصود سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہزار سال کی علمی و تحقیقی موشگافیوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ "ہنوز روز اول است" جہاں تھے وہیں ہیں۔ کسی اہم مسئلہ میں آج تک اُنہیں جزم و یقین حاصل نہ ہوا۔

مثال کے طور پر انسان کے متعلق ان محققین کرام کی تحقیق کا حال انہیں کی زبان سے سن لیجئے! منطقی اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی ماہیت "حیوان ناطق" ہے۔ حیوان جنس اور ناطق اس کی فصل ہے۔ جنس فصل اُس کے ذاتیات ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا کاتب وضاحک وغیرہ ہونا عرضیات میں داخل ہے۔

لیکن اس اتفاق کے باوجود وہ اپنی تحقیق پر مطمئن نہیں۔ اُنہوں نے صاف کہہ دیا کہ جن چیزوں کو ہم ذاتیات قرار دے رہے ہیں ممکن ہے کہ واقع میں وہ عرضیات ہوں اور ہمارے سمجھے ہوئے عرضیات درحقیقت ذاتیات ہوں۔ ہم نے اپنے فن اور اُس کے قواعد و ضوابط کی تدوین و تکمیل کے لئے اصطلاحات و عنوانات کے طور پر اِن چیزوں کو جنس و فصل، ذاتی و عرضی وغیرہ مان لیا ہے۔ یہ نہیں کہ اس ضمن میں ہم نے جو کچھ کہا اور سمجھا ہے وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق جزمی و یقینی ہے۔ اس لئے کہ معرفة حقائق الاشياء عسير جدًا حقائق اشیاء کی معرفت بہت دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا۔ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اُس (معبودِ حقیقی) کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ کوئی خوش ہو کر کوئی ناخوش ہو کر اور اُسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے) خوشی کے ساتھ سر جھکانے والے تو وہ ہیں جو پہلی دفعہ بول اٹھے

سکھا دیئے۔ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان

بقیہ صفحہ گذشتہ: سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ اور ناخوشی سے ندامت کا سر جھکا کر اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنے والے وہ ہیں جنہوں نے سالہا سال ٹھوکریں کھا کر کہا معرفة حقائق الاشیاء عسیر جدًا

مجھے اس بات پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر قدیم و جدید تحقیق کو قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے ظاہر الفاظ و عبارات میں تلاش کیا جائے یا یہ کہ دنیا میں جب بھی کوئی ایسی نئی بات پیش کرے جس کو اہل زمانہ کا کوئی ممتاز طبقہ مان لے۔ خواہ وہ بات عقل و تہذیب کے معیار سے گری ہوئی کیوں نہ ہو۔ مگر کسی نہ کسی طرح اُس کی تائید قرآن کریم سے ضرور ہو جائے۔

اس امر کا کوئی لحاظ نہیں کہ اس کھینچ تان میں قرآن حکیم کی صاف اور واضح عبارات و الفاظ کے معنی بدل جائیں گے۔ کیسی ہی رکیک ترین تاویل کیوں نہ ہو نصوص قرآنیہ اُن تاویلات فاسدہ کی قطعاً متحمل نہ ہوں۔ مگر چونکہ وہ نظریہ یورپ کے مشہور و ممتاز دہریہ نے پیش کیا ہے اس لئے جب تک قرآن کریم اس کی تائید و تصدیق نہ کرے اس وقت تک قرآن کا کلام الٰہی ہونا معرضِ التواء میں رہے گا۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر اولاً اور ابتداءً مغربیت کا رنگ چڑھ گیا وہ ہر رنگ کو اسی کا ہم رنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے تمام اسلامی خصوصیات کا انکار کر دیا اور روحانیات سے اعراض کر کے محض مادیات کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ ہمیں ان کی کجروی پر اتنا افسوس نہیں جتنا قرآن حکیم میں تحریف اور ناجائز تاویل پر افسوس ہے۔

قرآن کریم کی وسعت علمی اور اُس کا اجمال و تفصیل

قرآن کریم میں غور و تدبر کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ تمام اشیاء و حقائق کائنات اور جملہ علوم دینی و دنیوی قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ (النحل) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام)

تمام اشیاء کائنات کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے عرض کیا" اے پروردگار! ہمیں توصرف

بقیہ صفحہ گذشتہ: بکثرت آیات اس دعوے کی دلیل میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ان تمام علوم کا حامل سارا قرآن ہے، نہ ہر آیۃ۔ پھر یہ کہ وہ تمام علوم مطلقاً ہر شخص کے لئے تفصیل نہیں۔ تفصیل انہی کیلئے ہے جنہیں بمقتضائے حکمت، تفصیلی علوم عطا کئے جانے کے ساتھ ارادۂ الٰہیہ متعلق ہوا۔ باقی! عوام کے حق میں وہ مجمل ہیں۔ وہ استدلالی اور نظری مسائل! جن کے ساتھ انسانوں کی فلاح دارین کا کوئی گہرا تعلق نہ تھا یا ان مسائل کی طرف انسان کا متوجہ ہونا علم الٰہی میں انسان کیلئے مفید ہونے سے زیادہ مضر تھا۔ نیز وہ مسائل جن کی توضیح و تفصیل بمقتضائے حکمت وحی غیر متلو میں لسان رسالت ہی کے ذریعہ علم الٰہی میں مناسب تھی اُن تمام مسائل کو قرآن حکیم نے عوام کے لئے تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا۔

ہمارے پیش نظر اس وقت وہ مسائل ہیں جنہیں محض انسانی مفاد کی خاطر کتاب و سنت میں تفصیلاً بیان نہیں کیا گیا۔ لیکن یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک طرف تو ہمارے ہی مفاد کے لئے اُن تفصیلات میں جانے سے ہمیں روکا گیا۔ دوسری طرف اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ فرما کر ہمیں قرآن کریم کے علوم و معارف میں غور و تدبر کی دعوت دی جا رہی ہے، تو ایسی صورت میں منشاء ایزدی کو کس طرح پورا کیا جائے؟

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ دعوت تدبر فی القرآن ہمارے فائدہ کیلئے ہے اور بعض تفصیلات میں جانے سے روکنا محض ہمیں نقصان اور ضرر سے بچانے کی خاطر ہے لہٰذا ہم نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جس تدبر میں ہمارا فائدہ ہو وہ منشاء ایزدی کے عین مطابق ہے اور وہ تدبر جب ضرر کی حد تک پہنچ جائے تو ممنوع ہوگا۔

اسی طرح بعض تفصیلات میں جانا اُسی حالت میں ممنوع قرار پائے گا جب کہ اس میں نقصان اور مضرت کا پہلو نمایاں ہو جائے اور جس حد تک افادی پہلو غالب رہے وہاں تک ممانعت اور روک ٹوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انہیں چیزوں کا علم ہے جو تو نے ہمیں بتادی ہیں۔ بے شک تو علیم و حکیم ہے۔" (اب)

بقیہ صفحہ گذشتہ: رہا یہ امر کہ اس ضمن میں نفع اور نقصان کا معیار کیا ہوگا تو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے نفع اور نقصان کو ہم سے زیادہ ہمارا محبوب حقیقی جانتا ہے۔ عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ۔ اس لئے میدان تفصیلات میں چلتے ہوئے اور قرآن حکیم میں تدبر کرتے وقت قرآن ہی سے پوچھنا چاہئے کہ ہمارا یہ قدم ہماری حد سے آگے تو نہیں پڑا۔ کسی مسئلہ کی تحقیق کرتے ہوئے جو نظریہ ہم نے قائم کیا ہے وہ قرآن حکیم کے کسی مضمون کے خلاف تو نہیں۔

اگر اس سلسلہ میں قرآن کریم ہمارے کسی قدم کو نہیں روکتا تو میدان تفصیلات میں ہمارا یہ اقدام یقیناً فلاح و نجات کی طرف ہے۔ ورنہ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہم ہلاکت کی طرف جارہے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں تدبر کرتے ہوئے جو نظریات ہم نے قائم کئے ہیں اگر قرآن حکیم اُن کی تردید و مخالفت نہیں کرتا تو ہمارے وہ نظریات قطعاً حق و صواب پر مبنی ہیں، ورنہ یقین کر لینا چاہئے کہ ہم باطل پر ہیں اور یہ باطل ایک دن ہمیں ضرور لے ڈوبے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن کریم علم و حکمت، تحقیق و تفتیش کی راہوں سے قطعاً نہیں روکتا بلکہ اُن شاہراہوں پر چلنے کی ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ لیکن چونکہ ہم ان راہوں کے نشیب و فراز سے واقف نہیں اس لئے اس نے ایسی حدود مقرر فرمادی ہیں جو ہمیں ہلاکت سے بچارہی ہیں۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی پوری پوری رعایت کریں۔

اس بیان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ کسی نظریہ کی تصدیق و تائید کے لئے قرآن کریم کی نصوص قطعی الدلالۃ کو اُن کے معنی سے پھیرنا اور فاسد و رکیک تاویلیں کرنا دین و دیانت کے قطعاً خلاف ہے۔

نیز یہ کہ کسی حقیقت کی انتہاء تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہمارے لئے اُسی وقت جائز ہے جبکہ ہمارے معبود برحق کی طرف سے ہمیں اُس کی اجازت ہو ورنہ نہیں۔ دیکھئے آیات متشابہات کی حقیقت میں غور کرنے سے ہمیں منع فرمادیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ

خدا نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ اے آدم! تم ان چیزوں کے اسماء ظاہر کرو۔ جب انہوں نے اُن اسماء کو ظاہر کیا تو خدا نے کہا (اے فرشتو!) کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں زمینوں اور آسمانوں کے پوشیدہ راز کو خوب جانتا ہوں اور ان باتوں کو بھی جنہیں تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو۔ پھر جب ہم نے فرشتوں سے کہا (اچھا) اب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سب نے اسے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار و تکبر کیا۔ کیونکہ وہ منکر کافر نعمت ناشکر گزار تھا۔ پھر ہم نے کہا اے آدم! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں رہو، بسو اور جہاں سے اور جس طرح تمہارا جی چاہے جنت کی نعمتیں کھا کر عیش کرو۔ ہاں! اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم اپنے اوپر (خود ہی) ظلم کرو گے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد شیطان نے ان کو اُس ثابت قدمی سے ڈگمگایا اور اُس عیش و عشرت، عزت و راحت کے مقام یعنی جنت سے نکلوا دیا۔ ہم نے کہا اتر جاؤ تم اس اعلیٰ مقام (جنت) سے پست زمین میں۔ اب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بنتے رہو گے۔ اب تمہارا ٹھکانا اور نفع اُٹھانا ایک وقت مقررہ تک زمین میں ہے۔

پھر آدم علیہ السلام کو منجانب اللہ کچھ کلمات القاء ہوئے اور خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحیم ہے۔ ہم نے کہا تم سب کے سب اس جنتِ اعلیٰ سے پست زمین میں اتر جاؤ۔ پھر جب ہماری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ ہماری ہدایت پر چلیں گے انہیں کوئی خوف و

بقیہ صفحہ گذشتہ: فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ الْآيَة اھ
اسی طرح تقدیر کے مسائل میں غور و خوض کرنے سے ہمیں روک دیا گیا۔ علی ہذا القیاس بکثرت ایسے مسائل ہیں جن میں بحث و تمحیص، غور و فکر کی ممانعت ہے۔ کیونکہ وہ تمام ابحاث ہمارے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر ہیں۔ فافهم وتدبر ولا تكن من الخسرين

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ مئی ۱۹۵۰ء جلد ۲ شمارہ ۴ ص ۲۱ تا ۲۹)

غم نہ ہوگا اور جو کفر و سرکشی کر کے ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ دوزخی ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اس میں بہت کچھ تفصیل و بیان کی گنجائش ہے۔ ان کے ضمن میں چند اہم مسائل ہیں جن کا جاننا قرآن کریم پر بحث کرنے والے کے لئے ضروری ہے۔ وہ مسائل یہ ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اس بابت میں خطاب کیا کہ وہ عنقریب زمین میں ایک خلیفہ بنائے گا اور فرشتوں نے اس کی طرف رجوع کیا۔ پس ایک جویائے حقیقت اس مکالمہ کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے۔

(۲) آدم علیہ السلام نے تمام اسماء کو سیکھ لیا۔ یہ اسماء کیا ہیں؟ اور فرشتوں کے سجدہ کا کیا مطلب ہے؟

(۳) اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو ساکن جنت بنایا تو کیا وہ جنت آسمان میں ہے یا زمین میں؟

(۴) یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اُتارا۔

(۵) یہ کہ آدم علیہ السلام کو خدا کی طرف سے چند کلمات تلقین ہوئے۔ یہ کلمات کیا تھے؟

پہلی بات کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ آیت کے ظاہری الفاظ اس امر کو بتاتے ہیں کہ آدم علیہ السلام و ذریت آدم کی تخلیق کے باب میں اللہ اور فرشتوں کے مابین گفتگو ہوئی۔ لیکن اہل دین و دیانت اس معنی کو قبول نہیں کر سکتے۔

اس لئے نبی علیہ السلام کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ عقول سے بھی اس طرح پنہاں ہے جس طرح نگاہوں سے اور ملاء اعلیٰ بھی اسی طرح اس کی جستجو میں ہیں جیسے تم، اور جیسا کہ واقعۂ معراج میں وارد ہے کہ جبرئیل علیہ السلام جب اپنی حد پرواز یعنی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور نبی علیہ السلام نے اُن سے کہا "اے رفیق کیوں رُک گئے؟" تو انہوں نے جواب دیا "اگر میں ایک بال برابر بھی آگے بڑھوں تو جل کر خاکستر ہو جاؤں"

اگر یک سرِ موئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم!

چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم انہیں یہیں چھوڑ کر تنہا بلندی پر چڑھے۔

اس اُوپر چڑھنے کے معنی میں ہماری ایک خاص رائے ہے جسے ہم نے لفظ اسراء کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ (وہاں دیکھو) پھر یہ حقیقت ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز ہے نہ اس سے بڑی۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" اس لئے ازروئے عقل یہ جائز نہیں ہوسکتا ہے کہ خدا کی پیدا کردہ مخلوق اس کی حکمت کے اقتضاء اور ارادہ سے متعلق امر کی بابت اُس سے کوئی حجت اور گفتگو کر سکے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اس گفتگو کو فرشتوں کے حال سے متعلق ایک تمثیل قرار[1] دیا جائے کہ جب اُنہیں اس امر کا علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب زمین میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہے اور ان کو یہ علم ہوا کیسے؟ یا تو اس لئے کہ ان میں حدوث امور سے پہلے "حدوث پذیر امور" کو سمجھ لینے کی استعداد و قابلیت پائی جاتی ہے۔ یا ان کے ظاہری آثار اور اپنے حالات کی مماثلت کے باعث وہ اِس ارادۂ الٰہی کو جان گئے اور

---

[1]: فائدہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی گفتگو کو انسانوں کی باہمی گفتگو پر قیاس کرنے کی وجہ سے یہ شبہات پیدا ہوئے۔ آپ نے تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں۔ جس طرح اس کی ذات مماثلت اور مشابہت سے پاک ہے اسی طرح اُس کے جمیع صفات اور منجملہ ان کے صفت کلام بھی عیب مثلیت وغیرہ سے مبرہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب آپ یہ مانتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی یا الہام کے ذریعہ یہ بتایا کہ میں اُن باتوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔" تو پھر تخلیق آدم علیہ السلام کے متعلق خدا تعالیٰ کے خطاب اور فرشتوں کے جواب کو آپ محض ایک تمثیل کیوں قرار دیتے ہیں؟ کیا وحی و الہام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرماتا اور کیا فرشتے اپنے رب کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہہ سکتے؟ اگر اس خطاب و جواب کو لفظ مکالمہ سے تعبیر کیا جائے تو کیا قباحت لازم آتی ہے؟ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق کلام

اس دوران میں اُن کے وجدان میں اِس قسم کے اعتراضات متحرک ہوئے تو اللہ تعالیٰ

بقیہ صفحہ گذشتہ: نہیں فرماتا۔ آیہ کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذات وصفات میں بے مثل ہے۔ اس کا کلام کسی کے کلام کی مثل نہیں۔ ورنہ غور فرمایئے۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا کے کیا معنی ہیں؟ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوسکتا ہے، ایسے ہی فرشتوں کو بھی خطاب فرماسکتا ہے۔ اس کے ماسوا بکثرت آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔

کلام ربانی اور خطاب الٰہی کو تمثیل احوال ہی قرار دیا جائے اور حقیقت کلام کی نفی کردی جائے تو قرآن کریم کو کلام اللہ کہنا بھی غلط ہوگا بلکہ قرآن حکیم محض تمثیلی حالات کا ایک مرقع قرار پائے گا۔ (نعوذ باللہ من ذلك) رہا یہ امر کہ خدا کی پیدا کردہ مخلوق کا اس کی حکمت کے اقتضاء اور ارادہ سے متعلقہ امر کی بابت اس سے کوئی حجت اور گفتگو کرنا عقلاً جائز نہیں تو میں دریافت کروں گا کہ صرف گفتگو جائز نہیں یا اپنے باطن میں اعتراضات کا متحرک کرنا اور اُس کا اخفاء بھی جائز نہیں۔ جب آپ اُسے جائز قرار دے رہے ہیں تو صرف گفتگو کو ناجائز اور محال کہنے کے کیا معنی؟

یہ امر بالکل واضح ہے کہ جس طرح ارادۂ الٰہی سے متعلقہ امر کی بابت کوئی حجت اور گفتگو عظمت وجلالت ربوبیت کے خلاف ہے بالکل اسی طرح اپنے باطن میں اعتراضات کا محسوس کرنا بھی رب کریم کی شان کبریائی کے منافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ ''فرشتوں کے وجدان میں اعتراضات متحرک ہوئے۔'' ارادۂ خداوندی کے خلاف ان کے وجدان میں اعتراضات کا متحرک ہونا خلافِ عقل نہیں تو اس کی بابت گفتگو کرنا کیونکر خلاف عقل ہوسکتا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ اعتراضات کا متحرک ہونا غیر اختیاری طور پر تھا تو میں عرض کروں گا کہ جس طرح اعتراضات غیر اختیاری طور پر متحرک ہوسکتے ہیں اسی طرح غیر اختیاری طریقہ سے بے ساختہ کلام بھی ہوسکتا ہے۔ پھر بھی دونوں باتیں یکساں رہیں۔ ایسی صورت میں ایک کو جائز اور دوسری کو محال سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ (مدیر مسئول)

نے ان کو وحی یا الہام کے ذریعہ یہ بتایا کہ میں اُن باتوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

رہی دوسری بات یعنی اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم کرنا۔ سو مفسرین کہتے ہیں کہ وہ تمام حادث مخلوقات کے ناموں کی تعلیم تھی جو تمام مختلف لغات والسنہ میں آدم علیہ السلام کو سکھا دی اور پھر اُنہیں حکم دیا کہ ملائکہ کے سامنے نغمہ سرائی کریں۔

ان الفاظ کو ظاہری معنی پر محمول کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ بیان بھی اس بات کی ایک تمثیلی تعبیر ہے کہ آدم علیہ السلام کا تمام شرور کی قابلیت سے متصف ہو کر پیدا ہونے سے فرشتوں پر خاص اثر ہوا اور انہوں نے زمین میں اس کی تخلیق کو بہت اہم سمجھا۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ فرشتے اگرچہ حکم الٰہی کو تسلیم کرتے تھے لیکن وہ اپنے دِل میں ایک اعتراض مخفی کئے ہوئے تھے مگر جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوگئی اور اس کے اولین اطوار ہی سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ اس میں تمام ممکنات کے اوراک کی قابلیت وصلاحیت ہے اور اپنی علمی زندگی میں اقصی الغایات تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک بزرگ اور عظیم الشان مخلوق ہے اور اُس کے شرف موہبت کی بناء پر اُس کی تعظیم وتکریم کرنا واجب ہے تو انہوں نے اس کی تعظیم وتکریم کی اور اکرام واحترام سے پیش آئے۔ یہ معنی ہیں آدم علیہ السلام کے لئے فرشتوں کے سجدہ کے۔ ورنہ اس بات کو تو عقلِ سلیم قبول نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے سامنے[1] کھڑا کر کے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ اس لئے کہ بے مثل خدائے ذوالجلال کی ذاتِ مقدس اس سے ارفع واعلیٰ ہے کہ آدم اور فرشتوں کے ساتھ مجتمع ہو۔ جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ دراں

[1]: قائد: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا کے ظاہری معنی مراد لینا آپ کے نزدیک جائز نہیں۔ یہ مسئلہ ثابت شدہ ہے کہ نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہوں گی۔ جب تک کوئی دلیل خلاف ظاہر پر قائم نہ

حالانکہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

تیسری بات کہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا کو ساکن جنت بنایا۔ اس کے متعلق بعض مفسرین جن میں ابوالقاسم بلخی اور ابومسلم اصفہانی بھی شامل ہیں اس طرف گئے

بقیہ صفحہ گذشتہ: ہو۔ اگر یوں ہی بلا دلیل نصوص کو ظاہر سے پھیر دینا جائز ہو تو شریعت سے ایمان اٹھ جائے گا۔ جس کا دِل چاہا اُسی نے قرآن وحدیث کو ظاہری معنی سے پھیر کر اپنے حسب منشاء ترجمہ کرلیا۔ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ حتیٰ کہ ایمان واسلام کے معانی ہر شخص اپنے خیال کے مطابق کرلے تو شریعت کیا ہوئی ایک بازیچہ اطفال ہوگیا۔ اگر آپ کے نزدیک آیۃ کریمہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اپنے ظاہر پر محمول نہیں تو صَرف عن الظاہر پر کوئی دلیل قائم کیجئے۔ مگر آپ کے پاس تو سب سے بڑی دلیل آپ کی وہ عقل سلیم ہے جو نصوص ودلائل شرعیہ کے خلاف، معانی قرآن سمجھنے پر آپ کو مجبور کررہی ہے۔

آپ نے کمالات آدم علیہ السلام کو شرور سے تعبیر کر کے اپنی آدمیت کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کی اور ان کے ساتھ اکرام واحترام سے پیش آئے۔

دوسری طرف آپ ان کے سجدہ کا انکار فرمارہے ہیں۔ کیا سجدہ کے ذریعہ تعظیم وتکریم نہیں ہوسکتی۔ یا سجدہ کسی کی توہین کے لئے کیا جاتا ہے؟

رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے سامنے کھڑا کر کے فرشتوں کو سجدہ کرایا، سو آج تک کسی سنّی مفسر نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کا سامنا یا پیچھا ہوتا ہے۔ تعالی الله عن ذلك علوا كبيرا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت، زمان ومکان سے مبرّیٰ ہے۔ اسی طرح آپ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں اور آدم کے ساتھ مجتمع ہوا ہو۔ "مخلوق کے ساتھ خالق کے اجتماع کا تصور بھی کسی مسلمان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ نہ معلوم یہ ہوائی باتیں آپ کس سے کررہے ہیں۔ یہ تمام رکیک شبہات بھی صرف اسی لئے آپ کے دِل میں پیدا ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے امر وخطاب کو

ہیں کہ جنت زمین پر ہے۔ ہم بھی اسی رائے کو پسند کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے ایک پر اشجار و پر اثمار اور شاداب انہار قطعۂ زمین میں بھیج دیا تا کہ اُس سے روزی حاصل کریں لیکن وہ درخت جس کا پھل کھانے سے منع کیا تھا اور وہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے گیہوں یا انگور کا یا کوئی اور درخت تھا۔ بہر کیف وہ کوئی ایسا ضرر رساں درخت تھا جس کا پھل کھانے سے ان کو دائمی تکلیف لاحق ہوئی۔ جیسا کہ آئندہ آیت میں آتا ہے کہ اس کا پھل کھاتے ہی یہ ضرر پہنچا کہ ان کا ستر یعنی شرمگاہیں جو اس سے پہلے کسی غشاء یا پردہ سے چھپی ہوئی تھیں نمایاں ہو گئیں۔

(ماہنامہ قائد ملتان ماہ جون ۱۹۵۰ء جلد ۲ شمارہ ۵ ص ۲۰ تا ۲۴)

بقیہ صفحہ گذشتہ: آپ اپنے کلام پر قیاس فرما رہے ہیں اور ربانی کاموں جیسا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ بھی آپ کی زبان پر جاری ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کے دِل میں یہ کانٹا کھٹک رہا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کسی اعتبار سے کسی کی مثل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی ذات و صفات میں بے مثل ہے اسی طرح اپنے کاموں میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ کا فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم دینا، آپ کے خیال میں ایسا ہی ہے جیسا کوئی بادشاہ اپنی رعایا کو جمع کر کے اپنے کسی مقرب کی تعظیم بجالانے کا حکم دے۔ اس صورت میں بادشاہ رعایا کے ساتھ مجتمع بھی ہو گا اور اس مقرب کو اپنے سامنے بھی کھڑا کرے گا۔

یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ کی شان میں آپ کے یہ تصورات درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو ضرور دیا مگر وہ مخلوق کے ساتھ مجتمع نہیں ہوا۔ نہ اس کے لئے کوئی جہت ثابت ہوئی کہ آدم علیہ السلام کو اس کے سامنے کھڑا ہونے والا کہا جائے۔

(مدیر مسئول)

غزالی زماں رازی دوراں امام اہلسنت

علامہ حضرت سیّد احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

کی علمی، مذہبی، سیاسی، سماجی، ملی خدمات کے بارے میں عالم اسلام کے
جلیل القدر علماء ومشائخ کے مشاہدات وتاثرات پر مشتمل جامع سوانحی مجموعہ

لمعاتِ کاظمی

مرتبہ

ابوالبیان محمد جمیل الرحمٰن سعیدی رضوی

ناشر کاظمی پبلی کیشنز جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا

التبیان العظیم

فی تفسیر

سورۃ التحریم

مجموعہ دروس

امام اہلسنت غزالی زماں رازی دوراں

حضرت علامہ **سید احمد سعید کاظمی** رحمۃ اللہ علیہ

بانی و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

سابق صدر شعبہ اسلامیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

ناشر

کاظمی پبلی کیشنز

جامعہ اسلامیہ انوار العلوم ملتان

مطبوعات کاظمی پبلی کیشنز و بزم سعید ملتان























